



# Mirat-ul-Haqq

Allama F.S.Taj



علامہ ایف۔س۔تاج

Mirror of Truth  
**Mirat-ul-Haq**

BY

Allama F.S.Taj

مرآة الحق

از

علامہ ایف۔ ایس۔ تاج

۱۹۵۹

# فہرست مضامین

## مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
	عقل اور مذہب (۴)		حمد
	مذہب کی ضرورت		حسن عقیدت
	مذہب کا کام		سوء عقیدت
	عقل کا کام		(۱) ویدانت
	عقل کا دائرہ عمل		آتمائیتہ نگت
	ارتقائے عقل		گیان
	عقل اور موالید ثلاثہ		نگتی از روئے ویدانت
	عقل کی عدم صحت		انجیلی نجات
	(۵) الہام کی ضرورت		(۲) رُوح کے متعلق عقائد
	جوڑا اور ترقی		رُوح مرکب امتزاجی
	عقل الہام کی متقاضی ہے		رُوح قدیم و قائم بالذات
	الہام اور باطنی شریعت		رُوح مخلوق و حادث
	شخصی مذہب		(۳) تزکیہ نفس و ریاضت بدنی
	قومی مذہب		

شریعت کا مرکز	روح القدس کا نزول اور مذہب الہی کی انتہائی کمالیت
عہد عتیق مختص بالقوم اور مختص بالزمان تھا	مسیحیت غیر اقوام میں
توریت میں ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر۔۔	مسیحیت ہند میں
نئے عہد کے بانی کے متعلق مفصل خبریں	لوگ مذہب سے کیوں بیزار ہیں؟
عہد عتیق و عہد جدید کے بانیوں کی باہمی مشابہت الہام اور مذہب الہی کی تدریجی۔	مذہب بیزاری کا علاج
کمالیت	مسیحیت کی مخالفت
(۶) عالمگیر مذہب	(۷) معیار الہام
عہد جدید کی بنیاد عہد عتیق پر	معجزہ
توریت کا تجزیہ	پیشینگوئی
احکام خاص	نیک سیرتی
قربانیاں	مطابقت بہ الہام ما قبل
ختنہ	مسیح کا اقرار
سبت	(۸) تجسم الہی
ظاہری طہارت	موجودات اور خدا کا علم
حلت و حرمت	الہام اور خدا کا علم
روزہ	ایک سعیدہ خواہش
عیدیں	مظہر اور خدا کا علم
طریق عبادت	ایک بدیہی مثال
احکام عام	قدرت و اختیار

گناہ کے نتائج	محبت
(۱۰) نجات	قدوسیت
اختیاری طریقہ	تمام انبیاء کرام پر فضیلت
جبری طریقہ	ایک اعتراض کا جواب
ناسخ	کیا تجسم خدا کی کسر شان ہے؟
تزکیہ نفس	مسیح کامل انسان
اعمال حسنہ	مسیح کن معانی میں خدا کا بیٹا ہے؟۔۔۔
توبہ محض	مسیح انسان اور خدا کا برزخ کامل۔۔۔۔
عدل و رحم	کلام مجسم کی تین صورتیں
قسری ملاپ	تجسم کے فوائد
طبعی ملاپ	(۹) گناہ
نجات بالکفارہ	آغاز گناہ
خلاصہ مطلب	ایک اعتراض کا جواب
ایک اعتراض کا جواب	گناہ کیا ہے؟
نجات کے مدارج	گناہ کی علت
کفارہ مسیح کی وسعت بلحاظ تاثیر	گناہ ہمہ گیر ہے
ابدی زندگی اور ابدی سزا	کیا گناہ انسان کا اصلی فطرت ہے؟
آخری التماس	طبعی موروثی گناہ
	متعدی گناہ
	کبھی گناہ

# التماس

معزز ناظرین! بندہ نے یہ کتاب "مراۃ الحق" طالبانِ راہِ حق کی راہنمائی و ہدایت کے لئے تصنیف کی ہے۔ مراۃ آئینہ کو کہتے ہیں۔ جس طرح انسان آئینے میں اپنی شکل و صورت کی اصلیت کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح میری یہ کتاب متلاشیانِ جاہِ حق کو خدا کا جمال دکھانے گی۔ لیکن جیسے گل چشم کے لئے آئینہ کا وجودِ عدم برابر ہے۔ اسی طرح وہ لوگ "جن کی عقلوں کو اس جہان کے خدا (ابلیس) نے اندھا کر دیا ہے" مراۃ الحق سے مستفیض نہ ہو سکیں گے۔ اس کتاب کی تیاری میں چند کتب اور پُرانے اخبارات سے بھی امداد لی گئی ہے۔ چونکہ جاہِ عقلی دلائل سے حقائق کو ثابت کیا گیا ہے اور اکثر احباب کلامِ مقدس کے حقائق و مسائل کو عقلی دلائل و براہین سے ثابت کئے جانے سے سخت بیزار ہوتے ہیں۔ اس لئے عرض ہے کہ ایسے اصحاب مندرجہ ذیل امور پر ضرور غور کریں تاکہ اُن کی غلط فہمی دُور ہو جائے۔

**اول:** یہ کائنات خدا کا فعل ہے۔ اور کلام اللہ خدا کا قول۔ لہذا اُس کے ہی فعل سے اُس کے کلام کو ثابت کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ جائز ہے۔

**دوم:** دنیا کی چیزیں آسمانی چیزوں کا عکس اور نقل ہیں (عبرانیوں ۸: ۵-۹: ۲۳-۱۰: ۱) اس لئے نقل سے اصل کو ثابت کرنا جائز نہیں۔ بلکہ بطور استدلال انی لابدی و ضروری ہے۔

**سوم:** ساری شرع الہی کے خلاصہ کا اول جز یہ ہے کہ "تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ" پس یہ خدا کو عقل سے پیار کرنا ہے۔ سگانِ دنیا اسی عقل کو ناجائز طور پر استعمال کر کے فوائد حاصل کرتے ہیں اور ہم اپنی عقل سے خدا کا جلال ظاہر کرتے ہیں۔

**چہارم:** حقائق غیر مرئیہ اور دقائق لطیفہ روحانیہ کا ثبوتی تصور محسوسات و مریات ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے نا دیدنی روحانی حقیقتوں کو مریات کے پیرائے میں ظاہر کرنا لازمی ہے۔

## پنجم

سب سے زیادہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ خدا باپ اور خداوند مسیح نے تشبیہوں اور تمثیلوں میں کلام کیا۔ ملاحظہ ہو۔ زبور ۷۸: ۲۔  
ہو سبج ۱۲: ۱۰ اور متی ۱۳: ۳۴۔ مرقس ۴: ۳۳۔ اور آنخداوند مسیح نے فرمایا "جب میں نے تم سے زمین کی باتیں کہیں اور تم نے یقین نہیں کیا۔ تو اگر میں تم سے آسمان کی باتیں کہوں تو کیونکر یقین کرو گے؟" (یوحنا ۳: ۲) واضح ہو کہ میں فلاسفر نہیں منطقی نہیں ایک محدود قابلیت کا مالک ہوں لیکن خداوند مسیح کی طاقت سے یہ خدمت انجام دے رہا ہوں۔

اس تصنیف کے تہیہ سے پیشتر ہی میرا جسم صحت اور علالت کے برزخ میں پھنسا ہوا تھا اور یہی اطمینان سوز اور ہمت شکن حالات اس خدمت میں بہترین صورت میں انجام دہی کے مانع رہے۔

اس لئے التجا ہے کہ میری ناداری صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مصائب و نقائص سے چشم پوشی فرمائیے۔ خیال رہے کہ محض تردیدی جذبات میری اس غامہ فرسائی کے متحرک نہیں ہوئے۔ اگرچہ بعض جگہ خاص ضروریات کے ماتحت تردید و تنقید واجب سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ خداوند کریم میرے نیک مقصد کو پورا کرے۔ اُمید کامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہت لوگ اپنی روحوں کی سعادت حاصل کریں گے۔ آمین

نیاز کیش۔ ایف۔ ایس تاج

اے۔ پی مشن لدھیانہ

# مرآة الحق

**حمد:** ہر طرح کی تعریف و توصیف اور حمد و تجید کی حقدار وہی ذات بیچون و بچگون ہے جو ادراک و فہم انسانی سے بعید اور وارء الوراہ ہے۔

جس کے الطاف و اکرام میں حیث الاجتماع تمام افراد عالم پر شبانہ روز مشترک و مساوی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کی بے قیاس محبت منصفہ شہود پر طرح بطرح آشکارا ہوتی رہتی ہے۔ فطرت کے ذرے ذرے میں اُس کا نور حقانیت جلوہ فگن ہے۔ اُس نے انسانِ خاطمی و عاصی کی شقاوت قلبی اور کور باطنی کے اندفاع و ازالہ کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے خداوند مسیح کو جسم میں بھیجا اور اُس کے پاک کفارہ کے طفیل انسان کی مصیبت و گناہ کا چارہ فرمایا۔ اور مریمان گناہ کے بہتے ہوئے آنسو پونچھے جس کے باعث ہم اُس کے فضل کے تخت کے سامنے دلیری سے جاسکتے ہیں۔ اُس کی تجید خداوند مسیح میں ابدالآباد ہوتی رہے۔ آمین۔

**حُسن عقیدت:** ابتدائی زمانوں میں جبکہ انسان بالکل سیدھا سادھا تھا۔ اور اُس کے قلبِ ظلمانیہ و فطرتِ محبوبہ پر آفتابِ

عالم و تہذیب کے برق و شہ پر تو نہیں پڑتے تھے۔ اخلاق و تہذیب کو کسی ذہن و دل میں باریابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ظلمت و تاریکی کے سمندر میں جہل و نادانی کی طغائیاں تھیں۔ اور ہر طرف جہالت آمیز سادگی کے آثار نظر آتے تھے۔ اُس وقت بھی انسان کے وجدانیت میں دو حقیقتیں صاف ابھری ہوئی جگہ رکھتی تھیں۔ اول اپنے آپ کو فطرتی طور پر کمزور بیکس تصور کرنا۔ کسی دستگیر و حاجت روا کی ضرورت کو بزور محسوس کرنا۔ ان ہی دو حقیقتوں کی بناء پر اگر اُس کو کوئی حاجت رو یا دستگیر خواہ وہی ہو پیش کیا گیا۔ تو اُس نے بطیب خاطر اُس کی پرستش کی۔ اُس وقت انسان مثل ایک طفل کمن کے فطرتی طور پر عجائبات کا مشتاق تھا۔ اور غیر مرئی دو ہی اشیاء کی پرستش کے لئے ایک دم تیار ہو جاتا تھا۔ اُس وقت انسان میں ایک طرح کی حُسن عقیدت پائی جاتی تھی۔ ان زمانوں میں علماء نے اُس کے حُسن عقیدت اور سرلیع الاعتقادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی زمانہ میں آندھی آگ پانی بارش آفتاب مہتاب اور رعد وغیرہ کی پرستش شروع ہوئی۔ چونکہ یہ اشیاء انسانی طاقت سے بالاتھیں اور انسانی جدوجہد اُن کے مقابلہ میں قطعی بے سود تھی۔ اس لئے انسان نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اعلیٰ اور قادر ہستیاں ہیں جن کے سامنے ہم بالکل کمزور و مجبور ہیں۔ اسی طرح فطرت کی اٹل اشیاء کی طاقت و قدرت سے مرعوب و مجبور ہو کر یہ حُسن عقیدت اُن میں پیدا ہوئی کہ ان فطرت کی طاقتوں کو دیوتا تصور کر کے اُن کی رضا جوئی اور حصولِ خوشنودی کے لئے اُن کے آگے قربانیاں چڑھانی شروع کر دیں۔ تاکہ وہ اُن کے ایثار و عبودیت سے خوش ہو کر اُن کے دامانِ مراد کے مقصود کے موتیوں سے بھر دیں۔ اور ہر قسم کی غارت گری و تباہ

کاری سے باز رہیں۔ اور جب کہیں بارش کی زیادتی سے فصلوں مویشیوں کھیتوں اور مکانوں کا نقصان ہو جاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اندر دیوتا ناراض ہے۔ اور اگر آندھی یا آگ سے کچھ نقصان ہوتا تھا تو مارت اور آگنی دیوتا کی ناراضگی کے قیاس لگاتے تھے۔ اور ہر ممکن کوشش سے اُن کے قہر و غضب کو روکنے کے لئے اور اُن کی خوشنودی کی خاطر گائے۔ بچھڑے گھوڑے بلکہ انسان تک کو بیدریغ قربان کر دیتے تھے اور سوم رس دیوتوں کے اکل و شرب کے لئے رکھ دیتے تھے۔ اس قسم کی فطرت پرستی اور خدا کی قدرت کے مظاہرات و آثار کی پوجانہ صرف ہندوستان ہی میں ہوتی تھی بلکہ ایک زمانہ کہ ایسی جہالت اور خوش اعتقادی ہمہ گیری تھی اور کوئی ملک یا قوم اس سے آزاد نہ تھی۔ مصری امیرس واسس تھا۔ تھاتھ۔ کھیم۔ پتھا اور میض اور متبرک سانڈ کے پوجاری تھے۔ اسی طرح یونان۔ ایران۔ کارتھیج بابل۔ نینوہ۔ سریہ۔ روم۔ امریکہ اور جرمنی وغیرہ تمام ممالک میں اُلو۔ بیل۔ وینس۔ جیویپیٹر۔ بعل۔ عستارات۔ ہرکیولیس۔ آپٹیس۔ سٹارٹی۔ ایڈونس۔ بیکس اور پالو وغیرہ کی پرستش بڑے زوروں پر تھی۔ اور تاحال ایسی باطل پرستی کا بقیہ دنیا کے تمام حصص میں کم و بیش موجود ہے۔ بائبل مقدس میں بھی اُس زمانہ کی وحشیانہ رسوم کا کئی جگہ صاف ذکر موجود ہے۔ بائبل مقدس میں بھی اُس زمانہ کی وحشیانہ رسوم کا کئی جگہ صاف ذکر موجود ہے۔ مثلاً طفل کشی۔ اور وادیوں میں چٹانوں کے شگافوں کے نیچے بچوں کی ذبح کرتے ہوگا (یسعیاہ ۷: ۵)۔ پھر بچوں کو آگ میں جلانا "اور اُنہوں نے توفت کے اونچے مقام بن ہنوم کی اونچی وادی میں بنائے تاکہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں جلائیں" (یرمیاہ ۷: ۳۱)۔ "تم خداوند اپنے خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ جن جن کاموں سے خداوند کو نفرت اور عداوت ہے وہ سب اُنہوں نے اپنے دیوتاؤں کے لئے کئے ہیں۔ بلکہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی اپنے دیوتاؤں کے نام پر آگ میں ڈال کر جلا دیتے ہیں" (استثنا ۱۲: ۳۱)۔

زمانے نے ایک کروٹ بدلی۔ کچھ انقلاب پیدا ہوا۔ تعلیم و تہذیب ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ امور جسمانی سے متعلق ہو یا روحانی سے اعتدال اور میاہ روی نہایت ضروری ہے۔ افراط و تفریط کی صورت خواہ کسی صورت میں پوجی جائے۔ ہر حال میں نتائج بجائے خوشگوار ہونے کے غیر مفید و مضرت رساں ثابت ہوں گے۔ اعتدال فطرت کا نسخہ منسوخ ہے۔ اور اس کے خلاف عمل کرنے سے ہر پہلو سے تشویشناک آثار و نتائج کا ظہور بطور لازم و ملزوم کے لائبدی ہے۔ حسن عقیدت اور سوء عقیدت میں افراط و تفریط ہے۔ اس لئے ان ہر دو خیالات کا باطل اور ناقابل تسلیم ہونا بدیہی۔ عقیدہ ویدانت بھی چونکہ سوء عقیدت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس جگہ اُس کو معرض بحث میں لانا ضروری ہوگا۔ لہذا اب ہم مختصر طور پر مسئلہ ویدانت کی کھوج کریں گے۔

## ویدانتے

جملہ مذاہب کے معتقدات اس امر میں اتفاق کلی رکھتے ہیں کہ تمام نوع انسان کی طبائع کو کسی نہ کسی طرح سے عرض گناہ عراض ہے۔ اور استقرانی طور پر بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلم الثبوت ہے۔ مسئلہ گناہ پر پوری بحث ہم آگے چل کر مناسب مقام پر کریں گے۔ سردست عقیدہ ویدانت کے مطابق گناہ اور نجات پر مختصر طور پر لکھیں گے۔ ویدانتی لوگ گناہ کو اگیان اودیا اور بھرم وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور اُن کے مسلمات کے مطابق گناہ یا پاپ ایک اعتباری محض اور عدمی شے ہے۔ اور خارج میں اُس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اُس کو محض اگیان یا بھول ہی مانتے ہیں اور اگیان پر اپتی

کو برہم پر اپنی کاسبب مانتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ برہم میں سے پر کرتی یا مایا پیدا ہوئی۔ اور پر کرتی نے ہی برہم کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ جیسے مکڑی میں سے جالا نکلا اور اسی نے مکڑی کو پھنسا رکھا ہے۔ یہ جگت نتھیار (خواب و وہم) ہے اور برہم ست (حقیقت) ہے۔

دراصل برہم اور مایا (مادہ پر کرتی) کا جو خیال ہے وہ بائبل کی تخلیق آدم و حوا کا ایک بگڑا ہوا اور کسی قدر صاف عکس ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ آدم برہم تھا اور حوا مایا پر کرتی ہے۔ اور حوانے آدم میں سے بالکل نکل کر آدم کو ہی اپنے فریب میں پھنسا لیا۔ اور اس طرح سے گناہ دنیا میں آیا اور سب آدمیوں میں پھیل گیا۔ اور تمام آلام و مصائب گناہ کا نتیجہ ہیں۔ اور پھر وہ مانتے ہیں کہ اگیان (جہالت) کی تاریکی سے نکل کر گیان کو حاصل کرنا ہی گمٹی یا براہم پر اپنی ہے۔ اور اس طرح جیو اور مادہ برہم میں لین یا بھید ہو جاتا ہے۔ جس طرح صوفی لوگ بھی آخری منزل کو فنا فی اللہ ہونا مانتے ہیں یعنی جیو (روح) اور برہم میں کسی قسم کا تغیر و تفاوت نہیں رہتا۔ بلکہ التصاق تام ہوتا ہے۔ اور ڈوئی کے پردہ کے ہٹ جانے سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک حباب یا قطرہ سمندر میں غائب ہو کر اپنے خصوصی امتیاز کو کھودیتا اور اسی کا روپ ہو جاتا ہے۔ دراصل وہ برہم سے اوپر کسی اعلیٰ ہستی یا خالق کے قائل ہی نہیں ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ جس طرح گناہ کے باعث انسان کی خدا سے جدائی ہوئی اسی طرح گناہ سے مخلصی حاصل کر کے انسان آدم والی ابتدائی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر پھر تقریب الہی حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم نجات دہندہ اور نجات یابندہ کی ہستیوں میں امتیاز کے قائل ہیں۔ اور خالق و مخلوق کو جدا جدا ممتاز ہستیاں مانتے ہیں۔ یعنی نجات کی حالت میں ہم خدا کی عین ذات نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اوصاف ملکوتیہ کے باعث خدا کی مشابہت قریبی رکھتے ہیں۔ جیسے ابتدا میں خدا نے آدم کو اپنی صورت پر ذی ارادہ پاک اور فعل مختار بنایا۔ اسی طرح دوبارہ شبیہ اللہ کے ساتھ ظلی طور پر ہماری مشابہت ہو جاتی ہے۔ نہ یہ کہ برہم میں لین ہو جاتے ہیں۔ جب مسیح جو ہماری زندگی ہے ظاہر کیا جائے گا تو تم بھی جلال میں اُس کے ساتھ ظاہر کئے جاؤ گے" (کلمیوں ۳: ۳-۴) ویدائیوں کا خیال ہے کہ برہم ہی خالق اور برہم ہی مخلوق ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال نادرست ہے کیونکہ خالق و مخلوق۔ فاعل و مفعول اور صانع و مصنوع میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ یا تو خالق و مخلوق اور کارن و کارج مترادف الفاظ ہوں گے۔ جس طرح پیار و محبت۔ اور رنج و غم مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں اور یہ سراسر محال ہے۔ جس طرح ضارب کے بغیر مضروب والد کے بغیر پسر اور کاتب کے بغیر مکتوب کا وجود محال ہے۔ اسی طرح صانع کے بغیر مصنوع اور کارن کے بغیر کارج کا ہونا ناممکن و محال ہے۔ ورنہ کارن و کارج وغیرہ تو ہمت کا ذخیرہ ہوں گے۔

**دوم**۔ یہ لازمی امر ہے کہ فاعل کا وجود مفعول سے مقدم ہو اور مفعول کے فاعل کے ارادہ میں تو قدیم ہو سکتا ہے۔ لیکن وجود خارجی کے اعتبار سے

مفعول اور فاعل آئین واحد میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ اگر یوں ہونا ممکن ہو تو پھر کوئی کسی فعل کا فاعل نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ فاعل مقدم اور مفعول موخر ہو۔

**سوم**۔ برہم ست اور جگت متھیا کا خیال بھی ابتدائی سوء عقیدت اور کوراندہ فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ متھیا شے ست شے کا جڑ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ

کسی شے کا اپنے نقیض میں سے برآمد ہونا محال ہے۔ سورج میں سے تاریکی شہد سے تلخی اور سفید میں سے سیاہی کبھی نکل نہیں سکتی۔ اسی طرح ست برہم میں سے متھیا جگت کا برآمد ہونا ناممکن و محال ٹھہرا۔ ویدائیوں کا یہ خیال ہے کہ جیسے ایک ہی سوت سے مختلف الوان و اشکال کے کپڑے بنتے ہیں۔ اور اُن کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں مگر اڈھیڑنے پر وہی سوت کا سوت رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی برہم ہے جو جگت کی بو قلموں اشیاء میں جدا جدا معلوم

ہوتا ہے۔ اور وہ اشیاء مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہیں مگر ہے "سروم کھلودم برہم" لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ سونے کی ایک اینٹ ہے اُس کی ڈھال کر مختلف اطوار اور اشکال کے زیورات بنا کر اُن کے متفرق نام رکھے جاتے ہیں۔ تاہم وہ سونازیورات کی صورت میں تبدیل کر دینے سے بھی سونا ہی رہے گا۔ پیتل نہیں بن جائے گا اور نہ ہی مٹھیا ہوگا۔ کیونکہ ست میں سے است کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ برہم ست ہے تو جگت بھی ست ہے۔ گرنہ صاحب کی گواہی بھی یہی ہے کہ "آپ ست کیا سب ست"۔ علاوہ ازیں اگر سچ وچ ویدانت کے خیال کے مطابق یہ دنیا محض وہی وخیالی ہو تو چاہیے کہ اگر آگ کو پانی کہا جائے تو وہ پانی ہو جائے۔ اور اسی طرح اگر دن کو رات کہہ دیا جائے تو فوراً رات ہو جائے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس عالم کی حقیقت ثابت ہے۔ اور جگت مٹھیا اور برہم ست کے مسئلہ کا ابطال ظاہر ہے۔

## چارم - عقیدہ ویدانت کے مطابق خدا کا مرکب ماننا پڑتا ہے کیونکہ تمام جہادات۔ نباتات حیوانات اور ارواح کا اسی میں سے برآمد ہونا ثابت کرتا ہے کہ تمام مادی وغیر مادی اشیاء برہم کے اجزا ہیں۔ اول تو مادی وغیر مادی آپس میں ایک دوسرے کے اجزاء نہیں ہو سکتے۔ اور پھر برہم کے اجزائے سے برہم کو ترکیب لازم آتی ہے۔ اور شے مرکہب اول تو حادث ہوتی ہے اور برہم کا حدوث ایک اور خالق کو گنجائش دیتا ہے۔ جو اُس سے قدیم ہو کر اُس کی بھی علت ٹھہرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مرکہب ہونا کوئی اعلیٰ صفت نہیں چاہتا۔ ترکیب ادنیٰ اجسام کا خاصہ ہے۔ روح اعلیٰ وجود ہے اور وہ غیر مرکہب ہے۔ جسم ادنیٰ شے ہے اور یہ مرکہب ہے۔ پس برہم کا مرکہب ہونا اُس کے متنزل اور ادنیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

## پنجم - ویدانت کے مطابق برہم کو سگن اور زرگن مانا جاتا ہے۔ یعنی جب اُس کا تعلق تین گنوں ست۔ رج۔ تم سے ہو تو وہ سگن ہوتا ہے اور جب ان تین گنوں سے جدا ہو تو وہ زرگن ہوتا ہے اور جب ان تین گنوں سے جدا ہو تو وہ زرگن ہوتا ہے۔ لیکن اُن کا یہ نظریہ بھی دیگر خیالات کی طرح خلاف عقل ہے۔ ذات اور صفات آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ ذات مجموعہ صفات ہے۔ جس طرح صفات کا وجود بغیر موصوف کے محال ہے۔ اسی طرح موصوف کا وجود بلا صفات ممکن نہیں۔ برہم کو سگن اور زرگن ماننے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ذی صفات بھی ہے اور لا صفات بھی۔ اس طرح واحد ذات میں دو نقیصوں کا اجتماع جائز ٹھہرا کر خدا کی ہستی سے منکر ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں ایک شخص عالم بھی ہو اور لا علم بھی۔ زندہ بھی ہو اور مردہ بھی۔ موصوف کے بغیر صفت اور صفت کے بغیر موصوف کا وجود قطعی محال و ممنوع ہے۔ مثلاً آگ ذات ہے اور حرارت اُس کی صفت۔ اگر حرارت نہ رہے تو آگ کی ذات کا انکار لازم آئے گا اور اگر آگ نہ ہو تو حرارت کا وجود کہاں رہیگا۔ پس لامحالہ ایک ہی خدا سگن اور زرگن دونوں نہیں ہو سکتا اور محض زرگن بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بے صفات شے اعتباری محض اور عدمی ہوگی نہ کہ نفس الامری اور حقیقی۔ پس یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ذی صفات (سگن) ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی وجود ہے۔ اس لئے بھی کہ مخلوقات جو اُس سے صادر ہوئی وہ ذی صفات ہے۔ (رومیوں: ۱۹ سے ۲۰)۔ اگر خالق کو بے صفات (زرگن) مانا جائے اور اُس کی مخلوقات کو ذی صفات (سگن) تو ایک نقیض کو دوسرے نقیض کی علت ماننا پڑے گا۔ اور یہ محال ہے۔ لہذا خدا لہ۔ ذی صفات اور حقیقی وجود ہے اور ویدانت کا عقیدہ سراسر باطل ہے۔

رہا یہ خیال کہ جو کچھ نظر آتا ہے سب برہم ہے۔ اس کے متعلق یہ امور قابل غور ہیں کہ جبکہ کوئی انسان اپنے جسم۔ رنگ۔ شکل و صورت۔ خدوخال۔ صحت و سقم۔ عادات و خصائل اور حُسن و قبح میں کسی دوسرے انسان سے مناسب و مطابقت تام نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر انسان میں ایک دوسرے

## ششم

سے نمایاں امتیاز پایا جاتا ہے۔ اور جس کے باعث ہم ماں باپ بہن بھائی حاکم محکوم اور دوست و دشمن کو جدا جدا پہچانتے ہیں۔ اور ان امتیازات کے باعث ہر ایک کی شخصیت کے متعلق "میں" کا احساس ہونے پر دیگر افراد سے خود کو ممتاز سمجھتے اور اپنی شے کو "میری" کہتے اور اپنی اشیاء مقبوضات کو دیگر افراد کی اشیاء سے عزیز رکھتے اور ان کے کھو جانے پر افسوس کرتے ہیں تو کس صورت میں تمام خلقت ایک برہم ہو سکتی ہے؟ زید کے مبروص ہونے سے بکر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک کو گیان ہونے سے سب کو گیان نہیں ہوتا۔ ایک سانپ کو مار دینے سے تمام سانپوں کا زہر دُور نہیں ہوتا۔ تو بھلا اس خیال کی صحت کی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ "سروم کھلودم برہم" بلکہ اس خیال میں ایک بھاری قباحت یہ ہے کہ بہن۔ بیٹی۔ ماں۔ زوجہ۔ خالہ اور دادی وغیرہ رشتوں میں کوئی فرق نہ رہنے کے باعث ان سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنا پڑے گا۔ اور تمدنی و خاندانی زندگی میں سخت مشکلات پیش آئیں گی۔ اور ان تمام رشتوں ناطوں کا باہد گر ممتاز صورت قائم رہنا بھی اس عقیدہ کے ابطال کی ایک مسکت دلیل ہے۔

## ہفتم

اور اگر فی نفسہ یہ تمام جگت ایک ہی برہم ہے۔ تو ذات پات اور اُوچ نیچ کے مکروہ و ناشائستہ خیالات اور اعلیٰ و ادنیٰ کے امتیازات کے کیا معنی ہیں؟ ویدانتی بھگتوں کو تو کتے بلیوں اور گدھوں کووں کے ساتھ کھانے پینے سے بھی پرہیز جائز نہیں۔ چہ جائیکہ اچھوتوں کے ساتھ چھو جانا بھی زندہ درگور ہونے کا مصداق بنا ہوا ہے۔ اگر سرب جگت کو برہم ثابت کرنے بیٹھے تھے تو پہلے ان معمولی ابتدائی باتوں کی تو اصلاح کر لیتے اور کم از کم چھوت چھات کے قلعہ کو تو پہلے سر کر لیتے۔ اگر ویدانت کی یکتائی کی تعلیم کی مثال سوائے ویدانت کی دنیا کے اور کسی بھی مذہب میں موجود نہیں۔ لیکن اگر برہم گیانیوں کے عملی پہلو کو دیکھ جائے تو ان کی سی امتیاز پسندی اور باہد گر نفرت و جدائی کے خیالات کی کثرت کی مثال بھی کافی نام پر اور کسی مذہب میں ہر گزہر گزہر ملے گی۔ گویا یکتائی تو صرف زبان کے لئے ہے اور جدائی عمل کرنے کے لئے۔ یہ تو اس شخص کا ساحل ہوا کہ جس کے گھر میں تو افلاس کی وجہ سے چوہے بھوکے مرتے ہوں اور زبان سے رٹنا پھرے سونا۔ سونا۔ اگر ان بھلے آدمیوں سے کوئی پوچھے کہ صاحب! ایسی زبردست یکتائی کی تعلیم اور پھر ان امتیازات کے معنی؟ تو جواب یہ ہوتا ہے کہ ابھی ہم اگیانی ہیں۔ جب گیان ہو جائے گا تو امتیازات نہ رہیں گے۔ اول تو ہمیں آج تک کوئی ویدانتی پورن گیانی نہیں ملا۔ اگر کوئی ہزار میں سے ایک ہو گا تو گیان کی مشین کی سست رفتاری پر شکر کی گنجائش نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ ابھی مجھے پورا گیان نہیں ہو جا رہا ہے تو امتیازات کو چھوڑ دوں گا۔ تو اس کے اس اقرار ہی سے ثابت ہے کہ وہ ان امتیازات کی قباحت سے آگاہ ہے اور انہیں مٹانا بھی چاہتا ہے تو بھلا اس سے زیادہ گیان اور کیا ہوتا ہے۔ سب زبانی جمع خرچ ہے اور حقیقت ندارد۔ اپنی اخلاقی کمزوریوں کی پردہ دہری کے لئے اگیانی بن جاتے ہیں۔ ایسی تعلیموں نے ملک کی ذہنیت کو غایت درجہ پست کر رکھا ہے۔ اور جب تک ان خیالات کی جان کا فاتحہ نہ پڑھا جائیگا ہم حقیقی اخلاقی شائستگی۔ تمدنی آزادی اور روحانی ترقی سے بے نصیب رہیں گے۔ شکر کا مقام اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ مسیحیت نے

\_\_\_\_\_

نے ہند میں تمدنی اصلاحات اور مساوات کی تحریکوں کو جنم دیا ہے جس کی تقلید پر آج آریہ۔ سکھ اور مسلمان جھکے ہوئے ہیں۔

پھر کوئی ان ویدانتیوں سے یہ تو پوچھے کہ کسی شیر چیتے اور سانپ وغیرہ سے خائف و سہمگیس ہو کر کیوں بھاگے جبکہ وہ اسی کا روپ ہے۔ کوئی دویت نہیں۔ اس واجبی اجابت کا جواب اکثر ہمیں یہ دیا جاتا ہے کہ بھرم کے آگے بھرم بھگتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ بھرم سے ڈر کر بھرم بھاگ جاتا ہے نہ

## ہشتم

کہ ویدانتی۔ اس مضحکہ خیز جواب سے ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اول اس لئے کہ شیر اور ویدانتی دونوں حقیقی اور خارجی وجود ہیں کہ نہ وہی اور پھر دونوں برہم۔ دوسرے یہ کہ وہم سے وہم کیسے ڈر کر بھاگ سکتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں اُس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک وہم دوسرے وہم کو ڈر کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح باطل ہے۔ دواشیا جو اپنی خاصیت میں ایک ہی ہیں وہ ایک دوسرے کی مدافعت نہیں کر سکتیں۔ مثلاً سردی سردی کو اور گرمی گرمی کو اور تاریکی تاریکی کو کبھی ڈر نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی خاصیت اپنی متضاد خاصیت کے وسیلے ڈر کی جاسکتی ہے۔ لہذا وہم وہم سے ڈر کر بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ ویدانتی شیر سے ڈر بھاگتا ہے۔ اسی سے اُن دونوں میں مغائرت و تفاوت ظاہر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تمام جگت برہم نہیں ہے۔ بلکہ خدائے واجب الوجود و فوق الفطرت تمام مصنوعات مرئیہ اور غیر مرئیہ اور سفید و علویہ کا واحد خالق اور صانع ہے۔ اور وہی تمام کائنات پر حکمران ہے۔ وہ مرہ کب نہیں۔ زرگن نہیں۔ گیان و اگیان ہر دو کا بانی نہیں۔ اُس نے مخلوقات کو اپنے میں سے نہیں نکالا اور نہ ہی تمام ممکنات فنا ہو کر اُس میں مل جائیں گی۔ وہ ازلی وابدی غیر مرئی۔ لطیف الہی صفات خالق مالک رازق فوق الفطرت اور ادراک عقل انسانی سے باہر ہے۔

**آتمائیتہ مکوتے**۔ ویدانتوں کا خیال ہے کہ آتمائیتہ مکوت اور برلیب (منزہ عن الخظا) ہے۔ اور اُس پر گناہ مطلق اثر انداز نہیں

ہو سکتا کیونکہ وہ غیر مادی اور غیر متاثر ہے۔ وہ ہمیشہ پاک و صاف رہتی ہے۔ پاپ (اگیان) صرف ستھول دیہہ (کثیف جسم) ہی سے متعلق ہے۔ اور دکھ سکھ کے سب اثرات دیہہ ہی پر ہوتے ہیں۔ رُوح ان کیفیات سے قطعی متکلیف نہیں ہوتی۔

**اول**۔ اگر متزہ تام رُوح کا خاصہ ذاتی ہے۔ اور گناہ جسم کا خاصہ ذاتی ہے۔ تو اس صورت میں رُوح اور جسم کی طبائع باہم گر متضاد ہوئیں۔

اور ضدین کا اجتماع محال ہے۔ اور یوں انسانی زندگی کا قائم رہنا محال ٹھہرا۔ (شائد اسی واسطے جگت کو متھیا سمجھتے ہیں) لیکن انسانی زندگی قائم ہیں۔ پس گناہ کا تعلق رُوح و جسم دونوں سے ثابت ہو گیا۔

**دوم**۔ اگر پاکیزگی اور معصومیت تام رُوح کا خاصہ ذاتی ہے۔ تو حصول موکھش (نجات) یا برہم پر اپتی کی خاطر اس قدر کٹھن ریاضیتیں

کرنا فضول اور تحصیل لا حاصل ہے۔ جسم کے فنا ہونے پر آتما پر ماتما میں جا ملے گی۔ کسی کو تپ جب سادھن وغیرہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ سراسر گمراہ کن عقیدہ ہے۔ دراصل اشرف شئے کے فساد سے ادنیٰ شئے کا فساد لازم آتا ہے۔ اگر اصل الشجر سوکھ جائے تو ڈالیاں کبھی قائم نہیں رہ سکتیں۔ برعکس اس کے ڈالیوں کے سوکھ جانے سے جڑ کا نقصان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح رُوح جسم کی بہ نسبت اشرف ہے۔ اگر اُس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو لازمی امر ہے کہ جسم بھی اُس بگاڑ سے متاثر ہو۔ پس اگر جسم میں گناہ موجود ہے تو رُوح میں اُس سے پہلے ہے۔ جب تک رُوح کی اصلاح نہ کی جائے جسم کی اصلاح ناممکن ہے اور جسم مادہ ہے۔ اور مادہ بذاتہ غیر ممد رک اور غیر متحرک ہے۔ بغیر رُوح کے سہارے کے وہ اچھا یا بُرا کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ پس ہر طرح سے رُوح پر ہی الزام آتا ہے۔ اس لئے آتمائیتہ اور نرلیب ہر گز نہیں ہو سکتی۔"

**سوم**۔ پس جبکہ روح اور جسم دونوں گناہ آلود ثابت ہو گئے تو اب سوال لازم آتا ہے کہ پھر گناہ کا وجود حقیقی ہے یا اعتباری محض۔ اگر کہو

اعتباری تو امر اعتباری کی مدافعت کے لئے خارجی تدابیر جیسے سادھن ریاضت وغیرہ اور کرم دھرم وغیرہ بے سود و بے کار ٹھہرتے ہیں۔ اور جب گناہ مفروض ذہنی ٹھہرا تو دکھ جو پاپ کا نتیجہ ہے وہ بھی ناپید ہونا چاہیے۔ اور کوئی بھی دنیا میں دکھیا اور مصیبت زدہ نہ ہونا چاہیے۔ اور اگر دکھ اور پاپ کوئی موجود فی الخارج شے نہیں تو نتائج کس پرندے کا نام ہے۔ اور ویدانتیوں کی جملہ تدابیر دربارہ مدافعت اگیان اور حصول موکھش کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ تو اس سڑی آدمی کا ساحل ہوا جو بری یا سیرغ (ایک فرضی عظیم الجثہ پرندہ جس کی نسبت وہی لوگوں کا خیال ہے کہ ہاتھی کو پنوں میں لے کر اڑ جاتا ہے) کے خوف سے غاروں میں چھپتا پھرے۔ اور یا حصول اقبال و دولت کے لئے ہلکا تلاش میں صحرا انوروی و باد یہ پیمائی کرتا ہے پھرے۔ حالانکہ یہ دونوں پرندے قوت و اہمہ کی اختراع کا وہی نتیجہ ہیں۔ اگر کہو کہ گیان ہونے پر ان وہی تصورات کا سدباب ہو جاتا ہے تو کیا اب کس برہم گیانی کو دکھ درد محسوس نہیں ہوتا؟ اگر اب محسوس ہوتا ہے تو پہلے اُس کا وجود حقیقی تھا نہ کہ اعتباری۔ اور اگر کہو کہ اب بھی دکھ درد محسوس نہیں ہوتا تو یہ صریح باطل ہے۔ اگر کوئی روز روشن میں سورج کے وجود سے انکاری ہو تو اُس کے مضبوط الحواس اور سڑی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ چُونکہ دکھ درد وغیرہ کا وجود دنیا میں بدیہی الظہور ہے اور کسی ثبوت کا محتاج نہیں اور دکھ نتیجہ ہے پاپ کا۔ پس جب دکھ کا وجود حقیقی ثابت ہے تو اُس کا سبب یا علت یعنی گناہ کیونکر اعتباری ہوگا۔ لہذا گناہ بھرم اور وہم نہ رہا بلکہ حقیقی ٹھہرا اور یہ بالکل صحیح ہے۔

**گیان**۔ گناہ اور اُس کے نتائج دکھ درد اور رنج و محن کا وجود عالم میں بدیہی ہے۔ ویدانتیوں کا خیال ہے کہ گیان ہونے پر گناہ (بھول)

معدوم ہو جاتا ہے۔ واضح ہو کہ گیان کے معنی علم ہیں۔ کسی بیماری کا محض علم اُس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر بیماری کا علم ہی اُس کا علاج ہو سکتا تو صفحہ ہستی پر ڈاکٹروں اور حکیموں کا وجود ناپود ہوتا۔ کسی مریض کو اُن کا منت کش احسان ہونے کی کبھی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ بلکہ اپنے مرض کے محض علم ہی سے شفا ہو جایا کرتی۔ گیان وغیرہ کے بھروسے پر رہ کر گناہ کی طرف سے آنکھیں بند رکھنا سخت نادانی اور کج فہمی ہے۔ گیان یا علم (شرع) سے تو محض گناہ کی پہچان ہوتی ہے۔ (رومیوں ۳: ۲۰) فرض کرو ایک شخص اندھیری رات میں ایک ایسے مکان میں سویا ہوا ہے جو اندر سے نہایت گندہ اور غلیظ ہے۔ مکڑی کے جالے کوڑا کرکٹ وغیرہ بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن وہ شخص نہایت اطمینان سے اُس میں شب باش ہے۔ اب ایک دوسرا شخص چراغ لے کر اُس کمرے میں وارد ہوتا ہے۔ لیکن چراغ کی آمد سے مکین کی طبیعت میں ایک دم ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح مطمئن اور پرسکون نہیں رہتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ چراغ کی روشنی نے مکان کی غلاظت و گندگی کو اُس پر ظاہر کر دیا۔ اب وہ ایک لمحہ تک اُس میں رہنا نہیں چاہتا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اُس مکان کو فوراً غلاظت سے پاک کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ چراغ اُس مکان کو ہرگز صاف نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف اُس کی گندگی کو ظاہر کر کے محض اُس کی مدافعت کی طرف مائل ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح گیان (علم شرع) کو ایک چراغ سمجھیئے۔ (زبور ۱۱۹: ۱۰۵) ذہ انسان کے گناہوں کی کراہت کو اُس پر ظاہر کر دیتا ہے۔ لیکن دُور نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ نجات کی ضرورت کو محسوس کروا کے کسی طبیب روحانی کی طرف ترغیب دلا سکتا ہے۔ اور متلاشی حق بنا دیتا ہے۔ اور اُن کا یہ خیال بھی عجیب ہے کہ گیان حاصل ہونے پر سادھن (عملی تدابیر) ختم ہو جاتے ہیں۔ جیسے پھل لگنے پر پھول خود بخود جھڑ جاتے ہیں۔ اور مسیحی مسلمات کے مطابق گیان (علم شرع) کے حصول کے بعد اصل سادھن شروع ہوتے ہیں۔ جیسے مرض کا

علم ہو جانے پر ہمت سے غذاؤں سے پرہیز رکھنا اور بہت سی دواؤں کا استعمال کرنا پڑتا ہے پرانی انسانیت کو اُس کے کاموں سمیت اُتارنا پڑتا اور نئی انسانیت کو پہننا پڑتا ہے (کلیسیوں ۳: ۹-۱۰) برہم گیانی کو تونیک اور بد دونوں قسم کے کاموں کو تیا گنا پڑتا ہے۔ لیکن انجیل اس کے برخلاف یہ حکم لگاتی ہے کہ "پس جو کوئی نیکی کرنا جانتا ہے اور نہیں کرتا اُس کے لئے یہ گناہ ہے" (یعقوب ۴: ۱۷)۔ جب تک خوابیدہ شخص کو گھر میں لگی ہوئی آگ کا علم ہی نہیں وہ اُسے کیسے بجھائے گا؟ جو نہی اُس کی آنکھ کھلے گی اور مکان کی آتشزدگی کا گیان ہو گا وہ ایک دم عملی تدابیر (سادھن) اُس کے بجھانے کی کرے گا۔ اگر آگ کا گیان ہونے پر بھی اُس کے بجھانے کی ضرورت کا قائل نہ ہو تو اُس کے سڑی ہونے میں کیا شک ہے؟

## مکتی از روئے ویدانتے

انسان پر اُس کی گناہ آلودہ اور مکروہ حالت کو پورے طور پر آشکارا کر دیتا ہے۔ اور اُس سے چھٹکارا ہرگز نہیں کرا سکتا۔ بلکہ نجات کی ضرورت محسوس کروا دیتا ہے۔ اور ویدانتی مکتی کو چار قسم کی مانتے ہیں یا یوں کہیں کہ از روئے ویدانت نجات کے چار مدارج ہیں۔ یعنی: سلوک۔ سمیت۔ سُروپ۔ سمجھ۔

**اول۔ سلوک۔** یعنی برہم کے دیس میں رہنا۔ **دوم۔ سمیپ۔** یعنی برہم کی قربت میں رہنا۔ **سوم۔ سُروپ۔** برہم کے ساتھ مشابہت و مماثلت حاصل کرنا۔

**چہارم۔** سمجھ یعنی برہم کی عین ذات ہو جانا۔ جس کی وہ ابھید ہونا یا برہم میں لین ہونا۔ (سماجانا) کہتے ہیں۔ وحدۃ الوجود یعنی سمجھ ہی مکتی کا کمال ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کوئی کمال کی حالت نہیں بلکہ برعکس اس کے انتہائی زوال اور عدم کی حالت ہے۔ اول تو ابھید ہونے میں کوئی آئند نہیں کیونکہ تودوئی (دویت) میں ہوتا ہے نہ کہ ادویت میں۔ ایک طرف معبود ہو اور دوسری طرف عابد اپنے معبود کے وصل سے اپنی مدتوں کی تشنہ روح کی تشنگی بجھائے اور اُس کے دیدار فیض آثار سے اطمینان قلبی اور سکون باطنی حاصل کرے۔ یک جان دو قلب ہو جائیں تب حقیقی آئند ہے۔ لکن برہم میں فنا ہو جانا کوئی اطمینان کی بات نہیں ہے۔ ایسی مکتی نہیں بلکہ انتہائی بے بسی اور لاچارگی کی حالت ہے۔ اور نہ ہی از روئے عقل یہ ممکن ہے کہ جیو جو الپگیہ (محدود) ہے۔ برہم میں جو سروگیہ (لامحدود) ہے کسی صورت ابھید ہو سکے۔ کیونکہ فنا ہی وجود لا انتہا زمانہ تک ترقی کرتے جانے سے بھی کبھی بے حد نہیں ہو سکتا۔ ازیں جہت محدود و لا محدود جو باہم نقیضین ہیں کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ از روئے ویدانت انسان کے بھلے اور بُرے افعال کی جزا و سزا دینے والا کوئی عادل و مصنف خدا نہیں ہے۔ اور برہم ہی ہر طرح کی نیکی و بدی کا مخرج و منبع ہے اور دو نقیضوں کا علت واحد پر اجتماع جائز سمجھتے ہیں۔ اور پاپ اُن کے نزدیک غیر فطری امر نہیں ہے۔ پاپ کا نتیجہ چوراہی لاکھ جنموں کا چکر اور پاپ کے تیاگ اور گیان پر اپتی کا انجام برہم کی ذات میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لئے معدوم اور ناپید ہو جانا ویدانت کے مطابق طریق حیات اور نجات وغیرہ کا تصور نہایت گمراہ کن اور ہلاکت آفرین ہے۔ اس کے مطابق انسان کو نراچھت (بے خواہش) ہونا نجات کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی قانون قدرت کے خلاف جہاد ہے کیونکہ انسانی فطرتی طور پر بے خواہش نہیں بلکہ باخواہش پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ خواہشات کا نیک ہونا انسانی کمال کا نشان ہے۔ اور عدم خواہش تو ادنیٰ اجسام کی خاصیت ہے۔ جیسے پتھر۔ دھات اور نباتات وغیرہ میں اچھی یا بُری کوئی بھی خواہش نہیں پائی جاتی۔ ہاں برہم میں فنا ہو جانے سے نیستی ہی ہوگی۔ اور سچ ہے کہ نیستی میں خواہش کا وجود محال ہے۔

جبکہ چوراسی لاکھ جنموں میں سے صرف انسانی جنم ہی اعلیٰ اور بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ اور خواہشات کا وجود اور نیک و بد خواہش کا امتیاز بھی اسی جنم میں حاصل ہوتا ہے تو لازم تھا کہ اس جنم کا انتہائی کمال یہ سمجھا جاتا کہ اُس میں خواہش کا ظہور اور بھی اعلیٰ ہوتا۔ اور وہ اس صورت میں ہوتا کہ انسان کی خواہشات مفید و ذمیرہ معدوم ہو جاتیں۔ اور برعکس اس کے خواہشات علویہ و سعیدہ اور جذبات لطیفہ روحانیہ میں حد کمال کو پہنچتا۔ لیکن افسوس! کہ ویدانتی لوگوں نے نکتہ جیو کو قطعی بے خواہش مان کر نجات کو ایک انتہائی متزلزل اور ادنیٰ حالت ثابت کیا ہے۔ تاہم بے خواہش ہونا بھی خلاف واقعہ ہونے کے باعث جہل مرکب ہے۔ کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اس ملبوس ہستی میں کوئی انسان بے خواہش ہر گز نہیں ہو سکتا۔ لہذا کسی ویدانتی کو مکتی کی امید نہ رکھنا چاہیے۔ پھر برہم گیانی کو کسی کے ساتھ بولنا نہ چاہیے۔ کیونکہ دوسرے کو تو تم اور تمہارے وغیرہ کہنے سے دوئی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت نے زبان و ذہن انسان کو استعمال کے لئے دے رکھے ہیں۔ اور قدرت اپنے قوانین کو جبری طور پر منواتی ہے۔ اور اس لئے ضرور بولنا ہی پڑتا ہے۔ مگر برہم گیانی اپنی اس کمزوری و نقیص کی پردہ داری ایک اور صورت میں کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جو گیاسو (طالب علم) کو سمجھانے اور تعلیم دینے کے لئے بولتے ہیں ورنہ بولنے کی کوئی اچھیا (خواہش) نہیں ہے۔ اجی صاحب! جو گیاسو کو اگیان کی تاریکی سے نکالنے اور راہ راست پر لانے کی فکر بھی تو ایک خواہش ہے۔ خواہش کے معنی میں چاہنا۔ جب تم چاہتے ہو کہ دوسروں کو اپدیش کر کے راہ راست پر لاؤ تو خواہش اور کس پرندے کا نام ہے۔ ویدانتی فنا ہونے کو مکتی اعلیٰ حالت سمجھتے ہیں اور زندگی کو لعنت اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ۔ ہم زندگی سے خارج ہونے کو ہلاکت اور ابدی زندگی کو خدا کی بخشش اور انعام سمجھتے ہیں۔ اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ کونسا طریق انسان کی فلاح و بہبود جسمانی و روحانی کا آئینہ دار ہے۔ سوء عقیدت مسئلہ ویدانت کا جنم وہ ہے۔ اور اُس کی تقلید سے نہ تو انسان دینیو تہذیب و شانستگی کو حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس طبعی موت کے بعد اُس کے لئے حقیقی خوشی اور اطمینان و سکون قلبی کی کوئی امید باقی رہتی ہے۔ اور انسان آئندہ زندگی کی سنہری امیدوں سے ہاتھ دھو کر یہی کہتا ہے کہ "اگر مردے نہ جلائے جائیں گے۔ تو آؤ کھائیں۔ پیئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائینگے"۔ (انجیل شریف۔ اگر نھیوں ۱۵: ۳۲)۔

**انجیل نجات**۔ انجیل کی رو سے نجات یا بندہ کی مختصر سی تعریف یہ ہے:۔ پُرانی انسانیت مصلوب ہو کر گناہ کا بدن بیکار

ہو جائے۔ آگے کو گناہ کی غلامی میں نہ رہے (رومیوں ۶: ۶) بدن گناہ کے سبب سے مردہ اور روح راست بازی کے سبب زندہ ہو (رومیوں ۸: ۱۰)۔  
 حصول کمال کی استعداد پیدا ہو جائے (۲ کرنتھیوں ۳: ۱۸)۔ آنخداوند مسیح کے ساتھ مشابہت ہو جائے (فلپیوں ۳: ۲۱۔ ایوحنّا ۳: ۲) خدا کے ساتھ ملاپ (افسیوں ۲: ۱۳۔ ۲۲) سزائے عدالت سے رہائی (رومیوں ۸: ۱) اور یہ نجات خدا کی بخشش ہے نہ کہ ہماری کمائی ہوئی (افسیوں ۲: ۸ سے ۹) اور یہ نجات ابدی اور لازوال ہے (مکاشفہ ۲۱: ۳۔ ۷۔ ۲۳: ۲۷۔ عبرانیوں ۹: ۱۲)۔

**روح کے متعلق عقائد یوں تو روح کے وجود کے متعلق دنیا میں بے شمار عقائد ہیں۔ اور اُن سب کو بحث میں لانا**

محال بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ اگر ان تمام عقائد کو اجمالی طور پر دیکھا جائے تو تین قسم کے خیال معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ایک خیال کے مطابق روح مرکب امتزاجی ہے۔ دوسرے خیال کے مطابق ازلی وابدی اور بالذات ناقابل فنا ہے۔ اور تیسرے عقیدہ کے مطابق روح حادث ہے۔ اور اپنی فنا یا بقا کے معاملہ میں ذات واجب کی محتاج ہے۔ اب ہم ان ہر سہ عقائد پر مختصر طور پر کریں گے۔

# روح مرکب امتزاجی

مرکب امتزاجی ہے۔ اس عقیدہ کا بانی برہسپتی تھا۔ یہ لوگ خدا کی ہستی سے قطعی منکر ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ جسم و روح میں کوئی مغائرت نہیں۔ اجزائے مادی کی ترکیب سے اجسام بنتے ہیں اور وہی اجزاء روح کا مادہ ہے جسم کے فنا ہونے سے روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جیسے ریکارڈ کے ٹوٹنے پر اُس کی آواز بھی مٹ جاتی ہے۔ اگر یہ درست مان لیا جائے تو روح مادی شے ٹھہری اور روح کی صفت ادراک ہے۔ پس درک مادہ کی صفت میں شامل ہو جائے گا۔ اور کوئی مادی شے غیر مدرک نہ رہے گی بلکہ مدرک و غیر مدرک کی تفریق اڑ جائے گی۔ مندرجہ ذیل دلائل سے بھی اس خیال کا ابطال ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ علم حکمت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ سات برس کے بعد جسم کے تمام پُرانے ذرات زائل ہو کر اُن کی جگہ نئے ذرات لے لیتے ہیں اور وہ جسم بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسی برس کی عمر تک گیارہ دفعہ جسم انسانی قطعی بدل کر ہر دفعہ نئے ذرات سے ایک نیا جسم مرتب ہوتا رہتا ہے۔ اگر ادراک و علم وغیرہ ذرات مادیہ کی صفت ہوتی تو لازم تھا کہ ہر ہفت سالہ معلومات پُرانے ذرات شدہ ذرات کے ساتھ ہی زائل و ناپید ہو جاتیں۔ کیونکہ اُن معلومات کے سرمایہ دار جو ذرات تھے جب وہ نہ رہے تو معلومات کا قائم رہنا محال ہوتا۔ اور اس طرح چودہ برس کی عمر کے واقعات اکیس برس کی عمر میں۔ اکیس برس کے اٹھائیس برس میں اور اٹھائیس برس کے پینتیس برس میں بھول جانے چاہئیں۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ پُرانے ذرات جدید ذرات کو اپنے اثرات سُرد کر جاتے ہیں اور یوں پُرانی معلومات و واقعات یاد رہتے ہیں تو اس صورت میں کسی بیمار کو کبھی تندرست نہ ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی جاہل کو عالم۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ پس جسم کے ذرات کے بار بار تبدیل و تحلیل ہوتے رہتے۔ اور کسی عضو کے کٹ جانے کے باوجود بھی جس حقیقت کے علم و ادراک و حافظہ وغیرہ میں سرمو فرق نہیں آتا وہی روح ہے۔ اور وہ وغیرہ مادہ ہے۔ جبکہ ذرات کے تحلیل ہونے سے وہ زائل نہیں ہوتی۔ کسی عضو کے کٹ جانے سے کٹ نہیں جاتی۔ تو اس میں شک نہیں کہ اگر جسم یکدم فنا ہو جائے تو بھی وہ قائم رہے گی۔ پس وہی روح ہے۔ اور غیر مادی و مجرد وجود ہے۔

۲۔ واحد حقیقی وہ ہے جس کا کسی طرح سے قسمت و تجزیہ نہ ہو سکے اور نفس ناطقہ جسم ہو تو جسم قابل قسمت و صاحب تجزیہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محل کی قسمت سے حال کا تقسیم ہونا لازم آتا ہے۔ پس جسمیت نفس ناطقہ کی چاہتی ہے قسمت کو اور قسمت نفس ناطقہ کی چاہتی ہے قسمت معنی واحد حقیقی کو۔ اور واحد حقیقی کا انقسام محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روح جسم نہیں بلکہ غیر مادی شے ہے۔

۳۔ جسم وہ ہے جو ابعاد ثلاثہ رکھے۔ (یعنی۔ طول۔ عرض و عمق) مگر عقل و علم جو انسان میں موجود ہیں اُن کی نہ کوئی مقدار ہے اور نہ امتداد۔ تمام اجسام مرکبات قسمت و تجزیہ کو چاہتے ہیں۔ مگر علم کا تجزیہ و قسمت محال ہے۔ لہذا علم خاصہ جسم نہیں۔ اگر کوئی غیر مادی ظرف ہمارے جسم میں اُس کے قیام کے لئے نہیں ہے تو غیر مادی مظروف (علم) کا وجود بھی محال ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ جو شے غیر مادی علم کا ظرف ہے وہ روح ہے۔ لہذا روح غیر مادی ہے۔

۴۔ ترکیب امتزاجی کے اجزاء عناصر ہیں۔ اور عناصر ہیں ادراک۔ علم کی استعداد مفقود ہے۔ پس جو صفت اجزا میں موجود نہ ہو وہ مرکب میں کیسے پیدا ہو جائے گی۔ کوئی مرکب شے اپنے اجزا کی کیفیت سے الگ کوئی صفت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر پانچ گرم دوائیں ملا کر کسی کو کھلائی جائیں تو اُس کے مزاج میں سردی پیدا نہ ہوگی۔ اور نہ ہی سرد دواؤں کی ترکیب میں گرمی۔ کالچ کے ایک ذرے میں شیرینی نہیں تو ایک من بھر کا کالچ میں بھی شیرینی نہ

ہوگی۔ ایک ریزہ سنگ میں علم نہیں تو ایک پہاڑ میں بھی علم نہیں ہے۔ درک اور عدم درک آپس میں نفیض ہیں۔ اور اس صورت میں ایک نفیض کو دوسرے نفیض کی علت ماننا پڑے گا۔ اور یہ محال ہے۔ لہذا یہ عقیدہ خلاف عقل اور بے بنیاد ہے۔

## روح قدیم و قائم بالذات دوسرے خیال کے مطابق رُوح ازلی وابدی۔ قائم بنفسہ اور

مُتَّصِف بصفاتہ ہے۔ ویدائیتوں کے کئی فرقے ہیں۔ اُن میں سے ایک فرقہ تو رُوح کے جداگانہ وجود کا قائل ہی نہیں۔ یعنی وہ اربعہ نہیں بلکہ ختمہ عناصر سے الگ کسی لطیف وجود کو نہیں مانتے۔ اور جو ویدائتی رُوح کی ہستی کے قائل ہیں تو وہ کثرت ارواح کے قائل ہی نہیں۔ بلکہ تمام مریات و غیر مریات میں ایک ہی رُوح مانتے ہیں۔ اور اُسے برہم (خدا) کا جز جانتے ہیں۔ وہ تمام اشیاء مادی و غیر مادی کو خدا میں سے نکالتے ہیں۔ اس خیال کے حامی خدا کو مرہ کب ثابت کرتے ہیں۔ چارواکے وغیرہ تو رُوح کو مرہ کب امتزاجی مانتے ہیں۔ اور ویدائتی خدا کو مرہ کب مانتے ہیں۔ آریہ لوگ بھی رُوح کو قدیم مانتے ہیں اور اُس کی قدامت کے اثبات میں بہت سے دلائل پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ہم قدامت رُوح کے عقیدہ کی بطلان کو مبرہن کر کے آخری اور صحیح عقیدہ پیش کریں گے۔

۱۔ امر مسلمہ ہے کہ ہر قسم کا علم و فہم اور عقل و ادراک رُوح ہی کا خاصہ ہے اور یہ خاصہ رُوح کا ذاتی ہے۔ اور خاصہ ذاتی کا انفکاک اپنی ذات سے محال ہے۔ پس اگر رُوح قدیم ہے تو اُس کی اپنی قدامت کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کسی کی بھی رُوح کو اپنی قدامت اور ازلیت کا نہ تو تفصیلی اور نہ اجمالی علم ہے۔ اگر کہا جائے کہ رُوح کو اپنے حدوث کا بھی تو علم نہیں تو وہ حادث کس طرح ہو سکتی ہے۔ تو واضح ہو کہ حدیث و مذامت کا عدم علم ہی تو رُوح کے حدوث کی سب سے زبردست اور مسکت دلیل ہے۔ خدامت کے لئے علم لازمی ہے۔ لیکن حدوث کے لئے لازمی نہیں۔ سوامی دیانند کا قول ملاحظہ ہو۔ جو اشیاء بدائی ہیں اُن کی صفات و فعل فطرت مدائی ہیں۔ اور غیڈامی جو ہروں کے غیر مدائی ہوتے ہیں۔ سو ستیارتھ پر کاش ہے۔ صفحہ ۸۱۔ پس اگر رُوح انادی (قدیم) ہے تو اس کا علم و گیان بھی مدائی ہونا چاہئے اور ازیں جہت اُس کو اپنی قدامت کا بھی علم ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ لہذا رُوح قدیم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حادث اور مخلوق وجود ہے۔

۲۔ رُوح کے تمام علوم و افعال تحصیل (اکتسابی) محدود و تنہا ہی ہیں۔ تو رُوح محل حوادث ہو کر خود حادث ٹھہری۔

۳۔ اگر کہا جائے کہ مرض نسیان یا جوں ہونے پر طفیلی کے حالات یاد نہیں رہتے۔ یا یہ کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس نے گذشتہ سال ماہ مارچ کی دس تاریخ کے ساڑھے دس بجے کیا کیا تھا وغیرہ۔ تو اول تو ان دلائل سے خود دیانند صاحب کا مندرجہ بالا قائم کردہ معیار قدامت ٹوٹ جاتا ہے۔ اور دوم یہ کہ ہم تفصیلی علم نہیں بلکہ اجمالی علم کا تقاضا کرتے ہیں۔ رُوح کو اپنی قدامت یا کم از کم کسی گذشتہ جنم کا اجمالی علم تو ضرور ہونا چاہئے۔ اگر ماں کے رحم میں بچے کو گیان نہیں ہوتا تو اُس وقت رُوح کا تعطل اور بے صفات ہونا ثابت ہے۔ حالانکہ مدائی اشیاء کے صفات و فعل و فطرت بھی مدائی مسلم ہیں۔ اب ذرا انصاف سے کہئے کہ حدوث رُوح میں کیا کسر رہی؟

۴۔ رُوح کی تمام معلومات اکتسابی اور تحصیل ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی بلا اکتساب علم عالم ہو جائے۔ ہم اس مکتب فطرت میں رُوح کو بتدریج علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اُس کا عل لدنی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اگر وہ قدیم ہوتی تو اُس کا علم ضرور لدنی ہوتا۔ اور علم لدنی کی رو سے جو معلومات

ایک رُوح کی ہوتیں وہی فطرتی دلدلی طور پر تمام ارواح انسانی کی ہوتیں۔ لیکن سب کے خیالات و آراء میں مختلف حقائق کے متعلق اختلاف بدیہی ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ رُوح کا علم لدنی نہیں اور ازیں جہت وہ قدیم بھی نہیں بلکہ حادث و مخلوق ہے۔

## رُوح مخلوق و حادث

رُوح کے وجود کے متعلق آخری صحیح عقیدہ کی آئینہ دار بائبل مقدس ہے۔ اور یہ عقیدہ مندرجہ بالا دو عقائد کے بین بین رہتا ہے۔ اگر رُوح کو مرگب امتزاجی ماننے ہیں تفریط ہے تو اُس کو قدیم اور قائم ماند ماننے اس افراط ہے۔ اور افراط تفریط معیوب ہے۔ مسیحیت رُوح کو اُس کے اصل منصب ہے نہ تو گراتی ہے۔ اور نہ اُس کے جائز درجہ سے اُس کو بلند کرنی ہے۔ بلند ہمارے مسلمات کے مطابق رُوح مخلوق و حادث وجود ہے۔ اس لئے کہ میرے حضور رُوح اور جانیں جو میں نے پیدا کی ہیں بیتاب ہو جاتی ہیں۔ (یسعیاہ ۵۷: ۱۶) اور پھر خُدا کو ارواح کا خالق (پیدا کرنے والا) ہونے کی حیثیت سے رُوحوں کا باپ کہا گیا ہے۔ (عبرانی ۱۲: ۹) اور جیسے وہ خالق ہونے کی جہت سے تمام مصنوعات سفلیہ و علویہ اور مرئیہ و غیر مرئیہ کا مالک ہے ویسے ہی وہ آرواح کا بھی مالک ہے۔ خُداوند سارے بشر کی رُوحوں کا خُدا (گنتی ۱۶: ۲۲؛ ۲۴: ۱۶) اور رُوح صرف انسان میں ہے۔ لیکن انسان میں رُوح ہے (ایوب ۳۲: ۸)۔ حیوانات میں رُوح موجود نہیں ہے میصری تو انسان ہیں خُدا نہیں۔ اور اُن کے گھوڑے گوشت ہیں رُوح نہیں (یسعیاہ ۳۱: ۳)۔ حیوانات صرف جان اور جسم کا مجموعہ ہیں۔ اور انسان کا امتیاز حیوان سے اس طرح ظاہر ہے کہ اُس میں جان و بدن کے علاوہ رُوح بھی موجود ہے (۱۔ تھسلینکوں ۵: ۲۳)۔

جس طرح جسم سے جسم پیدا ہوتا ہے۔ اُس طرح رُوح سے رُوح پیدا ہوتا ہے۔ یعنی قانون ارثی کے مطابق بچے اپنے والدین سے پیدا کُش کے لحاظ سے جسم و رُوح دونوں حاصل کرتے ہیں۔ اور رُوح حادث ہے قدیم نہیں۔ یعنی ازلی تو نہیں بلکہ ابدی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بازتہ ابدی اور ہنفسہ غیر فانی ہے ہر گز نہیں۔ بلکہ اُس کو ابدیت اس صوت میں مانی جاسکتی ہے۔ کہ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اُسی طرح رُوح خُدا کے سہارے زندہ رہتی ہے جسم و رُوح کی جُدائی کا نام جسمانی موت ہے۔ اور رُوح سے جُدا ہو کر جسم تو فنا ہو جاتا ہے۔ مگر رُوح قائم رہتی ہے۔ اسی طرح رُوح اور خُدا کی جُدائی کا نام رُوحانی موت ہے۔ اسی کو مکاشفہ ۲۱: ۸ میں دوسری موت کہا گیا ہے۔ اور خُدا سے جُدا ہو کر رُوح فنا ہو جاتی ہے۔ مسیحی مسلمات کے مطابق ابدی ہلاکت سے یہی مراد ہے کہ مخالفین خُدا کی آرواح بیاعت تناقض و متخالف طبائع اُس سے جُدا ہونے کے باعث معدوم دفنا ہو جائیں گی۔ اسی طرح راستبازوں کی ارواح خُدا کے ساتھ مطابقت و مناسبت طبعی رکھنے کے باعث تابد زندہ رہیں گی۔ ملاحظہ ہو متی ۲۵: ۳۱-۳۱ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ادنیٰ وجود ہمیشہ اشرف وجود کے سہارے قائم و باقی رہتا ہے۔ ادنیٰ کے فساد فنا سے اشرف کی فنا لازمی نہیں۔ مثلاً پتے اور شاخیں اگر جڑ کے ساتھ قائم رہیں تو فنا نہیں ہوتے۔ اگر الگ ہو جائیں تو جڑ تو قائم رہے گی مگر پتے اور شاخیں فنا ہو جائیں گے۔ اسی طرح جڑ اگر زمین میں قائم رہے تو فنا سے محفوظ رہے گی۔ اور اگر الگ ہو جائی تو جڑ تو فنا ہو جائے گی مگر زمین قائم رہے گی۔ ایک اور مثال لیجئے۔ جسم کے تمام اعضاء میں دماغ سب سے اشرف مسلم ہے۔ اگر کسی کی ٹانگ بازو ناک وغیرہ کٹ جائیں یا آنکھیں جاتی رہیں یا دانت نکل جائیں تو بھی وہ زندہ رہے گا۔ اور ہزاروں لاکھوں لنگڑے لے لوے۔ کٹے اندھے لوگوں کا زندہ اور موجود ہونا بدیہی ہے۔ لیکن کبھی کسی نے کوئی ایسا انسان نہ دیکھا ہو گا کہ جس کا سر کٹ گیا ہو اور وہ بقید حیات ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اشرف کے فساد فنا سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ اسی طرح جسم کا وجود منحصر ہے۔ رُوح پر اور رُوح کا قیام خُدا پر

اس عام بحث سے نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ تبدل پذیر حقیقتیں لا تبدل وجود کے ساتھ متعلق ہونے سے لا تبدل اور غیر فانی ہو جاتی ہیں۔ توریت شہادت دیتی ہے کہ وادیتی سینا میں جب ایزد تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہمکلام ہوا تو اُس کا ظہور جھاڑی میں لگی ہوئی آگ کی صورت میں ہوا۔ اور لا تبدل وجود خدا تعالیٰ کی موجودگی کی تاثیر سے جھاڑی آگی سے جل نہیں گئی بلکہ قائم رہی۔ آری یہ لوگ اکثر یہ معارضہ پیش کیا کرتے ہیں کہ جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور مرے گا۔ اور جس کی ابتدا ہے اُس کی نیستی ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ از روئے منطق جس کی فنا نیستی ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ از روئے منطق جس کی فنا نیستی ضروری ہے۔ وہ ممنوع الوجود ہے نہ کہ ممکن الوجود واجب الوجود وہ ہے جس کا ہونا ضروری ہے۔ ممنوع الوجود وہ ہے جس کی نیستی (زہونا) ضروری ہے لیکن ممکن الوجود وہ ہے جس کا نہ عدم ضروری اور نہ وجود ضروری ہے پس ممکنات و محدثات اپنے وجود عدم کے بارہ میں ذات واجب کے محتاج ہیں۔ پس ارواح انسانی ممکن و حادثات اپنے وجود عدم کے بارہ میں ذات واجب کے محتاج ہیں۔ پس ارواح انسانی ممکن و حادثات اپنے وجود عدم کے محتاج ہیں۔ پس ارواح انسانی ممکن و حادثات اپنے وجود عدم کے محتاج ہیں۔ اگر وہ (خدا) انہیں قائم رکھنا چاہے تو وہ قائم رہتی ہیں۔ اور اگر مٹانا چاہے تو مٹ جاتی ہیں۔ خدا کی رُوح کی تاثیر ممکنات کو ابدیت میں قائم رکھ سکتی اور رکھتی ہے۔ اس کے متعلق کلام مقدس کی تائید بلا مقہ ہو۔ تیری نگہبانی نے میری رُوح سلامت رکھی (ایوب ۱۰: ۱۲)۔ اسی کے ہاتھ میں یہ جاندار کی جان اور کل بنی آدم کادم ہے (ایوب ۱۲: ۱۰) اگر وہ اپنی رُوح اور اپنے دم کو واپس لے لے تو تمام بشر اکٹھے فنا ہوا جائینگے (ایوب ۳۴: ۱۴-۱۵)۔ اور کوئی رُوح اپنی بقا میں مختار نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی مریضی کے زیر ہے۔ کسی آدمی کو رُوح پر اختیار نہیں کہ اُسے روک سکے اور مرنے کا دن بھی اُس کے اختیار سے باہر ہے۔ (واعظ ۸: ۸)۔ پھر رُوح کی غیر فانییت و ابدیت کے متعلق بھی ملاحظہ ہوتا اور خاک خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی اور رُوح خدا کے پاس جس نے اُسے دیا تھا واپس جائے (واعظ ۱۲: ۷)۔ اور جناب خداوند مسیح کے قول سے بھی ثابت ہے کہ رُوح حادث بحدوث بدن نہیں بلکہ غیر فانی و ابدی ہے جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو (متی ۱۰: ۲۸)۔ اور سلیمان نبی کا قول بھی دیکھو لیکن صادق مرنے پر بھی اُمید وار ہے (امثال ۱۴: ۳۲ ایوب ۱۰: ۲۶)۔ اگر رُوح کی طبیعت خدا کی طبیعت سے متضاد ہو تو خدا اُسے فنا کر سکتا ہے۔ بلکہ اسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ بلکہ اسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ متی ۱۰: ۲۸ ریکارڈنگ کمپنی ماہرین موسیقی کی آوازوں کو ریکارڈوں میں بند کر لیتی ہے۔ آواز غیر مادی شے ہے۔ اگر گویا مر بھی جائے تو بھی ریکارڈ میں اُس کی آواز باقی رہتی ہے لیکن آواز کو ریکارڈ میں بند رکھنا ریکارڈ ساز کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر چاہے تو اُس کو تادیر قائم رکھے اور چاہے تو ریکارڈ کو توڑ کر ایکدم معدوم کر دے۔ اور ریکارڈ وہی قائم رکھے جاتے ہیں جن میں بھرا ہوا راگ اصول موسیقی کے فنی نکتہ نگاہ سے درست ہو۔ ورنہ توڑ دئے جاتے ہیں۔ پس واجب تعالیٰ ازلی و ابدی ہے۔ رُوح ازلی نہیں پر صرف ابدی ہے۔ اور جسم نہ ازلی ہے نہ ابدی اور اجسام جو راستباز رُوحوں کو روز قیامت حاصل ہونگے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ سرشت میں تبدیل ہو کر غیر فانی ہو جائیں گے (۱۔ کرنھیوں ۱۵: ۵۲-۵۳)۔ اور خدا کے سامنے نیستی یا عدم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک سب زندہ ہیں (لوقا ۲۰: ۳۸)۔ اور ارواح و مادہ کی قدامت خدا کے خالق ہونے میں کوئی مددگار نہیں ہے۔ بلکہ وہ قادر مطلق اور ازلی و ابدی خدا ہے۔ جب اُس نے ایک زمانے میں کائنات کو پیدا کیا اور انسان کو خلاصہ کائنات بنایا تو کیا وجہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ نہ کر سکے۔ جس مادہ کو اُس نے پیدا کیا۔ اُس کو مٹانا اور قائم رکھنا اسی کے قبضہ اقتدار میں ہے۔ اُمید ہے کہ ناظرین رُوح کے متعلق اس بیان سے کافی فائدہ اٹھائیں گے۔

# تزکہ نفس و ریاضتِ بدنی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اشرف کے فساد سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے۔ جیسا ہم اوپر کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں۔ اور فطرت کی صدیاں شیاء غور و فکر کرنے سے اس امر کی صداقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ اسی طرح روح انسانی میں جو جسم کی بہ نسبت اشرف یہ اعلیٰ ہے بگاڑ پیدا ہونے سے جسم میں لازمی طور پر اُس سے متاثر ہو گیا۔ جب گناہ کے باعث انسان خُدا سے جدا ہو گیا۔ یعنی روحانی منزل اور موت کے ماتحت آ گیا تو جسم بھی موت و منزل سے مغلوب ہو گیا۔ اور اس طرح بنی نوع انسان پر موت نے تسلط جما لیا۔ اب اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس سے روح بحال ہو سکے۔ تو ضرور جسم بھی فنا کے قبضہ سے چھوٹ کو بقا کو حاصل کرے۔ اسی نکتہ پر پہنچ کر انسان میں بھگتی۔ ریاضت اور تپسیا کے خیالات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی رہبانیت نے ریاضت جسمانی کے خیالات کو حد سے زیادہ بڑھا دیا اگرچہ نفسانی خواہشات کو روئے اور دبانے سے روحانی زندگی میں ارتقاء کی کچھ شعاعیں پڑنے لگتی ہیں۔ اور نفس امارہ پر قابو پانے کی کوشش کرنا نیک زندگی گزارنے کے لئے کسی حد تک مفید بھی ہے۔ تاہم یہ سراسر غلط فہمی اور نادانی ہے کہ جسم کو بالکل حقیر اور ردی سمجھ کر اُس کی نشوونما اور پرورش کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لی جائیں۔ جس طرح قیمتی اشیاء کی حفاظت مکان کی چنگی پر منحصر ہے۔ اسی طرح روح کی حفاظت کے لئے جسم کی پرورش جو اُس کا ظرف ہے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ خُدا ادا انعام (جسم) کی بے قدری و حقارت ہوگی۔ اور خود کشی و ریاحیت بدنی ایک ہی مفہوم کے مصداق ہوں گے۔ واضح ہو کہ کھانا پینا اور پہننا کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نیکی ہے۔ کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائگا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان (روحانی نقصان) نہیں۔ اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں (۱۔ کرنتھیوں ۸: ۸) کھانے پیٹ کے لئے ہیں اور پیٹ کھانوں کے لئے۔ لیکن خُدا اس کو اور اُن کو نیست کرے گا (۱۔ کرنتھیوں ۶: ۱۳) کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے (رومیوں ۴: ۱۷) اگر کھانا پینا اور پہننا وغیرہ گناہ ہو تو اس گناہ کا باقی خُدا کو ماننا پڑے گا جس نے ہمیں جسم دیدیا۔ اور جسم بھی ایسا جو خوراک و پوشاک اور دیگر ضروریات کا محتاج ہے۔ جب خُدا رازق ہے اور اُس نے ہماری جسمانی خواہشات کا جواب بھی اسی فطرت کے اندر دیا ہے تو لازمی بات ہے کہ ہم روح کے ساتھ جسم کی بھی فکر رکھیں۔ لیکن امور معاشرت میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کرنا خلاف فطرت ہونے کے باعث جسمانی سز لازمی ٹھہراتا ہے۔ اگر بالکل نہ کھائیں تو موت یقینی ہے۔ اور اگر حد سے زیادہ کھائیں تو بھی اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودنے کا مقولہ درست ہے۔ امور معاشرت میں اعتدال مفید ہے اور تجاوز مضر پیٹ خُدا نے خالی رکھنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ اس لئے کہ اس میں کچھ ڈالا جائے۔ جسمانی زندگی اسی پر منحصر ہے۔ اگر جیب میں کچھ ڈالنا ہی نہ ہوتا تو اُس کا لگانا بلا مقصد ہوتا۔ اسی طرح جو اعضاء خُدا نے ہماری جسمانی ساخت میں بنائے ہیں وہ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ مٹانے کے لئے نہیں بلکہ قائم رکھنے کے لئے ہیں۔ (دیکھو توڑوں کی تمثیل متی ۲۵: ۱۴-۳۰)۔

اگر نفسیاتی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کا دماغ بمنزلہ ایک کپتان کے ہے۔ اور جسم کے تمام اعضاء سپاہی ہیں۔ پیٹ راشن کا گودام اور بھنڈاری ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کپتان کی طاقت کا تمام تر دار و مدار سپاہیوں کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اکیلا کپتان کبھی دشمن کی فوجوں کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سپاہیوں کے صنعت و قوت کا انحصار خوراک کی کمی و بیشی پر ہے۔ جس قدر اچھی اور کتنی خوراک کا ذخیرہ پیٹ کے گودام میں ہوگا۔ اور دل کے ذریعے سے دماغ اور دیگر اعضاء کو وہ خوراک بقدر ضرورت ملے گی۔ اسی قدر دماغ ان اعضاء سے بہترین خدمات لے سکیگا۔ جب اعضاء کی نشوونما

میں لاپرواہی و بے احتیاطی ہوگی اور اُن سے محنت زیادہ لپچائیگی تو ہستہ آہستی کمزور ہوتے جائیں گے۔ اور اُن کی کمزوری و ناتوانی سے دماغ بھی ضعیف و نحیف ہو کر بے کار ہو جائے گا۔ اور اس طرح سے جو بہترین خدمات اپنے اعضاء سے ہم مخلوقات خدا کی بجلا سکتے ہیں وہ انجام نہ پائیں گی۔ اور یوں انسانی زندگی ایک انتہائی خود غرضی کی زندگی بن جائے گی۔ اور خدا سے محبت کرنے کا پہلا زینہ ہے مخلوقات سے بھی محبت رکھنا ہے (۱۔ یوحنا: ۵) اور تارک الدنیا ہونے سے مخلوقات سے محبت و ہمدردی کے مواقع ہی نہیں ملتے۔ اس لئے ان ذرائع سے خدا کا وصال حاصل ہونا قطعی ناممکن و محال ہے۔ جو لوگ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی و محبت کے خیال کو ترک کر کے براہ راست خدا ہی سے ملاپ کرنا چاہتے ہیں وہ اولاد سے نفرت اور والد سے محبت رکھنے کو ممکن سمجھتے اور ایک کنارے کے سمندر کے قائل ہیں۔ جیسے ایک کنارے کے دریا کا وجود محال ہے۔ ویسے ہی مخلوقات کو چھوڑ کر خدا سے محبت رکھنا ناممکن ہے۔

کلام الہی کا یہ پیغام ہے کہ تم اہو یہ نفسانیہ اور اغشیہ جسمانیہ میں اپنے دلوں کو یہاں تک نہ الجھاؤ کہ خدا کی یاد ہی تمہارے دلوں سے بسر جائے۔ اور تم نرے نفسانی اور دُنیا پرست ہی ہو جاؤ۔ کلام کا فرمان ملاحظہ ہو۔ کیونکہ نہ ہم دُنیا میں کچھ لائے۔ اور نہ کچھ اُس میں سے لیا سکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے پینے کو ہے تو اسی پر قناعت کریں (۱۔ تیمتھیس ۷: ۶-۸ کلیسیوں ۳: ۲ متی ۶: ۳۳) دو کھیاں ہیں۔ ایک کھانڈ کے شیرہ پر میٹھتی ہے اور اُس میں ایسی پھنتی ہے کہ پھر زندہ باہر نہیں نکل سکتی۔ دوسری مکھی مصری کی ڈلی پر میٹھتی ہے اور کھا کر خوشی سے اڑ جاتی ہے۔ مز ا تو دونوں نے شیرینی کا لیا مگر ایک کا انجام ہلاکت اور دوسری کا زندگی اور خوشی ہو۔ اسی طرح لذت و حظا نفسانیہ کے پوجاری بن جانے سے خدا سے جدائی اور ہلاکت لازمی ہے۔ اور اشیائے جسمانیہ کو اپنے غلام بنا کر اُن سے خاطر خواہ کام لینا خوشی کا موجب ہے۔ امور معاشرت میں بھی افراط تفریط ہو جب ہلاکت ہے۔ ان نعمت ہائے گونا گوں کو ٹھکرا دینا کفران نعمت (۱۔ تیمتھیس ۴: ۱-۵)۔

اکثر سادھو اور تیاگی بیراگی لوگ حظا نظ جسمانیہ اور لذت نفسانیہ سے منہ موڑ کر تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔ اور ویرانوں میں جا کر اپنے جسموں کو نہایت بیدروانہ و جامانہ طریقوں سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں۔ قانون مرتے ہیں اُلٹے سر کے بل درخت پر لٹکتے۔ جل دھارے کرتے باہیں سکھا لیتے ہیں تاکہ اُن کی انانیت (خودی) مٹ جائے۔ لیکن یہ کوئی خودی کشتی نہیں بلکہ خود کشتی ہے۔ ایسی کٹھن ریاضتوں کے باوجود وہ حقیقی خوشی اور سکون قلبی سے محروم رہتے ہیں۔ اسی واسطے مغربی رہبانیت اور ہندوستانی ریاضت جن میں حماقت ایک اُبھرا ہوا عنصر ہے مقبول عام نہ ہو سکے۔ اور مذہبی دُنیا میں اُن کی قدر و منزلت ان خیالات کے حامیوں کی توقعات کے خلاف ہوئی۔ اور اُن کی تقلید دیر پانہ رہی۔ ہندوستان کے توپتے پتے پر کرم مارگ، بھگتی مارگ، گیان مارگ نیستا آہسنا پر مودھر ما اور نروان وغیرہ لکھے ہوئے ہیں۔ اور مہا تمابدھ نے تو ان خیالات ہمہ گیر تھے۔ اور اب تک اُن کا بقیہ کم و بیش ہر حصہ دُنیا میں موجود ہے۔ پولوس رسول بدنی ریاضت کو غیر فطری ہونے کے باعث معیوب ٹھہراتا ہے۔ ملاحظہ کیونکہ جسمانی ریاضت کا فائدہ کم ہے لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے (۱۔ تیمتھیس ۴: ۵۸) (کلیسیوں ۲: ۲-۲۳) اگر ترک دنیا اور اس قسم کا تزکیہ نفس روحانی کمالیت کے حصول کے لئے ضروری شرط ہو تو ضرور ہے کہ تمام بنی نوع انسان آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں ڈیرے لگائیں۔ کیونکہ جو چیز بذریعہ ترک دنیا و ریاضت حاصل ہونے کی امید ہے اُس کی ضرورت سے کوئی خالی نہیں۔ پھر جنگلوں میں آباد ہونے سے آبادیاں جنگل ہو جائیں گی۔ اور جس دنیا کو ترک کیا وہی ساتھ جائے گی۔ اور اس طرح دُنیا کے تمام کارخانے بگڑ جائیں گے اور تمدن معاشرت کے عالم میں انقلاب کے طوفان برپا ہونے سے انسانی زندگی نہایت خطرناک ضلالت و گمراہی کے سمندر میں غرقاب ہو جائے گی۔ اور نہ مرض رہے نہ مریض کا مقولہ پورا ہو جائے گا۔

اگر جسمانی اعضاء اور نفسانی قوی کو مضحکہ وازکار رفتہ بنا کر اور بدی کے صدور کے امکان کو مٹا کر کوئی بدی سے بچنے اور نیک کردار ہونے کا دعویٰ دیا ہو تو یہ کوئی خوبی اور اخلاقی جرات کا کام نہیں ہے۔ بلکہ انتہائی بزدلی و خنک طبعی ہے۔ رابرٹسن کا قول کیرکٹریا سیر تکلی تعریف میں کیا خوب ہے کہ زبردست جذبات اور اُن پر زبردست قابو کا نام سیرت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جو گن چشتم بعلت مولودی ہو یہ دعویٰ کرے کہ میں اپنی تمام زندگی پھر کبھی بد نظری کا مرتکب نہیں ہوا تو کونسی خوبی ہے۔ اگر گونگا کہے کہ میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی یا کسی کی بد گوئی نہیں کی تو یہ کوئی قابل تحسین بات نہیں ہے۔ کوئی بلند مکان کی چھت پر کھڑا ہے اور نیچے زمین پر شیر موجود ہے۔ اگر وہ شخص اوپر ہی سے پکارے کہ دیکھو میری بہادری کہ میں شیر سے مطلق خوف نہیں کھاتا تو کون ہے جو اُس کے اس بزدلانہ و مضحکہ خیز دعویٰ پر نہ ہنسنے گا؟ ہندوستان میں تیاگی بیراگی لوگوں کا بھی یہی حال تھا اور ہے لق و دق صحرا میں ایک و تہارتے ہوئے اول تو اُن کا ماحول ہی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عملی بدی کا امکان ہی محال ہوتا ہے بد نظری کریں تو کس پر زنا کریں تو کس سے وہاں اُن کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

اسی طرح چوری جھوٹ اور عداوت وغیرہ کا بھی کوئی امکان وہاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں ایسے مواقع ہی ناپید ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اعضا ئے جسمانیہ کو معطل دے کار کرنے سے بھی نیت میں خواہشات بدکار یا ہلہا کرتا ہے۔ کیونکہ سانپ کے بل کو مارنے سے سانپ نہیں مرتا۔ اگرچہ عملی گناہوں کا موقع نہیں ملتا اور اُن کا امکان عارضی طور پر مٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن خبیالی گناہ سے رہائی محال ہے۔ جس طرح ایک کوڑھی والدین کا بچہ طبعی موروثی طور پر مبروص ہونے کے باعث دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھے جانے پر بھی بُرص کے جراثیم سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں اس مرض موزی کے جراثیم ضرور قائم رہیں گے۔ اسی طرح ارثی گناہ آلودہ طبیعت ترک دُنيا اور تزکیہ نفس سے بچال نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کے موروثی مرض ہونیکے شہادت کلام الہی یوں پیش کرتا ہے۔ دیکھ! میں نے صورت پکڑی اور میں گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا (زبور ۵۱: ۵، ۵۲: ۵) کیونکہ میں جانتا تھا کہ تو بالکل بے وفا ہے اور رحم ہی سے خطا کار کہلاتا ہے۔ (یسعیاہ ۴۸: ۴) اور نہ ہی سادھی لگانے اور محض ارادہ پر زور دینے سے گناہ سے رہائی ممکن ہے۔ کیونکہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا وہ کر لیتا ہوں (رومیوں ۷: ۸-۹) پس گناہ کا ازالہ انسانی تدابیر سے محال ہے۔ گناہ کی علت چونکہ بُری خواہش ہے اور وہ کسب بد سے پیشتر ہی موجود ہوتی (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵)۔ اور خواہش بد کوئی اکتسابی شے نہیں بلکہ طبعی موروثی ہے۔ اس لئے ریاضت وغیرہ سے اُس کا انسداد ازالہ تو تب ہی ممکن ہوتا اگر وہ کوئی تحصیل اور اکتسابی شے ہوتی۔ اس لئے مقدس پولوس فرماتا ہے۔ ان باتوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی عبادت اور خاکساری۔ اور جسمانی ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صورت تو ہے مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا (کلیسیوں ۲: ۲۳)۔

قدرت نے جو طاقتیں ہمارے اندر پیدا کر دی ہیں وہ بذاتہ بُری نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کو اچھا یا بُرا بنا دینا ہماری نیت کے حسن یا بُخ پر منحصر ہے۔ اور ان قابلیتوں کو مسلوب و بیکار کر دینا فطرت کے خلاف جہاد اور خُدا کی مرضی سے بغاوت ہے۔ اسی لئے پولوس رسول نے یہ جانتے ہوئے کہ غصہ ایک فطرتی جذبہ ہے اُس کے متعلق فرمایا کہ غصہ تو کرو مگر گناہ نہ کرو۔ سورج کے ڈوبنے تک تمہاری خفگی نہ رہے (افسیوں ۴: ۲۶)۔ ایک بزرگ جہاندیدہ کا قول ہے کہ وہ بوقوف ہے جسے کبھی غصہ نہیں آتا۔ اور وہ عقلمند ہے جو غصے کو آنے نہیں دیتا۔

مشہور یونانی حکیم سقراط کی بیوی نہایت بد مزاج اور زور رنج تھی۔ ایک دن اُس نے سقراط کو ایک معاملہ پر بہت سخت سست کہا۔ مگر وہ اُس کی بے لگام زبان کی ہنگامہ خیز روانی کو دیکھ کر دروازے میں چپ چاپ جا بیٹھا۔ اُس کی اس خاموشی سے وہ اور بھی بھنائی۔ اور غصے سے برتنوں کا دھول اُس کے سر پر اُنڈیل دیا۔ سقراط نے غصہ کو روکتے ہوئے نہایت نرمی اور خندہ پیشانی سے فرمایا کہ اس قدر گرجنے کے بعد برسنا بھی ضروری تھا اور خُداوند مسیح

نے سب سے بڑھ کر انتقامی جذبات پر قابو پانے اور صبر و برداشت کرنے کی عملی مثال صلیب پر دشمنوں کے حق میں معافی و برکت مانگنے سے پیش کی (لوقا ۲۳: ۳۴)۔ پھر خداوند مسیح کی شمع محبت کے پروانے مقدس ستفنس نے بھی اپنے پیر طریقت کی طرح بوقت سنگسار ہونے کے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دعا مانگی کہ اے خداوند یہ گناہ ان کے ذمہ نہ لگا (اعمال ۷: ۶۰)۔ ان تمام امثلہ توضیحات سے منہائے مقصود اور خلاصہ المرام یہ ہے کہ فطرتی قوی اور پنچیرل جذبات و جبلت کو معطل کرنے کی بجائے اُن کو ایک منظم صورت میں بطریق احسن جائز استعمال لانا عین دانائی انسانیت اور خدا کی فرمانبرداری ہے۔ ہمارے نفسانی و بھی قوی جب بد کرداری و نفسانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اُن کی حالت کا خاکہ کچھ اس طرح پر ہوتا ہے۔ جیسے ایک گندی بدر و شہر سے تمام گندگی و غلاظت کو لیجا کر باہر ایک بسیط قطعہ اراضی کو دلدل اور تعفن کا مرکز بنا دیتی ہے۔ اور ہر کوئی اُس جگہ سے نفرت کرتا ہے اور کوئی بھی اُس کے پاس سے گذرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ خاکہ اُس وقت کا ہے جب ہمارے جذبات پر سفلی عنصر غالب ہوتا ہے۔ اب اس تصویر کا دوسرا رخ جو نہایت حسین اور دلکش ہلا حظہ ہو۔ ایک زیرک و دان آدمی اسی قابل صد نفرت و کراہیت قطعہ اراضی کو اس طرح پسند عام و خوشگوار بنا دیتا ہے۔ کہ اُس خط میں ایک خوشنما باغ لگا دیتا ہے۔ اور اُسی کھاد والے پانی سے اُسے سینچتا ہے۔ اب وہ زمین دیگر قطعات کی بہ نسبت زیادہ زرخیز ہونے کے باعث پودوں کو زیادہ خوراک دیتی ہے۔ اور وہی متعفن و غلیظ جگہ اہل شہر کی دلہستگیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ بھانت بھانت کے میووں کی کثرت فواروں کی سیم ریزی۔ شمیم گل کی عنبر بہتری ظہور کی نغمہ سنجیاں۔ باد نسیم کی نطق باریاں گلہائے دلکشائے رنگین مرتعے خوش بہار پھولوں کے جگمگے زائران و دلدارگان فطرت کی گلگت سے روضہ جنت کا دھوکہ پڑتا ہے اور وہی گھسنونی و مکروہ جگہ اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں میں کیف و اثرات لی ہوئے شائقین فطرت کے لطیف جذبات پر کھلیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی حال ہماری جسمانی قوتوں کا ہے۔ قدرت نے جس خاص مقصد کے ماتحت ان کو پیدا کیا ہے اُس سے تجاوز کرنا الٰہی سرتابی اور قانون قدرت کی خلاف ورزی ہے۔ ان طاقتوں کو معطل کرنا اُن کے مخصوص افعال سے باز رکھنا اور دباننا ایسا ہی مضرت رسا ہے جیسا کہ بدر و کو بند لگا دینے سے شہر میں غلاظت و گندگی کے جمع ہو جانے کے باعث مختلف امراض کے پھیلنے سے نقصان ہوتا ہے۔ ریاضت وغیرہ کے خیالات گناہ کے وجود اور اُس کے باعث انسان کی روحانی بے چینی اور اضطراب کے مظہر ہیں۔ اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے۔

ان انسانیت سوز طریقوں پر صدیوں عمل درآمد کرتے رہنے کے بعد بھی انسان حقیقی اطمینان قلبی اور سکون باطنی سے بے نصیب ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ مصائب جسمانی و آلام روحانی کے موجبات کا صحیح سراغ لگانے میں لوگ قاصر رہے۔ جب تک کسی مرض کی علت کا علم نہ ہو اُس کے نتائج سے بچنا ناممکن ہے۔ ہمیشہ سبب کی مدافعت سے نتیجہ کی مدافعت ہوا کرتی ہے۔ جس طرح ہم بارہا کر چکے ہیں کہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کی اصلاح ممکن ہے۔ نہ کہ اُس کے برعکس پس گناہ روح کو عارض ہے اور بطور نتیجہ اُس کے آثار جسم میں بھی ظاہر ہیں۔ روح اور جسم کا تعلق بطور مرکب کے سمجھیے۔ یا یوں کہیں کہ روح ہماری زندگی میں مثل ایک ہاتھ کے ہے۔ اور اعضائے جسم اُس کے ہتھیار بقول شخصے۔

جب تک ہے روح جسم میں چلتے ہیں دست دیا

دولہا کے دم کے ساتھ ساری برات ہے

جب روح پاکیزہ اور دل عارف کی طرح صاف اور گناہ کے رنگ سے منزہ و مبرہ ہوتی ہے تو ان ہتھیاروں کو نیک کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ اور جب وہ نفس امارہ کے دام تزویر میں مبتلا ہوتی ہے تو ان ہی ہتھیاروں کو بدی کی راہ میں استعمال کرتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کے پاس دو تلواریں ہیں۔ زید نے اپنی تلوار سے کسی بیگناہ کا سر قلم کر دیا۔ اور بکر نے اپنی تلوار سے ایک شیر کو مار کر چند راہگیروں کی جانیں بچا دیں۔ ہر دو صورتوں میں تلوار اچھی یا بری نہیں بلکہ تلوار کے استعمال کنندوں کی طبائع نیک یا بد ہیں۔ اسی طرح جو نیک یا بد افعال ہمارے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں وہ روح کی بد یا نیک خصلت کے

آئینہ دار ہیں۔ جب ہماری رُوح کا مطلع صاف نہیں ہوتا اور اُس پر گناہ کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں تو ان ہی اعضاء سے ہم بُرے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ ہاتھوں سے چوری حق تلفی ظلم اور خون ریزی زبان سے دروغ گوئی دروغ حلفی اور گالی و دشنام آنکھوں سے بد نظری فحش بازاری کُتب کا مطالعہ اور عیب بینی کانوں سے ہزلیات بد گوئی نماہی اور نفسانی جذبات کو برا بھونچنے کرنے والے قصے سُنا پسند کرتے ہیں۔ دماغ ہمیشہ بدی کے منصوبے باندھتا اور پاؤں ٹیڑھی روشیں اختیار کرتے ہیں۔ اور جب ہماری روحانیت پر آفتاب صداقت کی ضیا باریاں ہوتی اور رُوح آغوش محبوب کی طرح پاک و بے عیب ہوتی ہے۔ تو اسی دماغ سے جذبات سعیدہ اور خیالات پسندیدہ اُبلیے پڑتے ہیں۔ اور لطیف و سحر آگیزہ پاکیزہ تخیل خندہ سیال کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلتا ہے۔ زبان سے خُداے عزہ جل کی تعریف و توصیف کی خرماں موسیقی و کیف زاتر تم نکل کر لبوں پر کھلتا ہے۔ اور غمزہ و لہجے کے لئے تسلی سے بھرے ہوئے فقرے زبان سے نکلا کرتے ہیں۔ ہاتھ خیرات پر مستعد ہونے اور مریضوں کی مرہم پٹی و تمہاداری کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کان کلام الہی کی آواز پر جھکتے اور بد گوئی سننے سے نفرت کرتے ہیں۔ اور دل میں شکر گزاری محبت، نیکی، رحم، ہمدردی معافی اور خُدا پرستی کے جذبات و خیالات جوش مارنے میں۔ غیر ضیکہ روحانی کمالیت سے ہماری جسمانی زندگی بھی متاثر ہو کر روحانیت میں بیدیل ہو جاتی ہے اور انسان بالکل نیا مخلوق بن جاتا ہے۔ پر جس طرح لوہے کی دوکان پر سونا نہیں مل سکتا۔ اسی طرح بغیر خُداوند مسیح کے جو تمام جہان کے طبعیت روحانی ہیں رُوحانی کمالیت اور دلی صحت کا حاصل ہونا قطعی محال ہے شفا خانہ حیوانات میں صرف مویشیوں کا علاج ہوتا ہے انسانوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہمارے تمام جسمانی امراض و عوارض کا علاج معالجہ ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ لیکن روحانی مرض (گناہ) کے علاج کے لئے کوئی شفا خانہ دُنیا میں موجود نہیں ہے۔ مریض رُوحوں کو حکیم حاذق اور طبیب صادق خُداوند مسیح ہے۔ اُس پر ایمان لانے والے اور دلی توبہ سے اُس کے حضور جانے سے روحانی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ پس تمام ریاضت کرنے والے اور تھکے ماندے اور بوجھ سے دے ہوئے لوگوں کو اطمینان رُوحانی اور سکون قلبی دینے کے لئے خُداوند مسیح دعوت دیتا ہے (متی ۱۱: ۲۸: ۳۰)۔

## عقل اور مذاہب

### مذہب کی ضرورت

انسان فطری طور پر کمزور اور بیکس ہے۔ اور کسی ایسے دستگیر و حاجت روا قادر اور عظیم طاقت کے تحت ہو کر رہنا چاہتا ہے جو اُس کی مشکلات و مصائب کو حل اور حوائج و ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہر انسان اپنی طبعی کمزوری کے سبب ایک حاجت روا کی ضرورت کا قائل ہے۔ کوئی زبان سے لاکھ انکار کرے لیکن زبانی انکار اُس زبردست حقیقت کے وجدانی احساس کی تسکین کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اس عالم اسباب میں اُس فوق الفہم اور غیر مرئی ہستی کے ثبوت کے لئے سب سے بڑی عقلی دلیل استدلالِ اِنی ہے (یعنی مصنوع سے صانع کا تصور) اس سے آگے عقل طبعی کی رسائی محال ہے اور انسان محدود العلم اور قاصر العقل عقلی دلائل کے زینے لگا کر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح اس خارجی مادی عالم کے قوانین طبعیہ کے ساتھ اجسام مادیہ کثیفہ کی موافقت و مناسبت رہنے سے اجسام قائم اور زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح رُوح انسانی کے اُس عالم رُوحانی کے قوانین رُوحانیہ کے ساتھ تطابق و توافق

کے باعث رُوح انسانی صحت کی حالت میں برقرار رہتی ہے۔ اگر اجسام مادیہ کی عالم خارجی کے ساتھ مطابقت قائم نہ رہے۔ تو وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر رُوح انسانی کی اُس عالم رُوحانیہ لطیفہ کے ساتھ موافقت قائم نہ رہے تو وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ خُداے قدیر و حکیم نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے جس طرح ہماری جسمانی پرورش کے لئے اس مادی دنیا میں تمام ضروری اور اکتفا سامان مہیا کر دئے ہیں۔ اسی طرح ہماری رُوحانی پرورش کے لئے بھی اُس نے تمام ضروری سامان پیدا کر دئے ہیں۔ اور وہ سامان جو ہماری حوانج رُوحانیہ اور ضروریات اخلاقیہ کو پورا کرتا ہے اسی کا نام مذہب ہے۔ بعض لوگ جن کا رُوحانی معیار اور مذہبی نکتہ نظر بہت پست ہے خواہ مخواہ امور معاشرت اور چند ظاہری نشان وغیرہ رکھنے کو بھی مذہب کا جُز بنائے بیٹھے ہیں۔ معاشرت و سیاست تو جسمانی مذہب ہی کا جُز ہیں۔ رُوحانی مذہب میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مذہب کا تعلق صرف ہماری رُوحانی زندگی کے ساتھ ہے اور بس۔ پس ثابت ہوا کہ جس طرح جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے جسمانی اسباب کی ضرورت کا انکار ناممکن ہے۔ اسی طرح رُوحانی زندگی کے قیام و بقا کے لئے مذہب کی ضرورت کا انکار ناممکن ہے پس یہی مذہب کی ضرورت ہے۔

عدم مذہب سے انسانی زندگی میں بد اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جسم میں صحت مفقود اور علالت موجود ہو جاتی ہے۔ دیگر صورت میں جب ہم رُوحانی قوانین سے تجاوز کرتے ہیں تو ہماری رُوح صحت کی بجائے رُوحانی امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور رُوحانی مرض کا نام گناہ ہے۔ خُداوند کریم نے اپنی عنایت بے غایت سے ایسے سامان بھی فطرت میں پیدا کر دئے ہیں جن سے ان جسمانی امراض کی مدافعت ہو سکے۔ ہر مرض کے علاج کے لئے ہر نوع کی جڑی بوٹیاں اور ادویہ کارخانہ فطرت میں موجود ہیں۔ ہر مرض کی تشخیص اور علاج و معالجہ کی مفصل تشریحات کُتب طب میں موجود ہیں۔ اب جبکہ خُداے حکیم قدیر نے انسان کو جسمانی عوارخ سے نجات دلانے کے لئے اس قدر اعلیٰ سامان عطا کئے ہیں تو لازمی امر ہے کہ رُوحانی امراض (گناہ) کی مدافعت کے لئے نسبتاً اُن سے بھی اعلیٰ سامان عنایت کرے۔ چنانچہ رُوحانی طب کی کتاب بائبل مقدس ہے جس میں رُوحانی امراض کی تشخیص اور اُن (گناہوں) سے نجات حاصل کرنے کے نہایت تیر بہدف اور لاثانی نسخے مرقوم ہیں۔ جو کوئی مرض گناہ کے شافی و قطعی علاج کا خواہشمند ہو وہ بائبل مقدس کی طرف متوجہ ہو۔ پس مذہب کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ انسان کی رُوحانی فطرت کلمے فساد کو دور کر کے اُسے اُس کی اصلی فطرت یعنی پاکیزگی پر بحال کرے۔ اور جب تک خاطر و عارضی انسان خُدا کی طبیعت پر مطبوع نہ ہو جائے۔ یعنی گناہ سے قطعی مبرا نہ ہو جائے اُس کا خُداے پاک و قدوس کے ساتھ ملاپ ناممکن ہے۔ کیونکہ متضاد طبائع کا اجتماع محال ہے۔ مذہب کا دوسرا کام یہی ہے کہ وہ انسان کا خُدا تعالیٰ سے میل کروائے۔ گناہ اور اُس کے تمام بد نتائج سے رہائی۔ نیک اور پاک طبیعت کا حصول اور خُدا اور انسان کے مابین ملاپ پیدا کرنے اسی کا نام نجات یا مکتی ہے۔ لہذا مذہب کا کام یہی ہے کہ وہ انسان کو گناہ سے کامل نجات دلائے۔

## عقل کا کام

بعض مذاہب محض عقل کی محدود اور کمزور بنیاد پر قائم ہیں۔ اور مجر و عقل کی دوڑ دھوپ کے حاصلات کو مذہب حقہ قرار دے کر خُدا کی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اور بعض جو خُدا کی ہستی اور وجود کے قائل بھی ہیں تو وہ نیچر ہی کو خُدا سمجھے ہوئے ہیں اور خُدا کو غیر از فطرت یا فوق الفطرت ہستی تسلیم نہیں کرتے۔ ان دونوں سوالات کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو خُدا کوئی شے نہیں اور اگر وہ کچھ ہے تو یہ ثابت ہے کہ یا تو خُدا اسم بلا مسمیٰ اور قوت و اہمہ کی اختراع ہے اور یا خود خُدا ہے۔ مذہب جنسی اعلیٰ و ارفع برکت تو خُدا نے اس لئے بخش دی تھی کہ انسان اسکی پیروی میں اپنی روش کو درست

کرے۔ اور اُس کے سانچے میں ڈھل کے حقیقی روحانی اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن فی زمانہ زندہ دل لوگ اس کو اُلٹے معنوں میں لے رہے ہیں۔ مذہب کو اپنی تقلید پر چلا رہے ہیں۔ اور اپنی عقلی و دنیوی شائستگی کے سانچے میں اُس کو ڈھال کر اُس میں جدت طرازیوں کرتے ہیں۔ اور مذہب کو سائنس کی قیود میں ڈال کر تسخیر ہمزاد کی طرح اُس پر غالب آنا چاہتے ہیں۔۔۔ آریہ بھائی مذہب کو سائنس کے ماتحت کر کے ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھی ویدوں میں سے برآمد کر رہے ہیں۔ حالانکہ سائنس کا تعویذ اور ادویات و محسوسات سے ہے اور مذہب کا تعلق غیر مادی روحانی حقائق سے سائنس کا نکتہ خیال اور ہے اور مذہب کل سطح نظر اور سائنس اور اُس کے مادی مشاہدات و تجربات اور اُس کی دیگر معلومات۔۔۔ اس مادی وحادث خلقت کا بیان کرتی ہے اور مذہب اس خلقت کی مادی و غیر فانی حیثیت کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ مذہب کا تعلق طبیعیات کی زندگی سے نہیں۔ اس کے برعکس سائنس کا تعلق غیر مرئی۔ فوق الفہم اور لطیف روحانی حقائق سے نہیں ہے۔ دونوں کے مقاصد جدا۔ خیالات جدا۔ طریق کار مختلف اور نتائج مختلف ہیں۔ جس طرح علم النفس اور علم اقلیدس دونوں کے اغراض و مقاصد اور نکتہ ہائے نگاہ میں بعد المشرقین ہے۔ اسی طرح مذہب اور سائنس کے مقاصد و نکتہ ہائے نگاہ میں تفادیت ہے۔ واضح ہو کہ انسان کے گنہگار ہو کر فطرت کی طبعی مادی حقیقتوں کا علم نہیں کھویا تھا۔ اس واسطے مذہب کا یہ کام نہیں کہ اُس کا قدرتی اشیاء کی ماہیت سے تعارف کروائے۔ بلکہ گناہ کی تازگی نے اُس کی اصلی روحانی اور پاکیزہ فطرت اور خدائے تعالیٰ کی صحیح پہچان پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس واسطے مذہب صرف خدائے ساسی تک پہنچانے اور انسان کو اُس کی اصلی پاکیزہ فطرت کا تصور دلانے کا ضامن ہے۔ اور یہی اُس کا نفس مضمون ہے کشش ثقل کے قانون کی واقفیت انسان کے طبعی بگاڑ کو دور کر کے اُسے پاک درست نہیں بنا سکتی۔ پس سائنس کا دائرہ عمل اس خارجی مادی عالم کی طبعی حقیقتوں تک محدود ہے۔ اور سائنس کی حدود سے آگے مذہب کی عملداری ہے۔ وہ لامحدود، غیر مادی، غیر مرئی روحانی حقیقتوں کے علم و عرفان کا سرمایہ دار ہے۔ اگر مذہب کا کام صرف سائنس بیان کرنا ہو تا تو پھر مذہب کی عدم ضرورت ثابت ہے۔ کیونکہ سائنس کی تحقیقات کے نتائج مذہب سے حاصل نہیں ہوئے۔ بلکہ عقل انسانی کے محدود و غور و خور کا حاصل ہیں۔ یہ بھاری غلطی مدتوں سے اس واسطے پڑی ہوئی ہے کہ مجرد عقل پر بھروسہ کر کے اصولات عقلیہ اور اصولات دین و مذہب قرار دے کر انسان نے مذہب کو مجرد عقل کا مشغلہ اور دماغی ورزش کا تختہ مشق سمجھا ہوا ہے۔ عقل کا کام۔۔۔ یہ ہے کہ کسی شے کا امکان یا ضرورت ثابت کرے۔ اس سے آگے انسان کو۔۔۔ دو آمیز روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل صرف یہ حکم کرتی ہے کہ یہ کارخانہ حیات ایک نہایت اعلیٰ اور نے نظیر صنعت ہے۔ اور کوئی بڑے سے بڑا حکیم فلاسفر یا سائنس دان نیچر کی ادنیٰ سے ادنیٰ شے کا مثل بنا نہیں سکتا۔ اس سے آگے عقل یہ کہتی ہے کہ نیچر کی اس بے نظیر کل کے پرزوں کو حرکت دینے والا کوئی انجینئر بھی ایسا ہی بے مثل ہونا چاہئے۔ اور وہی انجینئر مصنوعات فطرت کا صانع بھی ہو گا لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی صانع یا کار یگر ہے۔ کیونکہ اگر ہے تو عقل کے پاس اُس کا کیا ثبوت ہے؟ عقل ایسے نادیدہ اور لطف و ادق وجود کا کوئی ثبوت جو قابل اشارہ حسی ہو دے نہیں سکتی۔ عقل کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہونا چاہئے نہ کہ ہے مثلاً ایک خوابیدہ شخص کے پاس سے ایک گدھا گزرتا اور غائب ہو جاتا ہے۔ اور بیدار ہونے پر وہ اُس کے آثارِ قدیم دیکھتا ہے۔ تو اُس کے دل میں فوراً دو خیال پیدا ہوتے ہیں۔ کہ یا تو کوئی گدھا یہاں سے گزر رہا ہے اور یا گھوڑی کا چچرا۔ کیونکہ ان دونوں کے پاؤں کی بناوٹ اور کمیت و کیفیت میں کچھ فرق و امتیاز نہیں ہے۔ اگر گدھے کے نقش قدم کہے تو اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کیونکہ گدھا وہاں موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی چچرے کے نقش پاء کہہ سکتا ہے کیونکہ یہ امر یقینی نہیں ہے۔ اور ہر دو کے سموں میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ وہ عقل اس معاملہ میں محض امکان ہی ثابت کر سکتی ہے نہ کہ حقیقت بلکہ مجرد عقل فطرت کے روزانہ صد ہا واقعات کے یقینی ثبوت کے لئے کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتی تو اُس فوق الفطرت اور بعید از فہم و ادراک صانع حقیقی و مالک تحقیقی کو کیسے ثابت کر سکتی ہے۔ اور غیر مرئی روحانی حقائق کی تفہیم و تعقیب میں کیسے کا میاب ہو سکتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر عقل طبعی کے پر جلتے ہیں اور وہ

معطل و حیران ہو جاتی ہے۔ کیا تو تلاش سے خدا کو پاسکتا ہے؟ کیا تو قادرِ مطلق کا بھید کمال کے ساتھ دریافت کر سکتا ہے (ایوب ۱۱: ۷)۔ خداوند خدائے آبدی و تمام زمین کا خالق تھکتا نہیں اور ماندہ نہیں ہوتا۔ اُس کی حکمت ادراک سے باہر ہے (یسعیاہ ۴۰: ۲۸)۔

## عقل کا دائرہ عمل

کولھو کے بیل کی نقل و حرکت ایک خاص دائرہ تک محدود ہوتی ہے اور وہ اُس مخصوصہ محیط سے باہر نہیں جاسکتا۔ وہی اُس کا دائرہ عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل کا دائرہ علم و ادراک محض محسوسات و مریات تک ہی محدود ہے۔ اور محسوسات و مادیات کے متعلق ہی عقل کے تجربات قابلِ تقسیم ہو سکتے ہیں۔ اور بدیہی حقائق کی تحقیق و تدقیق کے لئے عقل خالق نے اچھی رہنمائی بخش دی ہے۔ اور وہ محض ظاہری و باطنی حواسِ عشرہ کی مدد سے خارجی عالم کی طبعی حقیقتوں کی دریافت کر سکتی ہے۔ حواسِ خمسہ ظاہری یہ ہیں۔ حس مشترک، خیال، وہم، حافظہ، قوت متصرفہ، جس طرح ظاہری کی تمام قوتوں کی درہ التاج قوتِ باصرہ ہے۔ اسی طرح حواسِ باطنی میں قوت متصرفہ سب سے زیادہ کارآمد اور اعلیٰ ہے۔ بس عقل ان ہی حواسِ عشرہ کے کندھوں پر ہاتھ دھر کے چلنے والی ہے۔ اور اُن کی محتاج ہے۔ جس طرح ایک جنگی سپہ سالار کی کامرانی و نصرت کا تمام تر انحصار اچھی، قابل اور تربیت یافتہ پلٹن اور بہترین اسلحہ محاربہ پر ہوتا ہے۔ اور بغیر ان کے وہ معطل و بیکار ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل اعضائے جسمانیہ کی سپاہ اور حواسِ عشرہ کے ہتھیاروں کے بغیر محض کھمی اور ناکارہ ہے۔ مثلاً اگر آنکھ نہ ہوتی تو حروف ایجاد نہ ہوتے۔ کتابیں لکھی نہ جاتیں۔ پریس اور مطابع کی اختراع نہ ہوتی۔ فوٹو گرافی، فلم سازی، رنگریزی و رنگسازی، نقاشی و مصوری خیاطی، بخاری ہوائی جہاز، ریل گاڑی، اور دیگر ہر قسم کی مشینری کا وجود نہ ہوتا۔ علم النجوم، علم الاجسام، علم طب، علم جغرافیہ، علم تقلیدس اور خوردبین و دوربین وغیرہ ہر گز معرضِ ظہور میں نہ آتے۔ غیر ضیکہ انسان علم و فضل اور تہذیب و شائستگی سے قطعی بے بہرہ ہوتا۔ اور انسان و حیوان میں کوئی بالا امتیاز نہ رہتا۔ دیگر حواس پر آنکھ کو ہم نے اسی لئے فضیلت دی ہے کہ وہ عقل کے لئے سب سے زیادہ کارآمد آلہ ہے۔ اسی واسطے جناب خداوند مسیح نے کیا خوب فرمایا کہ بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا۔ اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی (متی ۶: ۲۲-۲۳)۔ لوقا ۱۱: ۳۳-۳۶)۔ پس ثابت ہوا کہ تمام عقلی کارنامے محض حواس کی موجودگی کی برکت ہیں۔ اور جہاں حواس کام نہ دیں وہاں عقل مجرد بیکار ثابت ہوتی ہے۔ لہذا روحانی و اخلاقی حقائق و دقایق جو کسی حس سے محسوس نہیں ہو سکتے اُن کی تفہیم و تعقیل عقل مجرد سے قطعی ناممکن ہے۔ اور عقلی و علمی کمالات سے روحانی و اخلاقی ترقی لازم نہیں آتی۔ جب تک اُس میں کوشش نہ کی جائے۔ جو شخص کمیٹری میں باہر اور یگانہ عصر ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اسی علم کی روشنی میں الہیات کا بھی عالم ہو۔ عقلی باتیں تو عقل دریافت کر سکتی ہے۔ لیکن فوق العقل حقائق کو کیسے جان سکتی ہے؟ آگ جلادیتی ہے برف ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ سورج سے روشنی اور حرارت صادر ہوتی ہے۔ ہوا اور پانی کے بغیر زندگی نہیں۔ سکھیا مہلک ہے۔ غسل شیریں ہے۔ جنظل تلخ ہے۔ جب الملوک دست آور شے ہے۔ دو متوازی خطوط کا اتصال محال ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو جڑ میں ہے وہ کل میں ہے وغیرہ یہ سب بدیہی حقیقتیں ہیں۔ ان پر اور ایسے ہی اور ہزاروں امور پر تمام افرادِ عالم من حیث الاجتماع اتفاق کلی رکھتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام حقائق تجاربِ مشہودہ پر مبنی اور حواس سے محسوس ہو سکتے اور بدیہی الظہور ہیں۔ لیکن طبعیات بدیہیات میں بھی بعض امور ایسے ہیں جن پر سب لوگ اتفاق نہیں رکھتے۔ مثلاً آریہ وغیرہ مادہ و ارواح انسانی کو قدیم مانتے ہیں۔ اور مسیحی و مسلمان اور دیگر بہت لوگ حادث مانتے ہیں۔ حالانکہ مادہ دیدنی کثیف

اور عقلیات حیات سے ہے۔ اور ہر انسانی اپنی رُوح کا کم و بیش وجدانی احساس رکھتا ہے۔ جب بدیہیات میں ایک عقل دوسری عقل کے مخالف ہے۔ اور عقلی نتائج میں بعد المشقین ہے۔ تو عقل روحانی اور غیر مرئی و غیر محسوس حقائق لطیفہ اور امور دقیقہ کی دریافت میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ اور رُوحانیت و مدہیات کے متعلق تضاد و تناقض فی العقول بدیہی ہے۔ عالم کا عدم سے بحکم الہی موجود ہو جانا۔ الہام معجزات، گناہ اور نجات، حیات بعد از ممات، وجود ملائکہ۔ قیامت، عدالت، ابدی سزا اور ابدی زندگی وجود ایزد تعالیٰ وغیرہ امور سب مزید بات و ایمانیات سے متعلق ہیں۔ اور سب فوق الفہم و العقل حقائق ہیں۔ اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ اور جب تک کوئی صداقت یا حقیقت اپنے علم کا موقع نہ دے عقل خود بخود اُس کا علم حاصل نہیں کر سکتی۔ پس عقل محدود ہے اور محدودات سے باہر اُس کی قوت پر بھروسہ رکھنا لا حاصل ہے۔

## ارتقاء عقل

ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس امر کو واضح کر دیا۔ کہ عقل انسانی محدود ہے اور وہ کسی حد کے اندر اندر رہ کر ہی اپنا کام کر سکتی ہے اور اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ درختوں کے اوپر بیجد خلاء موجود ہے۔ اُن کے آسمان تک بڑھ جانے میں کوئی شے مانع نہیں۔ تمام فضاء اُن کو آسمان تک بلند ہونے کے لئے دعوت دے رہی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ وہ اپنی مقررہ حدود تک ترقی کر لینے کے بعد رُک جاتے ہیں۔ اسی طرح طبقہ نباتات، حیوانات اور انسان کے قدم و قامت کے آسمان تک بڑھ جانے میں کوئی شے محدود مسد نہیں۔ جہاں تک وہ بڑھنا چاہیں بڑھیں۔ لیکن مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی شے ارتقائی لحاظ سے اپنی مقررہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ تو بھلا عقل انسانی اپنی حدود سے کیسے متجاوز ہو سکتی اور کس طرح امور رُوحانیہ اور حقائق لطیفہ وغیرہ محسوسہ کو جان سکتی ہے؟ خُدا نے ہر شے کے ساتھ عقل کی بھی حد ٹھہرائی ہے۔ تو نے اُس کی حدود کو مقرر کر دیا ہے جنہیں وہ پار نہیں کر سکتا (ایوب ۱۴: ۱۵)۔ تو نے حد باندھ دی تاکہ وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ (زبور ۱۰۴: ۱۹۹، ۹۶: ۹۶)۔ واضح ہو کہ گو خُدا نے عقل کو محدود بنایا ہے۔ لیکن جس طرح تمام اشیاء میں اُس قادر مطلق نے ارتقائی قوت فطری طور پر رکھ دی ہے۔ اور ہر شے ابتدائی و وسطیٰ اور انتہائی منازل ترقی کو بتدریج طے کرتی جاتی ہے۔ اسی طرح عقل انسانی کے لئے بھی میدان ترقی و سبج ہے۔ ایک بیج جو زمین میں بویا جاتا ہے وہ تہ خاک ہی میں پورا درخت نہیں بن جاتا۔ وہ خاک کے نیچے زیادہ سے زیادہ دو یا تین انچ لمبا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ارتقاء انتہائی کے تمام سامان زمین کے نیچے موجود ہیں ہوتے۔ پوری ترقی پودا زمین سے باہر نکل کر ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح انڈے کے اندر جو چوزہ ہے وہ اُس خول کے اندر بقدر گنجائش ہی بڑھ سکتا ہے۔ لیکن کمالیت اُس خول سے باہر نکل کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس بیان سے پودے اور چوزے میں کمالیت کی عدم استعداد مراد نہیں، بلکہ ارتقائی صلاحیت و استعداد تو ہوتی ہے پر زمین اور خول بیضہ اُن کی کمالیت کے محدود ہوتے ہیں۔ اور حصول کمال کے تمام و کمال سامان وہاں نہیں ملتے۔ اسی طرح رُوح انسانی اسی جسمی خول کے اندر رہتے ہوئے حصول بڑھ سکتی۔ اور رُوح کی قوت تعقل کو ترقی کے واقع نہیں ملتے۔ مقدس پولوس رسول نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ اب ہم کو آئینے میں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اُس وقت رُوبرو دیکھیں گے۔ اس وقت میرا علم ناقص ہے مگر اُس وقت ایسے پورے طور پر پہچانوں گا جیسے میں پہچانا گیا ہوں (۱۔ کرنتھیوں ۳۱: ۱۲)۔ کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوت ناقص ہے لیکن جب کامل آئے گا تو ناقص جاتا رہیگا (۱۔ کرنتھیوں ۱۳: ۹-۱۰)۔ ہماری عقل اس جس میں خول کے اندر رہ کر رُوحانی اور نادیدنی حقائق کو ایمان کی آنکھ سے دھندلا سا دیکھتی ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب عقل انسانی سے حجاب اُٹھ جائے گا اور اُس وقت وہ رُوحانی حقیقتوں کو رُوبرو دیکھے گی۔ رُوحانی ترقی اس جسم میں شروع ہو جاتی ہے اور بتدریج اس فانی جسم سے آزاد ہو کر وہ ترقی کمال

کو پہنچے گی۔ اور ہم اُس جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں (۱۔ کرنٹھیوں ۳: ۱۸) اور ہمارے عقلی و روحانی قوی بقدر متناہ ترقی کرتے کرتے لامحدود نہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ محدود شے ابد تک ترقی کرنے سے بھی لامحدود نہیں ہو سکتی۔

## عقل اور موالیدِ ثلاثہ

ماہرینِ طبیعیات تمام موجودات کو طبقاتِ ثلاثہ میں منقسم کرتے ہیں جمادات نباتات اور حیوانات اور انسان کو طبقہ حیوانات میں شامل کر کے اُسے حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔ ان ہر سہ طبقات میں خاصیات و صفات کے لحاظ سے خاص امتیازات نظر آتے ہیں۔ جو ایک طبقہ کو دوسرے سے اشرف یا ادنیٰ ٹھہراتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں فوتِ نامیہ مفقود ہے اور نباتات جسم نامی ہے۔ یعنی اُس میں نمو کی قوت موجود ہے۔ ازیں وجہ وہ جمادات سے اعلیٰ ہے۔ پھر نباتات میں حس، ارادہ اور حرکت معدوم ہے۔ لیکن حیوانات میں قوتِ نامیہ کے علاوہ حس، حرکت، ارادہ اور جان موجود ہے۔ حیواناتِ حلس، متحرک بالارادہ اور ذی جان ہیں۔ اور انسان و حیوان میں وجہ امتیاز نفسِ ناطق ہے یعنی انسان ذی جان ہونے کے علاوہ ذی رُوح بھی ہے۔ اور اُس میں ادنیٰ طبقاتِ ثلاثہ کی حیثیت اُس کے اعلیٰ و افضل مدارج میں پائی جاتی ہیں۔

وہ پتھر لکڑی اور ہتھیار کے نقصان سے بھی واقف ہیں۔ پھر طبقہ حیوانات کو انسان کی نسبت بہت ہی تھوڑا علم ہے۔ گائے بھینس، بیل، گھوڑا، اُونٹ، بھیڑ، بکری، گدھا، کتا، طوطا، مرغی وغیرہ اپنے مالک کو خوب پہچانتے ہیں۔ اور غیر آدمی کو غیر سمجھتے ہیں۔ انسان کے غصہ اور نرمی و ہمدردی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ وہ انسان کی حقیقت کو ایسا نہیں جان سکتے جیسا انسان اُن کو جان سکتا ہے۔ انسان جمادات کو جانتا ہے۔ پتھر کو نلے، سونا، چاندی، اور دیگر دھاتوں کے خواص و فوائد سے بخوبی واقف ہے۔ علم طب میں ہر نوع کی جڑی بوٹیوں اور پھولوں پھلوں کی تشریحات موجود ہیں۔ ان کے فوائد اور نقصانات سے کامل واقفیت رکھتا ہے۔ حیوانات کا پورا علم رکھتا ہے۔ علم الا جسام، علم خواص الاشیاء، علم الانوار، علم النفس طب اور صد ہا علوم و فنون جو انسانی تحقیقات کا ماحصل ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ کہ انسان ہر سہ ادنیٰ طبقات کا علم کامل اور یقینی رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ادنیٰ طبقات کو انسان کچھ علم نہیں ہے۔ پھر طبقہ انسانی میں بھی عقلاء و جملاء کی تفریق ہے۔ جو کچھ حکماء و عقلا طبقہ جملاء کے متعلق علم رکھتے ہیں وہ جملاء کی تفریق ہے۔ جو کچھ حکماء و عقلا طبقہ جملاء کے متعلق علم رکھتے ہیں وہ جملاء اُن کے متعلق نہیں رکھتے۔ بچے والدین کی نسبت اُس قدر علم نہیں رکھتے جس قدر والدین بچوں کی نسبت۔ اسی طرح انسانِ صنعی البیان اور ناقص العقل و محدود العلم کی ہستی جس قدر مذکورہ بالا تین طبقوں سے اعلیٰ ہے اسی قدر بلکہ اُس سے بھی لاکھ درجہ خدائے تعالیٰ بے حدود بے عد کے بالمقابل ادنیٰ ہے۔ تو بھلا انسانی عقل کی کیا مجال ہے کہ وہ طبقہ الہی اور حقائقِ روحانی و دقائقِ فوق الفہم کی حیثیت ادراک میں لاسکے۔ عقل انسانی محض من حیث الآثار ہی طبقہ الہی اور وجودِ لامتناہی کا کچھ تصور کر سکتی ہے۔ جس طرح حیوانات کا علم انسان کے متعلق بہت ہی معمولی اور ناقص ہے۔ اسی قدر بلکہ اُس سے بھی بدرجہا کم انسان اپنی عقلِ مستنابیہ و فہمِ محدود سے حقائقِ قدسیہ الہیہ کی تفہیم کر سکتا ہے۔ اور بطور استدلال انی معلول سے علت اور مصنوع سے صانع کا تصور کر سکتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ خدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔ (اور وہ بھی) اس لئے کہ خدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ کیونکہ اُس کی آن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دُنیا کی پیدائش کے وقت

سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں۔ (رومیوں ۱: ۱۹-۲۰) مشاہدہ فطرت سے خُدا کا صرف مثالی علم ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی حقیقت کا یقینی علم محال ہے۔ اگر کائنات کے صرف مشاہدہ ہی سے خالق کا یقینی اور صحیح علم حاصل ہونا ممکن ہوتا۔ تو دُنیا میں اُس کی ہستی اور ماہیت کے متعلق خیالات و آراء میں منافقت نہ مخالفت نہ ہوتی۔ پس انسان مجوب الفہم من حیث العقل حقائق الہی اور وجود لامتناہی کے صحیح تصور میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ واہ! خُدا کی ذات اور حکمت اور علم کیا ہی عمیق ہے۔ اُس کے فیصلے کس قدر ادراک سے پرے اور اُس کی راہیں کیا ہی بے نشان ہیں۔ خُداوند کی عقل کو کس نے جانا۔ یا کون اُس کا صلاح کار ہوا؟ (رومیوں ۱۱: ۳۳-۳۴)۔

## عقل کی عدم صحت

واضح ہو کہ عقل طبعی کی کارگزاری کے نتائج عالم میں مختلف ہیں جس سے عقل ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہے۔ اسی عقل نے ہزاروں لوگوں کی رہنمائی کی اور وہ خُدا کی ہستی سے منکر ہو گئے اور عقل کفر و لجاج کی موید دہانی ٹھہری۔ اسی عقل کی رہنمائی میں لاکھوں انسان بتوں کو خُدا سمجھنے لگے۔ اسی عقل کی روشنی میں بیچار لوگ بُت پرستی پر آمادہ ہو گئے۔ اسی عقل نے لاکھوں انسانوں کو گمراہ کر دیا۔ اور وہ گور پرستی، پیر پرستی، لنگ پرستی، مردم پرستی، عناصر پرستی، فطرت پرستی اور تناسخ جیسے غیر معقول و مجہول عقائد پر ضمیر فروشی کرنے لگے۔ اسی عقل نے ہدایت کی اور آریہ لوگ مادہ و ارواح کو قدیم ماننے لگے۔ اسی عقل نے ہدایت کی اور آریہ لوگ مادہ و ارواح کو قدیم ماننے لگے۔ اسی عقل کے اشاروں پر مسیحی و محمدی مادہ و ارواح کی ازلیت و قدمیت کی تردید و تکذیب پر جھکے۔ غرضیکہ آج تک تفادت فی العقول بدیہی طور پر ظاہر و باہر ہے۔ آخر یہ تمام عقائد یا عقل کے تمام نتائج تو صحیح نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ پانچ اور پانچ نو ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے گیارہ تیسرا کہتا ہے سات اور چوتھا کہا پانچ نو ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے گیارہ تیسرا کہتا ہے سات اور چوتھا کہتا ہے دس، آخر ان چاروں کے جواب تو صحیح نہ ہوں گے۔ ایک ہی جواب درست ہو سکتا ہے۔ جب خُدا واحد و برحق ہے۔ اور تمام عقلیں بھی صحیح ہیں۔ تو مختلف عقائد اور متضاد خیالات کے وجود کے کیا معنی؟ ایک ہی خُدا اتنے متضاد و متناقض عقائد کا بانی نہیں ہو سکتا۔ پس انسانی عقلوں میں اختلاف و تناقض کی وجہ اُن کی عدم صحت ہے اور عدم صحت کا موجب گناہ۔ اس لئے موضوعات عقلیہ کو کوئی حقیقی والہی مذہب قرار دینا سراسر جہالت اور کج فہمی ہے۔ عقل کے تمام پُرزوں پر گناہ کا زنگ لگ گیا ہے۔ اس لئے اُس کی رفتار میں فرق ہے۔ اور اُن آدمیوں میں رد و بدل پیدا ہوتا ہے جن کی عقل بگڑ گئی ہے۔ اور وہ حق سے محروم ہیں۔ (۱- تمتھیس ۶: ۵)۔ کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہو گئی ہے۔ (افسیوں ۴: ۱۸)۔ یہ ایسے آدمی ہیں جن کی عقل بگڑی ہوئی ہے اور وہ ایمان کے اعتبار سے نامقبول ہیں (۲- تمتھیس ۳: ۸) جن کی عقلوں کو اس جہان کے خُدا (یعنی ابلیس) نے اندھا کر دیا ہے۔ (۲- کرنتھیوں ۴: ۴)۔

میرا مطلب عقل کی عدم صحت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گناہ کے باعث عقل کی قوتیں زاہ ہو گئی ہیں یا معدوم و ناپیدا نہیں ہو گئیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصلی حالت پر نہ رہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے میز پر دس گھڑیاں رکھی جائیں جو بخوبی چل رہی

ہیں۔ بظاہر صاف اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب اُن میں وقت دیکھا جاتا ہے۔ تو سب میں دس دس، پندرہ پندرہ اور بیس بیس منٹ کا فرق ہے تو آخر کس بناء اُن کی رفتار پر صحت کا حکم لگایا جائے؟ گھڑیاں ثابت ہیں، پُرزے قائم ہیں۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں حرکت کر رہی ہیں۔ مگر سب کے اوقات میں مطابقت و یکسانیت نہیں۔ اسی سے اُن کی عدم صحت ثابت ہوگی۔ یہی حالت جمیع عقول انسانی کی ہے۔ اس واسطے مجرد عقل کے نتائج و حاصلات کو کسی مذہب کا صحیح قرار دینا ضلالت و گمراہی کو خوش آمدید کہنا ہے۔ عقل کی مذکورہ بالا حالت پر غور کرتے ہوئے ہمیں عقلی و نقلی طور پر عقل کی دو حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی۔

## اول۔ پہلی حالت عقل کی وہ تھی جبکہ وہ کمالیت، صحت اور پاکیزگی کی حالت میں خالق کے ہاتھ سے نکلی۔ اس کے

متعلق کلام اللہ کی شہادت یہ ہے اور خُدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (پیدائش ۱: ۲۷)۔ یہاں خُدا کی صورت سے وجہ اللہ مراد نہیں ہے بلکہ اس صورت سے مراد رُوحانی صورت ہے۔ اکثر خمیس الطبع لوگ نادانی سے یہ سوال کیا کرتے ہیں۔ کہ چونکہ انسان خُدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اور وہ جسم و اعضاء رکھتا ہے۔ لہذا انسان کی طرح خُدا بھی جسم و اعضاء رکھتا ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اُن کے اس نامعقول معارضہ کا مدلل جواب لکھا جائے۔ اور گمراہوں کو راہ دکھائی جائے۔ جو لوگ علم تشبیہ و استعارہ سے واقف ہیں وہ ایسا پودا اعتراض نہیں کر سکتے۔ واضح ہو کہ ہر جگہ لفظی معنی لینا جائز نہیں۔ اور بالخصوص صحائف مطہرہ کی عبارات کے سمجھنے میں زیادہ احتیاط برتنا چاہئے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ یہ نسخہ، تیلی پر سوسوں جمانے والا ہے تو اس سے لفظی معنی مراد نہ ہوں گے بلکہ محض دوا کی زور اثر ہی مراد ہوگی اور داود ہوگی اور داود نبی خُدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ مجھے اپنے پروں کے سایہ میں چھپالے (زبور ۱۷: ۸)۔ تو کیا اس سے خُدا کو پرندہ سمجھا جائے گا؟ ہر گز نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ آئے خُدا مجھے اپنی پناہ و حفاظت میں رکھ۔ خُدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس آیت میں انسان مشبہ حتیٰ ہے۔ خُدا مشبہ بہ عقلی اور وجہ شبہ مرکب عقلی ہے۔ جب مشبہ حسی اور مشبہ دونوں حسی ہوں تو یہ سوال جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن آیت زیر بحث میں تشبیہ تمثیل ہے۔ اور تشبیہ تمثیل میں وجہ شبہ مرکب حسی نہیں ہوا کرتی بلکہ مرکب عقلی ہوتی ہے۔ اور خُدا کے ساتھ انسان کا یہ اشتراک صفائی تشبیہ ہے۔ عین مطابقتی نہیں۔ اور خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خُدا پاک و فاعل مختار ذی عقل اور صاحب ارادہ ہے۔ اسی طرح اُس نے انسان کو بھی ان صفات سے متصف فرمایا۔ خُدا کی صورت کے معنی ملاحظہ ہوں (افسیوں ۴: ۲۴، کلیسیوں ۳: ۱۰) عقلی طور پر یہ حقیقت اس لحاظ سے درست ہے کہ اگر خُدا نے انسان کو پاک اور کامل نہیں بنایا تھا تو اُس کا گناہ میں گرنا خُدا سے انحراف و بغاوت نہیں۔ نہ ہی الٰہی سرتابی ہے اور خُدا نے اُس سے نیکی پاکیزگی اور اپنی متابعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ دوم خُداے پاک و قدوس سے ناپاک طبیعت کے معلول کا اصدار محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خُدا نے انسان کو پاک و راست بنایا تھا۔ یہ انسانی رُوح اور عقل کی حالت اولہ تھی (واعظ ۷: ۲۹)۔

## دوم۔ اور عقل کی حالت ثانیہ موجود متنزل اور بگڑی ہوئی حالت ہے۔ اُن کی عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہیں (۱)۔

طیطس ۱: ۱۵۔ ۲ تیمتھس ۳: ۸) قتل کے اسی لحاظ و متنزل کے باعث پولوس رسول فرماتا ہے۔ مگر نفسانی آدمی خُدا کے رُوح کی

باتیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اُس کے نزدیک بیوقوفی کی باتیں ہیں اور نہ وہ انہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ روحانی طور پر رکھی جاتی ہیں (۱۔ کرنٹیوں ۲: ۱۴)۔ خُداوند یسوع مسیح نے جو مسرف بیٹے کی تمثیل (لوقا ۱۵: ۱۱-۲۳) میں فرمایا ہے وہ انسان کی اسی دو قسم کی حالت کا مکمل فوٹو ہے۔ مسرف بیٹے کی پہلی حالت جبکہ وہ باپ سے رخصت ہوا بہت دولت مند اور خوشحالی و خوشی کی تھی۔ اور دوسری حالت انتہائی تنگدستی۔ ناداری اور کس مپرسی کی تھی۔ چنانچہ رُوح و عقل انسانی کی موجودہ حالت مسرف بیٹے کی حالتِ ثانیہ کے مطابق ہے۔ اب خُدا جو رحیم و کریم اور سرچشمہ محبت ہے کبھی ہو نہیں سکتا کہ انسان کو ابد تک اس عقلی و روحانی گمراہی میں رہنے دے۔ اور ہم یہ بھی خوب جان گئے کہ محض عقل سے اور وہ بھی مریض و متزلزل عقل سے خُدا کے قادرِ مطلق کو جان نہیں سکتے۔ کیونکہ عقل کے بازو ہم نے صدیوں آزمادیکھے۔ اب عقلی مذاہب کے دعوے دار اور عقل کے شیدائی جو اُس کو اُس کے اصل مرتبہ سے بہت زیادہ بلند کر کے دکھاتے ہیں خوب غور کر لیں کہ عقل طبعی کس قدر قابلیت کی سرمایہ دار ہے۔ اور اُس کو اُس ک جائز درجہ سے بڑھ کر سمجھنا کس قدر کو ر اعتقادی، خوش فہمی اور حقیقت سے روگردانی ہے۔ اب آخری ممکن اور صحیح صورت ہی ہو سکتی ہے کہ خُدا نے تعالیٰ خود اپنا علم و عرفان انسان کو عطا فرمائے۔ اور کسی طرح سے اپنی ذات و صفات اور مرضی کو اُس پر ظاہر کرے۔ تاکہ انسان عقل کو لے پیچھے لگ کر گمراہی سے گمراہی کی طرف نہ بڑھتا چلا جائے۔ اگلے باب میں ہم خُدا کے اسی ذریعہ و وسیلہ کا بیان کریں گے جس کی وساطت سے ہم خُدا شناسی تک پہنچ سکتے ہیں۔

## الہام کی ضرورت

جب رُوح انسانی پر انحطاط و تنزل نے قبضہ جمالیا اور اُس کا وہ نور بصیرت جو خُدا نے اُسے بخش دیا تھا گناہ کی تاریکیوں میں بالکل مدھم پڑ گیا۔ اور چشم بصیرت پر معصیت کا پردہ سا چھا گیا۔ تو اُس نے گناہ کی تیرگی میں ادھر ادھر پاؤں مارنے شروع کئے۔ اور اس ظلمت میں جو بھی پگڈنڈی اُسے سو جھی بس اُسی کو تھام لیا جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مگر راہِ حق کے حصول میں ناکام رہی۔ عقل کی اس لاچاری اور بے بسی کی حالت میں خالق نے الہام کی مشعل سے صراطِ مستقیم کی طرف اُس کی رہنمائی و ہدایت فرمائی۔ جس مدعا و مقصد کے حصول میں عقلِ انسانی ناکام رہی۔ وہ خُدا نے الہام کی وساطت سے عطا فرمایا۔ گویا اُس فوق الفہم وادرا ہستی نے انسان سو والفہم و فاسد العقل اور محدود العلم پر خود اپنی ذات و صفات اور مرضی کا انکشاف فرمایا۔ کیونکہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔

## جوڑا اور ترقی

یہ بدیہ حقیقت ہے کہ فطرت کی کوئی شے بغیر جوڑے کے کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ ہر شے جوڑے کے ساتھ مل کر بڑھ سکتی ہے۔ ورنہ مجرد ہی رہتی ہے۔ نباتات حیوانات اور انسان میں جوڑے کا وجود ترقی کی شرط ہے۔ چنانچہ موجودات کی ہر ہر جنس میں مذکورہ مونٹ اور نزد مادہ کا وجود اس صداقت پر دال ہے۔ آنکھوں کا جوڑا آفتاب ہے۔ اگر آفتاب نہ ہو تو ہم کچھ بھی دیکھ

نہ سکیں۔ کان جوڑا ہوا ہے۔ اگر ہوا نہ ہو تو ہم کوئی آواز بھی سن نہ سکیں۔ بیج کا جوڑا زمین ہے۔ اگر ایک بیج کو دس سال تک کسی ڈبی میں بند کر رکھیں تو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ لیکن زمین میں بونے سے تیسرے دن اگ آتا اور بدرتج کمال کو پہنچتا ہے۔ اور ایک دانے کے درجنوں دانے ہو جاتے ہیں۔ برقی تار کے دوسرے ہوتے ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ اگر ان دونوں کو باہم ملایا نہ جائے تو بجلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ملانے سے فوراً بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عقل مجرد کو لھو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اور اپنی مخصوص حدود سے باہر نہیں جاسکتی۔ پس عقل کا جوڑا الہام ہے۔ جب دونوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ تو تیسری شے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ خدا کی معرفت اور حقیقت کا علم ہے۔ موٹر صرف سمندر کے کنارے تک ہی پہنچا سکتی ہے۔ پار نہیں لے جاسکتی اور ممکن ہے کہ موٹر ڈرائیوٹ یہ سمجھے کہ سمندر کے پرے اور کوئی عالم نہیں۔ پس پانی ہی پانی ہے اور اسی طرح دیدانتی کی عقل بھی نیچر کے حالات موجودہ اور تجارب مشہورہ کی بنا پر کدے کہ اس عالم ناسوت سے پرے اور کوئی روحانی عالم نہیں اور خدا بھی کوئی غیر از نیچر شے نہیں۔ بلکہ جو کچھ نظر آتا ہے وہی ہے۔ لیکن سمندر کے پار جہاز لے جاتا ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ سمندر کے پار اور بھی دنیا ہی ہے۔ اور اُس کی یہ کیفیت ہے۔ جس طرح موٹر اور جہاز دونوں کے ذریعے سمندر پار کی دنیا کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی عقل والہام کے ذریعے عام ناسوت سے عالم لاہوت تک پہنچنا اور اُس سے کم و بیش واقفیت حاصل کرنا ممکن ہے۔ اگر انسان میں عقل نہ ہوتی تو الہام بے معنی ہوتا۔ اور اگر الہام نہ ہوتا تو عقل روحانی اور الٰہی حقائق کے علم سے قاصر رہتی۔ بہر حال دونوں کا وجود ترقی کے لئے ضروری ہے۔ جب انسان اپنی کمزور عقل اور محدود حواس سے خدائے بجد کی ہستی کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے میں قاصر اور مجبور ثابت ہو تو ایزد تعالیٰ نے اپنی ہستی اور عالم لاہوت کی کیفیت کو اپنی روح کے وسیلے بوساطت انبیاء مومنین کے خود اُس پر آشکارا فرمایا۔ جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں۔ نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خدائے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن ہم پر خدائے اُن کو روح کے وسیلے ظاہر کیا۔ کیونکہ روح (روح الٰہی) ساری باتیں بلکہ خدائے تہہ کی باتیں بھی دریافت کر لیتا ہے۔۔۔ اسی طرح خدائے روح کے سوا خدائے باتیں کوئی نہیں جانتا (۱۔ کرنتھیوں ۲: ۹-۱۱)۔

روح خود ہماری روح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے (رومیوں ۸: ۱۶) انسانی عقل گویا منفی اور الہام الٰہی (۲۔ تیمتھیس ۳: ۱۶-۱۷)۔ مثبت ہے جب ان دونوں کا ملاپ ہوا تو عقل انسانی میں نور آیا۔ اور الہام الٰہی وہ سلسلہ حقائق و دلائل لطیفہ روحانیہ اور نکات و معارف قدسیہ الٰہیہ ہے جس کے ذریعے خدائے تعالیٰ تدریجی طور پر حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح بنی نوع انسان پر اپنی مرضی و منشا کا اظہار و انکشاف بذریعہ انبیاء مومنین کے فرماتا ہے۔ اور خدائے روح منزل علیہ کے ذہن عقل کو مکاشفہ دینے سے پہلے اس قابل بنا لیتی ہے۔ کہ وہ پیغام الٰہی کو قبول کر کے اُس کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھے۔ کیونکہ نبوت کی کوئی بات آدمی کی خواہش سے کبھی نہیں ہوتی۔ بلکہ آدمی روح القدس کی تحریک کے سبب خدائے طرف سے بولتے تھے۔ (۲۔ پطرس ۱: ۲۱) اور عقل انسانی الہام الٰہی کے وصال سے لانا نہ تھا تو انیت کے عالم میں پہنچ جاتی ہے۔ اور معرفت الٰہی کے اسرار سر بستہ و رموز مخفیہ کو سمجھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

# عقل الہام کی متقاضی ہے

جس طرح امراض جسمانی و عوارض جسمانی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اُن کے متعلق ذاتی تجربہ رکھتا ہے اسی طرح عوارض روحانیہ بھی ہر شخص میں حقیقتاً اور بدیہی طور پر ظاہر ہیں۔ رُوح و جسم کے اجتماع کا نام انسان ہے۔ رُوح لطیف اور اشرف وجود ہے۔ اور جسم کثیف و ادنیٰ شے ہے۔ چنانچہ رُوح کے بگاڑ سے جسم کا بگاڑ لازم آیا۔ جب رُوح پر مرض گناہ نے ڈیرے ڈال لئے تو جسم پر بھی اُس کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور جسم بھی طرح طرح کے امراض میں پھنس کر قبضہ موت میں آگیا۔ اب یہ ہر دانشمند پر ظاہر ہے کہ امراض جسمانی کی مدافعت و ازالہ کے لئے خُدا نے حکیم و قدیر نے بیٹھا ادویہ۔ جڑی بوٹیاں وغیرہ پیدا کر دی ہیں۔ اور ماہرین طب اور حکما و اطباء نے اُن کے خواص و فوائد کی مفصل تشریحات کتب طب میں فرمادی ہیں۔ یہ خُدا تعالیٰ کا وہ بے نظیر انتظام ہے جس سے جسم کے تما امراض کی مدافعت اور جسمانی زندگی کے استحفاظ و اصلاح کے بارے میں اُس کی قدرت و حکمت ظاہر ہے۔ جس حال کہ انسان کی جسمانی زندگی کی صحت و قیام کے باب میں اُس نے اِس قدر سخاوت کے دریا بہادئے ہیں۔ تو بڑے افسوس اور حیرت کا مقام ہو اگر وہ انسان کی رُوحانی زندگی کی بہتری۔ اصلاح اور حفاظت کے باب میں بخل و اغماض سے کام لے۔ بلکہ جس طرح رُوح بہ نسبت جسم کے اعلیٰ اور انمول شے ہے اُسی طرح اُس کی صحت و بقا کے لئے فطرہ میں جسمانی اسباب کی بہ نسبت اعلیٰ رُوحانی اسباب و وسائل کا پیدا کرنا اور اعلیٰ قوانین کا نفاذ زیادہ ضروری و لازمی ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ خُداوند کریم نے ایسا ہی کیا اور رُوحانی امراض کی تشخیص و مدافعت کے لئے رُوحانی حکمت کی کتاب بھی نازل فرمائی۔ اور وہ کتاب بائبل مقدس ہے۔ ہر ایک صحیفہ جو خُدا کے الہام سے ہے تعلیم اور الزام اور اصلاح اور راست پازی میں تربیت کرنے کے لئے فائدہ مند بھی ہے۔ تاکہ مرد خُدا کامل ہے اور ہر ایک نیک کام کے لئے بالکل تیار ہو جائے (۱۔ تم تھیں ۳: ۱۶-۱۷)۔ کیونکہ جتنی باتیں پہلے لکھی گئیں وہ ہماری تعلیم کے لئے لکھی گئیں۔ تاکہ صبر سے اور کتاب مقدس کی تسلی سے اُمید رکھیں۔ (رومیوں ۱۵: ۴)۔

پس عقل کے اس واجبی تقاضا کو الہام ہی پورا کر سکتا ہے۔ اگر رُوحانی طب کی کتاب (الہام) اور رُوحانی اصلاح کے اسباب خُداوند کریم اس دُنیا میں ہمیں نہ بخشتا اور صرف جسمانی اسباب ہی کے دینے پر اکتفا کرتا تو اُس کی قدرت و حکمت پر دھبہ آتا تھا۔ لیکن اُس نے دونو قسم کے انتظام کر کے ہمارے لئے عذر کی کوئی وجہ نہیں چھوڑی۔

## الہام اور باطنی شریعت

انسان فطرتاً عقلی اور اخلاقی وجود ہے اور خُدا نے اُسے اپنی صورت پر پاک و راست صاحب ارادہ۔ اور فاعل مختار بنایا۔ اور اپنی مرضی کا اظہار اُس پر فرمایا۔ یعنی اخلاقی شریعت اُس کو بخشی۔ وہ شریعت کسی ظاہری و تحریری صورت میں نہ تھی۔ بلکہ انسان کی عقل و ضمیر پر مرتسم کی گئی تھی۔ جب انسان نے وہ باطنی اخلاقی شریعت کھودی۔ اور گناہ کی تاریکی میں وہ انمول و بیش بہا شے گم ہوگئی۔ اور انسان کے دل سے خُدا کی وہ صورت جس کی مانند وہ بنایا گیا تھا جو ہوگئی تو اس کے لئے یہ مشکل پیش آئی کہ وہ کس

طرح اُس گم شدہ الہی پاکیزہ صورت کی مانند خود کو پھر سے بنائے۔ کیونکہ جب اصل شے گم ہو جائے تو نقل کو اُس کے مطابق بنانا محال ہے۔ جب نمونہ نادیدہ ہو تو دیدنی صورت کو اُسکے مشابہ کرنا مشکل ہے۔ اب الہام الہی باطنی شریعت کی وہ ظاہری صورت ہے۔ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان کمدر الصورت اور مفصد الطبع پھر سے اصلی پاکیزہ حالات پر آسکتا ہے۔ شریعت الہامی (ظاہری) شریعت باطنی سے غیر نہیں۔ بلکہ اُسی کا اعادہ ہے۔ الہام کی ضرورت یہی ہے کہ وہ انسان کو اس کی اصلی سرشت کی طرف دوبارہ رجوع کرائے۔ اگر ابو البشر (آدم) باطنی شریعت کو کھونہ دیتا تو کبھی انسان کو ظاہری الہامی شریعت دئے جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ انسان کی اُس شوکت گذشتہ اور جلال رفتہ کے آثار کچھ نہ کچھ اب تک موجود ہیں۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے۔ بقول شخصے۔

### از نقش و نگار و و دیوار شکستہ — آثار پریر ست فنادر عجم را

چنانچہ خلیفہ خدا (انسان) کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور شرع باطنی کا ثبوت تمام اقوام عالم میں نیکی و بدی کا وہ احساس و امتیاز ہے جو وہ خدا کی ہستی اور الہام کے منکر ہونے کے باوجود فطری طور پر رکھتی ہیں۔ جو کچھ خدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے (رومیوں ۱: ۱۹)۔ وہ نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی کہتی ہیں۔ اگرچہ نیک و بد اعمال کے تعین کے متعلق سب کے خیالات میں اتفاق کلی نہیں۔ تاہم نیکی کا خیال اور علم و عمل اور بدی سے نفرت ہر جگہ ہر قوم میں ظاہر ہے۔ اور باطنی شریعت کا بقیہ ہر منکر دلچد کے باطن میں موجود ہے۔ اس لئے کہ جب وہ قومیں جو شریعت نہیں رکھتیں اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں۔ تو باوجود شریعت (یعنی الہامی شریعت) نہ رکھنے کے وہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وہ شریعت کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں اور اُن کا دل بھی ان باتوں کی گواہی دیتا ہے۔ اور اُن کے باہمی خیالات یا تو اُن پر الزام لگاتے ہیں اور یا اُن کو مغدور رکھتے ہیں (رومیوں ۲: ۱۴ - ۱۵) پس ثابت ہو کہ الہامی شرع انسان کی ابتدائی شرع باطنی کا اعادہ ہے۔ اُس سے علیحدہ نہیں بلکہ اُسی کے مطابق ہے اور الہام کی ضرورت ہی اس لئے ہوئی کہ شرع باطنی کو انسان نے گناہ کی تاریکی میں کھودیا تھا۔ گو اُس کا کچھ بقیہ ہر ایک کے دل میں موجود ہے پر وہ انسان کی کامل رہنمائی میں قاصر ہے۔ کیونکہ امتداد زمانہ اور ظاہری و باطنی انقلابات نے اُس میں بہت سی تبدیلی کر دی ہے۔ اب الہام خدا کی طبیعت۔ مرضی اور رحمت و محبت کا ظہور ہے۔ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان محبوب الطبع و مدر الفطرہ پھر ابتدائی پاکیزہ و مبارک حالت پر بحال ہو سکتا اور اپنی بگڑی ہوئی روحانی صورت کو آہنیہ الہام میں سنوار کر دوبارہ خدا کی صورت پر بن سکتا ہے گناہ کی تاریکی میں انسان خدا سے پھڑا گیا اور اپنے محبوب حقیقی کی فرقت سے بے قرار ہو کر اُس کی جستجو و تلاش میں مارا مارا پھرا گیا۔ لیکن اُس کے دیدار فیض آثار سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ دل میں آرزوئے دید کروٹیں لے رہی تھی۔ مگر اس حرماں نصیب کو اپنے پردہ نشین نادیدہ اور لامکاں محبوب کی آستیاں بوسی کو فخر کبھی حاصل نہ ہوا۔ آخر خدا نے خطوط اسلاط (صحائف مطہرہ) کے ذریعے خود کو اُس پر آشکارا فرمایا اور اُس کی خواہشات کا جواب دید۔ پس الہامی صحائف گویا خدا کے مکتوب ہیں۔

# شخصی مذہب

ہم گزشتہ صفحات میں دلیل و براہین سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچا چکے ہیں کہ انسانی عقل محدود و ضعیف اور بگڑی ہوئی ہونے کے باعث معرفت حقانیہ اور حقائق روحانیہ کے افہام و تفہیم میں قاصر ہے۔ اور یہ بھی دکھا چکے کہ الہام ہی ایک ایسا ممکن اور معقول ذریعہ ہو سکتا ہے جو عقل انسانی پر غیر مرئی اور فوق الفطرت روحانی حقیقتوں کو منکشف کر سکتا ہے۔ چنانچہ الہام الہی پہلے شخصی طور پر خاص اشخاص پر نازل ہوا۔ ازمنہ سابقہ میں جبکہ مذہب الہی انفرادی صورت میں تھا خداوند تعالیٰ نے خاص خاص اشخاص کے ساتھ کلام کیا۔ اور اپنی مرضی و منشاء کو ان پر شخصی طور سے ظاہر فرمایا۔ چونکہ تمام دنیا اُس وقت گناہ کی غلامی اور تاریکی میں مبتلا تھی اس لئے خدا نے اُس میں سے خاص اشخاص کو انتخاب کر کے صراطِ مستقیم پر قائم کیا۔ مثلاً اُس نے ابراہام کو بُت پرستوں میں سے چُن لیا اور اُس سے یوں مخاطب ہوا (الہام دیا) تو اپنے وطن اور اپنے ناطے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اُس ملک میں جاجو میں تجھے دکھاواں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناواں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہو۔ جو تجھے مبارک کہیں اُن کو میں برکت دوں گا۔ اور جو تجھ پر لعنت کرے اُس پر میں لعنت کروں گا۔ اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے (پیدائش ۱۲: ۱-۳) اور ابراہام نے اُسی جگہ پر جہاں خدا اُسے کسی دیدنی صورت میں نظر آیا تھا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں خدا کی عبادت کی (۱۲: ۷-۸) پھر یعقوب کے ساتھ خدا ہمکلام (الہام) ہوا۔ ملاحظہ ہو (پیدا نش ۲۸: ۱۳-۱۵) اور اُس نے بھی اُسی جگہ جہاں خدا اُس سے ہمکلام ہو ایک پتھر کا مذبح بنا کر اُس کا نام بیت ایل (خدا کا گھر) رکھا اور خدا کی عبادت کی (۲۸: ۱۸-۱۹) پھر کوہِ حورب کے نزدیک خدا موسیٰ پر ایک جھاڑی میں لگی ہوئی آگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اُس سے کلام کیا۔ اور اُس کے آباؤ اجداد کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو دہرا۔ اور موسیٰ نے الہی حضور کو محسوس کر کے ازراہ تعظیم اپنے پاؤں سے جوتی اُتاری اور منہ بھپایا۔ خروج ۳ باب

# قومی مذہب

پہلے الہام الہی شخصی تھا اور مذہب الہی بھی شخصی۔ اس لئے خدا خاص اور چیدہ اشخاص کے ساتھ تنہائی میں ہمکلام ہوتا اور ان سے اپنے احکام کی تعمیل طلب کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہی مذہب الہی انفرادی خصوصیت سے نکل کر قومیت میں منتقل ہو گیا۔ اور مذہب الہی ایک قومی مذہب اور الہام الہی ایک قومی الہام ہو گیا۔ اور خدا نے اپنے وعدے کے مطابق جو ابراہام سے کیا تھا اُس کی نسل کو جو اب ایک قومی صورت اختیار کر چکی تھی چن کر تمام بت پرست اور مشرک اقوام سے الگ کیا۔ اور اپنی خاص قوم بنایا اور فرمایا۔ کیونکہ تم خداوند اپنے خدا کے لئے ایک مقدس قوم ہو۔ خداوند تمہارے خدا نے تم کو زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ تم اُس کی خاص اُمت ٹھرو۔

(استثنا ۷: ۶) اور اس خاص قوم (بنی اسرائیل) پر موسیٰ ک وسیلے اپنی مرضی کا اظہار فرمایا۔ اور اپنے اوامر و نواہی کو اُن پر نازل فرما کے اُن پر اُن تفصیل طلب کی۔ اس لئے جو فرمان اور آئین اور احکام میں آج کے دن تم کو بتاتا ہوں تم اُن کو ماننا اور اُن پر عمل کرنا (استثنا ۷: ۱۶) اور وہ شرع الہی تین قسم کی تھی۔ یعنی شریعت ملکی۔ شریعت رسمی اور شریعت اخلاقی۔ اور ملکی و رسمی شرائع کی رُوح رواں اور مرکز شرع اخلاقی تھی۔ اب ہم نہایت مختصر طور پر شرائع ثلاثہ کا جُدا جُدا بیان کریں گے۔

## شریعت رسمی

قربانیاں، ختنہ۔ عبدیں نئے چاند۔ نذریں، حلت و حرمت، طہارتِ بدنی، روزہ اور کاہن و سردار کاہن اور لاویوں اور عام قوم کے فرائض وغیرہ سب رسمی شریعت میں شامل ہیں۔ اس شریعت کا بیان پیدا کُنش کی کتاب کے سوا تورات کی چاروں کتابوں میں موجود ہے۔

## شریعت اخلاقی

اس میں احکام عشرہ موجود ہیں۔ جو خدا نے پتھر کی دونو لوحوں پر لکھے لکھائے موسیٰ کو سوئے (خروج ۳۱: ۱۸، ۳۲: ۱۵: ۱۶: ۳۴: ۲۸) اور یہ دس احکام خروج ۲۰: ۱-۱۷ میں پائے جاتے ہیں۔ اور احبار ۱۹ باب اور استثنا کے چند ابتدائی ابواب میں اُن کی مفصل شرح موجود ہے۔ اور اس شرع اخلاقی کا خلاصہ بدیں الفاظ موجود ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ استثنا ۶: ۵ یہ دس احکام کی لوح اول کے چار احکام کا خلاصہ ہے۔ اپنے ہمسایہ سے اپنی مانند محبت رکھ (احبار ۱۹: ۱۸) یہ لوح ثانی کے چھ احکام کا خلاصہ ہے۔ اور خداوند مسیح نے بھی اخلاقی شریعت کو ہر قسم کی شریعت رسمی و ملکی کی جان ٹھہرایا۔ اور اسی خلاصہ شرع اخلاقی کا اعادہ فرماتے ہوئے یہ کہا کہ ان ہی دو حکموں پر تمام تورات اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے (متی ۲۲: ۴۰)۔

## ملکی شریعت

اس میں بادشاہوں، قاضیوں اور حاکموں اور رعیت کے فرائض ہیں۔ اور احکام قوم اسرائیل شرع رسمی اخلاقی کے محافظ تھے۔ شرع کی خلاف ورزی کرنے والے تعزیرات ملکی ک ماتحت مختلف سزائیں پاتے تھے۔ تاکہ احکام الہی کی پابندی کی رُوح اُن میں پیدا ہو۔ اور قوم خدا کی مرضی و منشاء کی قدر و منزلت کو پہچانے۔

اخلاقی و جسمانی ہر دو قسم کے قوانین پہلو بہ پہلو اس قوم میں چلے آئے۔ اور بہت سے انبیاء یکے بعد دیگرے مختلف زمانوں اور متفرق حالتوں میں پیغام الہی لے کر اس قوم میں مبعوث ہوتے رہے۔ اور اپنے اپنے وقت میں قوم کی معاشرتی و اخلاقی اصلاح

مختلف طریقوں سے کرتے آئے۔ اور ہزاروں برس کے طویل عرصہ میں خُدا کی اس برگزیدہ و چنیدہ قوم کی مذہبی و اخلاقی حالت نے کئی رنگ پلٹے۔ کی بار شرعِ الہی سے تباہی و انحراف کر کے مور و رعتاب ٹھہری۔ کئی بار تو بہ و استغفار کے ذریعے بحال کی گئی۔ خُدا کا عادل ہے۔ اور اُس عادل نے قوانین کا نفاذ فرما کے اُن پر اس مخصوصہ گروہ کا مخصوص عمل طلب کیا۔ لیکن اُس نے بجائے فرمانبرداری کے عدول حکمی کی۔ اس لئے خُدا نے عادل ہونے کی حیثیت میں قانون شکن کو سزا دی۔ اور معیادِ تفریر کے اختتام پر اُن کو رہائی دیتا رہا۔ اس قوم کا سب سے بڑا گناہ جو خُدا کی غیور کی غیرت کو جوش دلاتا رہا بُت پرستی تھا۔ جب جب اس قوم کو ارد گرد کی دیگر بے خُدا اور بُت پرست اقوام ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور خُدا نے ان ہی معائب و نقائص کے زنگ کو اُن کو طباہ سے مٹانے کے لئے بار بار اُنہیں مصیبت کی آگ میں ڈالا۔ تاکہ وہ کندن کی طرح صاف اور خالص ہو جائیں۔ جب وہ مجھے تالے گا تو میں سونے کی مانند نکل آؤں گا۔ (ایوب: ۲۳، ۱۰، زبور ۶۶: ۵۰)۔

## شریعت کا مرکز

بنی اسرائیل قوم کے فرائض مذہبی کی انجام دہی کا مرکز پہلے تو خیمہ تھا جس کا مفصل احوال خروج با ۲۵ میں پایا جاتا ہے۔ خیمہ کو دینی امور کا مرکز اُس وقت اس وجہ سے بنایا گیا۔ کہ ابھی قوم اسرائیل خود آوارہ غربت تھی۔ اور خیموں میں قیام کرتی تھی۔ اس لئے اُن کی مذہبی ضرورت کو عارضی طور پر پورا کرنے کے لئے خُدا نے خیمہ بنانے کا حکم دیا۔ اور ہر قسم کی شرعِ رسمی۔ ملکی و اخلاقی کا تعلق اُسی سے تھا۔ اور جب یہ قوم رفتہ رفتہ ملک موعود کنعان پر قابض ہوئی اور وہاں ہر سکونت کے لئے مکان بنائے اور قصبے و شہر آباد کئے تو عبادتِ الہی کے لئے بھی ایک مکان بنایا گیا۔ اور وہ ہیکل تھی جو سیلمان بن داود نے شہر یروشلم میں کوہ مور یا پر تعمیر کی تھی۔ اور عبادت کے تمام لوازمات و اسباب خیمہ موسوی سے اس ہیکل میں منتقل ہوئے اور ہیکل کی تعمیر کے متعلق خُدا نے پہلے ہی اُن کے ایامِ مسافرت میں فرمایا دیا تھا۔ لیکن جب تم یردن پار جا کر اُس ملک میں جس کا مالک خُداوند تمہارا خُدا تم کو بناتا ہے بس جاؤ۔ اور وہ تمہارے سب دشمنوں کی طرف سے جو گردا گرد ہیں تم کو راحت دے اور تم امن سے رہنے لگو۔ تو وہاں جس جگہ کو خُداوند تمہارا خُدا اپنے نام کے مسکن کے لئے چن لے وہیں تم یہ سب کچھ جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں لے جایا کرنا۔ یعنی اپنی سوختنی قربانیاں اور اپنے ذبیحے اور اپنی دو یکیاں۔ اور اپنے ہاتھ کے اُٹھائے ہوئے ہدے اور اپنی خاص نذر کی چیزیں (استثنا ۱۲: ۱۰ - ۱۱، ۱۸، ۲۶)۔

اس ہیکل کے ساتھ قوم بنی اسرائیل کے سوا اور کسی قوم کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور نہ ہی عام اجازت تھی کہ غیر اقوام اُس سے تعلق رکھیں۔ اور نہ ہی شرعِ الہی کی نشرو اشاعت کا دیگر اقوام میں حکم تھا۔ ہیکل ایک مختص بالقوم و زمان عبادت گاہ تھی۔ اور قوانین و شرعِ الہی بھی محدود بالقوم و مان تھی۔ مدتوں تک مذہبِ الہی اُس خاص قوم کے ساتھ خاص رہا۔ اور قوم اسرائیل کو ختمہ۔ قربانی۔ روزہ سبت طہارت اور حلت و حرمت کے احکام دینے اور ان تمام فرائض کی انجام دہی کا مرکز یروشلم کی ہیکل کو ٹھہرانے سے خُدا کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو ارد گرد کی تمام دیگر بت پرست اقوام سے قوم مخصوصہ الہیہ کا افتراق امتیاز صاف نظر آئے۔

جس طرح فوجی لوگ خاص امتیازی نشانات وعلامات کے باعث بادشاہ کی رعیت کے عام افراد سے جداگانہ اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن ظاہری اور رسمی دستورات اور ابتدائی اصولوں کی پابندی سے اُن کے اندر متابعت الہی کی بنیاد رکھی جائے۔ تاکہ جہاں وہ اپنے مویشی اور مال واسباب کو عقیدت الہی کے مذبح پر قربان کرتے ہیں وہاں کسی وقت اپنی شخصیت کو نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ چنانچہ خُداوند تعالیٰ نے یہ ابتدائی سبق انہیں انبیاء کے ذریعے خوب سکھایا۔ اور ان رسمی قربانیوں اور دیگر ظاہری اور جسمانی رسومات کی تکمیل و تعمیل کے مطالبہ سے مقصدِ الہی یہ تھا کہ فرمانبرداری اور اطاعت کے بیچ کو اُن کے دلوں میں بویا جائے۔ اور وہ خاص روحانی مقصد جو ان عارضی و ظاہری رسوم کے دائرہ کا مرکز تھا۔ بدیں الفاظ ظاہر کیا گیا ہے۔ تو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ (استثنا ۶: ۵)۔

## عہد عتیق مختص بالقوم اور مختص بالزمان ہتا

اگر کوئی متلاشی حق وصدق صاف باطنی سے عہد عتیق کا اول سے آخر تک مطالعہ کرے تو وہ یہ اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ توریت کا مذہب ایک مختص بالقوم و لزمان تھا۔ توریت میں ذاتی طور پر ایک عالمگیر مذہب ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے دی گئی ہے۔ اُس کے تمام احکام و شرائع اور دستورات و اصولات خاص قوم بنی اسرائیل سے ہی مختص تھے۔ اور شریعت موسوی کی تعمیل و تکمیل کا مرکز تروشلیم کی ہیكل تھا۔ یہودیت کے دائرہ خاص سے باہر نہ تو اُس کی تبلیغ و اشاعت کا حکم کہیں موجود ہے۔ اور نہ ہی کبھی یہودی انبیاء نے اُس کو غیر اقوام میں جائز رکھا۔ بلکہ و توبت پرست غیر اقوام کے درمیان خُدا کا نام لینا بھی خُدا کی بے عزتی و حقارت سمجھتے تھے۔ جب شاہ نبو کد نظر تمام یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے گیا تو اُس وقت اُن کی دینی غیرت اور خُدا کے نام کی توقیر کا اظہار ان الفاظ سے عیاں ہے۔ ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے۔ اور صیون کو یاد کر کے روئے۔ وہاں بید کے درختوں پر ہم نے اپنی ستاروں کو ٹانگ دیا۔ کیونکہ وہاں ہم کو اسیر کرنے والوں نے گیت گانے کا حکم دیا۔ اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کرنے کا۔ اور کہا صیون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سنا۔ ہم پردیس میں خُداوند کا گیت کیسے گائیں۔ زبور ۱۳۷: ۱-۴) وہ غیر اقوام میں خُدا کا نام لینا خُدا کو ٹھٹھوں میں اُڑانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ملکی و رسمی شرائع بہ نفسہ کمزور اور مختص بالقوم و لزمان تھیں۔ اور اُن میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت ہی مفقود تھی۔ اور شرع اخلاقی قوم و زمان کی قیود سے آزاد تھی۔ چنانچہ وہ اب تک یہودی مسیحی اور کئی دیگر مہذب اقوام کا دستور العمل بنی ہوئی پہلی آتی ہے۔ عہد عتیق کے انبیاء خود توریت کی قربانیوں اور دیگر رسموں کو کمزور اور ناقص بتاتے گئے ہیں۔ مثلاً سموایل نبی کہتا ہے کہ کیا خُداوند سوختنی قربانیوں اور ذبیحوں سے اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا اس بات سے کہ خُداوند کا حکم مانا جائے؟ دیکھ فرمانبرداری قربانی سے اور بات مانی مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے (۱- سموایل ۱۵: ۲۲) داود نبی کا قول (زبور ۵۱: ۱۶-۱۷) سلیمان نبی کا قول (امثال ۲۱: ۳) ہوسیع نبی کا قول (ہوسیع ۶: ۶) دانی ایل نبی کا قول (مرادانی ایل ۹: ۲۴-۲۷) نبی اسرائیل میں قربانیاں چڑھاتے چڑھاتے یہ سُو عقیدت پیدا ہوگئی کہ قربانی کی اصل رُوح اور غرض و غایت سے لاپرواہ ہو کر گناہ کرنے میں آزاد اور بے

خوف ہو گئے۔ اور عہد اَو قصد آگناہ کر کر کے قربانیوں اور دیگر رسوم کو رواجی و رسمی پر انجام دینے لگے۔ اور اس بات کو بھول گئے کہ خدا کی فرمانبرداری قربانی چڑھاتے سے بہتر ہے۔ انہوں نے عہد آگناہ کر کر کے اُن کی تلافی کے لئِ قربانیاں چڑھانا ایک دستور العمل ہی بنا لیا۔ اور اس لئے خدا نے انبیاء کے ذریعے اس دستور کو نامقبول ٹھہرا کے تنبیہ و ہدایت فرمائی۔ خداوند فرماتا ہے لیکن میں اُس شخص پر نگاہ کروں گا۔ اُسی پر جو غریب اور شکستہ دل ہے۔ اور میرے کلام سے کانپ جاتا ہے۔ جو بیل ذبح کرتا ہے اُس کی مانند ہے جو کسی آدمی کو مار ڈالتا ہے اور جو برہ کی قربانی کرتا ہے اُس کے برابر ہے جو کتے کی گردن کاٹتا ہے۔ جو ہدیہ لاتا ہے گویا سور کا لہو گذرانتا ہے جو بُبان جلاتا ہے اُس کی مانند ہے جو بُت کو مبارک کہتا ہے۔ ہاں انہوں نے اپنی اپنی چن لیں اور اُن کے دل اُن کی نفرتی چیزوں سے مسرور ہیں (یسعیاہ ۶۶: ۲-۳؛ ۱۱-۱۲) یہودی لوگ سال میں تین مرتبہ عیدیں منانے کے لئے یروشلم میں جایا کرتے تھے۔ اور ان تینوں عیدوں یعنی عید فصح۔ عید خیام اور عید پینٹیکسٹ کا تعلق ہیکل کے ساتھ تھا۔ ان عیدوں۔ قربانیوں اور دیگر تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی کا مرکز ہیکل تھی۔ اُس کے علاوہ اور کسی جگہ ان فرائض کی انجام دہ ممنوع تھی۔ اور خبردار رہنا تا ایسا نہ ہو کہ جس جگہ کو دیکھ لو وہیں اپنی سوختنی قربانی چڑھاو بلکہ فقط اُسی جگہ جسے خداوند تمہارے کسی قبیلہ میں چن لے تم اپنی سوختنی قربانیوں گذرانا اور وہیں سب کچھ جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں کرنا استثنا ۱۲: ۱۳-۱۴ اور ہیکل کا ایک خاص مقام یروشلم ہی سے متعلق ہونا اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ اُس میں عالمگیر دینی مرکز ہونے کی قابلیت نہ تھی۔ کیونکہ بالفرت اگر تمام دُنیا توریت کی پیروی پر آمادہ ہوتی تو تمام دُنیا کا عیدوں، قربانیوں اور دیگر رسموں کی ادائیگی کے لئے یروشلم میں سال میں تین مرتبہ حاضر ہونا محال ہوتا۔ اول تو اس قدر ہجوم کی وہاں گنجائش ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو وہاں نہ جاتا وہ خدا کا نافرمان ٹھہرتا۔ اور پھر تین مرتبہ سال میں وہاں حاضر ہونا لازمی تھا۔ تو اس صورت میں ہزاروں کو س سے دور دراز ممالک ک باشندے وہاں کیسے پہنچ سکتے۔ اُن کا تو سال بھر آمد و رفت ہی میں ختم ہو جایا کرتا۔ اور پھر ذرائع آمد و رفت کی دشواریاں توریت کی توسیع اشاعت میں سدِ راہ تھیں۔ اور ہیکل کا تمام عالم کے لئے مرجع دینی ہونے سے اُمور معاشرت میں سخت نقصان ہو کر جسمانی زندگی معرض خطر میں پڑ جاتی۔ پھر آمد و رفت کے بھاری اخراجات و مصارف سے محروم رہنے کے علاوہ خدا کے مجرم ٹھہرتے۔ اور یہ ایک سخت ترین آسمانی سزا بنی نوع انسان کے لئے ہوتی۔ چنانچہ کعبہ اور تیرتھوں کا وجوہ داسلام اور ہندو ازم کے مختص بالقوم و ملک ہونے کی ایک بین اور مسکت دلیل ہے۔ ہم پیچھے خوب دکھا چکے ہیں کہ مذہب الہی کس طرح انفرادیت سے قومیت میں منتقل ہوا۔ اب عقل خواہ مخواہ یہ سوال کرتی ہے کہ کیا خدا صرف ایک خاندان یا ایک قوم ہی کا خدا ہے؟ کیا وہ محض یہودی قوم ہی کو اپنے علم و عرفان یا ایک قوم ہی کا خدا ہے؟ کیا وہ محض یہودی قوم ہی کو اپنے علم و عرفان سے مستفید فرما کر فقط اُسی سے اپنی عبادت و طاعت اور بندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟ کیا خدا صرف یہودیوں ہی کا ہے۔ غیر قوموں کا نہیں؟ بیشک غیر قوموں کا بھی ہے رومیوں ۳: ۲۹ وہ تمام دیدنی و نایدنی عالم کا خالق و رازق ہے۔ اور اُس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی۔ اعمال ۱۷: ۲۶ تُو نے آسمان اور آسمانوں کے آسمان کو اور اُن کے سارے لشکر کو اور زمین کو اور جو کچھ اُس پر ہے۔ اور سمندر وں کو اور جو کچھ اُن میں ہے بنایا اور تُو سبھوں کا پرور دگار ہے اور آسمان کا لشکر تجھے سجدہ کرتا ہے۔ نحمیاہ ۹:



## قول المسیح - تم کتابِ مقدس میں ڈھونڈتے ہو۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ اُس میں ہمیشہ کی زندگی تمہیں ملتی ہے۔ اور یہ وہ ہے جو میری

گواہی دیتی ہے (یوحنا ۵: ۳۹)۔

۱۔ وہ یہوداہ کے فرقہ داود کے خاندان سے ہوگا۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں خُداوند فرماتا ہے کہ میں داود کے لئے ایک صادق شاخ پیدا کروں گا۔ اور اُس کی بادشاہی ملک میں اقبال مندی اور عدالت اور صداقت کے ساتھ ہوگی۔ اُس کے ایام میں یہوداہ نجات پائیگا اور اسرائیل سلامتی سے سکونت کرے گا۔ اور اُس کا نام یہ رکھا جائے گا خُداوند ہماری صداقت ہے۔ یرمیاہ ۲۳: ۵ - ۶ یسعیاہ ۱۱: ۱ - ۲ زکریاہ ۱۳: ۱ مطابق یوحنا ۷: ۲۲۔

۲۔ اُس کا ایک پیشرو ہوگا۔ دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کریگا۔ (ملاکی ۳: ۱) پکارنے والے کی آواز! بیابان میں خُداوند کی راہ درست کرو۔ صحرا میں ہمارے خُدا کے لئے شاہراہ ہموار کرو۔ یوحنا پتسمہ دینے والا یسعیاہ ۴۰: ۳ مطابق متی ۳: ۱ - ۳

۳۔ وہ کنواری سے پیدا ہوگا۔ لیکن خُداوند آپ تم کو ایک نشان بخشے گا۔ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا۔ اور وہ اُس کا نام عمانوئیل رکھیں گے۔ یسعیاہ ۷: ۱۴ مطابق متی ۱: ۲۳۔

۴۔ شہر بیت لحم میں پیدا ہوگا۔ لیکن اے بیت لحم افراتاہا گرچہ تو یہوداہ کے ہزاروں میں شامل ہونے کے لئے چھوٹا ہے۔ تو بھی تجھ میں سے ایک شخص نکلیگا۔ اور میرے حضور اسرائیل کا بادشاہ ہوگا۔ اور اُس کا مصدر زمانہ مطابق ہاں قدیم الایام سے ہے۔ میکاہ ۵: ۲ مطابق متی ۲: ۲: الوقا ۲: ۴۔

۵۔ اُس کو سجدہ کرنے کے لئے مجوسی آئیں گے۔ وہ سب سب سے آئیں گے اور سونا لوہا لائیں گے اور خُداوند کی حمد کا اعلان کریں گے۔ یسعیاہ ۶۰: ۶ مطابق متی ۲: ۱ - ۲۔

۶۔ مصر میں پناہ پائیگا۔ جب اسرائیل ابھی بچہ ہی تھا میں نے اُس سے محبت رکھی۔ اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا۔ ہوسیع ۱۱: ۱ مطابق متی ۲: ۱۳ - ۱۴۔

۷۔ معصوم بچوں کا قتل۔ رامہ میں ایک آواز سُنائی دی نوحہ اور زار زار رونا۔ داخل اپنے بچوں کو رو رہی ہے۔ وہ اپنے بچوں کی بابت تسلی پذیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ نہیں ہیں۔ یرمیاہ ۳۱: ۱۵ مطابق متی ۲: ۱۶ - ۱۸۔

۸۔ وہ رُوح القدس سے مَمسُوح ہوگا۔ خُداوند خُدا کی رُوح مجھ پر ہے۔ کیونکہ اُس نے مجھے مَسَح کیا۔ تاکہ خوشخبری (انجیل) سُناؤں۔ یسعیاہ ۶۱: ۱ اور خُداوند کی رُوح اُس پر ٹھہرائے گی۔ حکمت اور خرد کی رُوح مصلحت اور قدرت کی رُوح معرفت اور خُداوند کے خوف کی رُوح۔ یسعیاہ ۱۱: ۲ مطابق متی ۳: ۱۶۔

۹۔ تو میں اُس سے برکت پائیں گی۔ اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔ پیدائش ۱۲: ۳ مطابق اعمال ۳: ۲۵-۲۶۔

۱۰۔ گلیل میں اُس کا نام۔ لیکن اندوگئیں کی تیرگی جاتی رہے گی۔ اُس نے قدیم زمانہ میں زبلون اور نفتالی کے علاقوں کو ذلیل کیا۔ پر آخری زمانہ میں قوموں کی گلیل میں دریا کی سمت یردن کے پار بزرگی دے گا۔ جو لوگ تاریکی میں چلتے تھے اُنہوں نے بڑی روشنی دیکھی۔ جو موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے اُن پر نور چمکا۔ یسعیاہ ۹: ۱-۲ مطابق متی ۴: ۱۲-۱۷۔

۱۱۔ اُس معجزات۔ اُن کو جو کچھ لے ہیں کہو ہمت باندھو مت ڈرو۔۔۔۔۔ اُس وقت اندھوں کی آنکھیں داکی جائیں گی۔ اور بہروں کے کان کھولے جائیں گے۔ تب لنگڑے ہرن کی مانند چوڑیاں بھریں گے۔ اور گونگے کی زبان گائے گی۔ یسعیاہ ۳۵: ۴-۶ مطابق متی ۱۱: ۴-۵ - ۱۵ اعمال ۲: ۲۲۔

۱۲۔ گدھے پر سوا ہو کر یروشلیم میں داخل ہونا۔ اے دخترِ یروشلیم خوب لکار۔ کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور نجات اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوا ہے۔ زکریا ۹: ۹ مطابق متی ۲۱: ۵-۷۔

۱۳۔ یہود وغیر اقوام اُسے رد کریں گے۔ تو میں کس لئے جوش میں ہیں اور لوگ کیوں باطل خیال باندھتے ہیں۔ خُداوند اور اُس کے مسیح کے خلاف زمین کے بادشاہ صف آرائی کر کے اور حاکم آپس میں مشورہ کر کے کہتے ہیں۔۔۔۔۔ زبور ۲: ۱-۱۲ اعمال ۴: ۲۵-۲۸۔

۱۴۔ اپنے ایک شاگرد کے ہاتھوں گرفتار ہوگا۔ بلکہ میرے دلی دوست نے جس پر مجھے بھروسہ تھا اور جو میری روٹی کھاتا تھا مجھ پر لات اُٹھائی۔ زبور ۴۱: ۹، ۵۵، ۱۲ مطابق یوحنا ۱۳: ۱۸، ۲۶-۲۷۔

۱۵۔ تیس روپے میں بیچا جائیگا۔ اور اُنہوں نے میری مزدوری کے لئے تیس روپے تول کر دئے۔ اور خُداوند نے مجھے کہا کہ اُسے کہہ کر کے سامنے پھینک دے۔ یعنی اُس بڑی قیمت کو جو اُنہوں نے میرے لئے ٹھہرائی۔ اور میں نے یہ تیس روپے لے کر خُداوند کے گھر میں کہہ کر کے سامنے پھینک دئے۔ زکریا ۱۱: ۱۲-۱۳ مطابق متی ۲۶: ۲۷-۳۰۔

۱۶۔ شاگرد اُس سے بیوفائی کرینگے۔ رب الافواج فرماتا ہے اے تلوار تو میرے چرواے یعنی انسان پر جو میرا رفیق ہے بیدار ہو۔  
چرواے کو مار کہ گلہ پراگندہ ہو جائے۔ زکریاہ ۱۳: ۷ مطابق متی ۲۶: ۵۶، ۳۱۔

۱۷۔ جھوٹے گواہوں کی شہادت۔ جھوٹے گواہ اٹھتے ہیں اور جو باتیں میں نہیں جانتا وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ وہ مجھ سے نیکی کے بدلے بدی کرتے ہیں۔ زبور ۳۵: ۱۱، ۱۲، ۲۷: ۱۲ مطابق مرقس ۱۴: ۵۵ - ۵۸۔

۱۸۔ اُس کے منہ پر طمانچے مارینگے۔ ہمارا محاصرہ کیا جاتا ہے۔ وہ اسرائیل کے حاکم کے گال پر چھڑی سے مارتے ہیں۔ میکاہ ۵: ۱  
مطابق متی ۲۷: ۳۰۔ مرقس ۱۵: ۱۹۔

۱۹۔ اُس کے منہ پر تھوکیں گے اور ٹھٹھے مارینگے۔ میں نے اپنی پیٹھ بیٹنے والوں کے اور اپنی داڑھی نوچنے والوں کے حوالے کی۔ میں نے اپنا منہ رسوائی اور تھوک سے نہیں چھپایا۔ یسعیاہ ۵: ۶ مطابق مرقس ۱۵: ۱۹ - ۲۰۔

۲۰۔ وہ تمام اذیتوں کو خاموشی سے سہیگا۔ وہ ستایا گیا تو بھی اُس نے برداشت کی اور منہ نہ کھولا۔ جس طرح برہ جسے ذبح کرنے کو لے جاتے ہیں۔ اور جس طرح بھیڑ بال کترنے والوں کے سامنے بے زبان ہے اسی طرح وہ خاموش رہا۔ یسعیاہ ۵۳: ۷ مطابق متی ۲۷: ۱۲ - ۱۴۔

۲۱۔ اُس کی صلیبی حالت۔ میں پانی کی طرح بہ گیا۔ میری سب ہڈیاں اکھڑ گئیں۔ میرا دل موم کی مانند ہو گیا۔ وہ میرے سینہ میں پگھل گیا۔ میری قوت ٹھیکرے کی مانند خشک ہو گی۔ اور میری زبان میرے تالو سے چپک گئی۔ اور تو نے مجھے موت کی خاک میں ملا دیا۔ کیونکہ کتوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ بدکاروں کا گروہ مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں چھیدتے ہیں۔ میں اپنی سب ہڈیاں گن سکتا ہوں وہ مجھے تاکتے اور گھورتے ہیں۔ زبور ۲۲: ۱۴ - ۱۷ مطابق متی ۲۷: ۲۷ - ۳۴۔

۲۲۔ اُس کی پوشاک پر قرعہ اندازی۔ " وہ میرے کپڑے آپس میں بانٹتے ہیں اور میری پوشاک پر قرعہ ڈالتے ہیں۔ زبور ۲۲: ۱۸ مطابق متی ۲۷: ۳۵۔

۲۳۔ پت اور سر کہ پلانا۔ انہوں نے مجھے کھانے کو پت دیا۔ اور میری پیاس بجھانے کو انہوں نے مجھے سر کا پلایا۔ زبور ۲۹: ۲۱ مطابق متی ۲۷: ۳۴ - ۳۸ - ۳۰۔



اور سلطنت اور حشمت اُسے دی گئی۔ تاکہ سب لوگ اور اُمّتیں اور اہل لغت اُس کی خدمت گزار کریں۔ اُس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے جو جاتی نہ رہے گی اور اُس کی مملکت لازوال ہوگی۔ دانی ۷: ۱۳ - ۱۴ مطابق متی ۲۸: ۱۸، یوحنا ۵: ۲۲ - ۲۳، فلپی ۲: ۹ - ۱۱۔ پطرس ۱: ۱۱۔  
اس لئے ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا۔ اور سلطنت اُس کے کاندھے پر ہوگی۔ اور اُس کا نام عجیب مشیر۔ خدائے قادر ابدیت کا باپ۔ سلامتی کا شہزادہ ہوگا۔ اُس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ وہ داود کے تخت اور اُس کی مملکت پر آج سے ابد تک حکمران رہے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیوری یہ کرے گی۔ سعیاہ ۹: ۶ مطابق لوقا ۱: ۳۱ - ۳۳۔

## عہد عتیق اور عہد جدید

### کے بانیوں کی باہمی مشابہت

قول المسیح۔ ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں۔ لوقا ۲۴: ۴۴۔

ہم اوپر عہد جدید کے ہونے والے بانی کی تمام زندگی کی مکمل تصویر نبیوں کے صحیفوں اور زبور کی پیشین گوئیوں میں دکھا چکے ہیں۔ اب صرف توریت کی شہادت باقی ہے جو ہم ابھی پیش کرنے والے ہیں۔ تمام الہامی انبیاء اپنے صحائف منزلہ الہیہ میں بانی عہد جدید کی تصویر کے جدا جدا پہلو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ناظرین مندرجہ بالا آئیس پیشین گوئیوں میں کھنچی ہوئی تصویر کو بانی عہد جدید کی تصویر کے ساتھ جو انجیل مقدس (عہد جدید) میں موجود ہے ملا دیکھیں تو دونوں میں سرمو فرق نہ پائیں گے۔ وہ تصویر جو موسیٰ اور ابجد کے متعدد انبیاء نے اُس موعود کی کھنچی ہے اُس کے تمام خط و خال خُداوند مسیح کے ساتھ پورے پورے طور پر ملتے ہیں۔ تمام اخبار عتیق واذکار سابقہ کا کھوج سوائے سرور کائنات و سرچشمہ حسنات جناب فضیلت مآب خُداوند مسیح کی عدیم النظر اور فقید المثال ہستی کے کسی بھی دوسری ہستی اصلاً نہ ملیگا۔ ہم اپنے اس دعویٰ کی صداقت اور حقیقت کو عہد عتیق کے بانی موسیٰ نبی کی زبانی اور بھی زیادہ صفائی سے پایہ ثبوت کو پہنچائیں گے۔ موسیٰ توریت کی پانچویں کتاب میں یوں فرماتا ہے۔ اور خُداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہیگا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔ (استثنا ۱۸: ۱۷ - ۱۹) اس کے ساتھ مسیح کا قول بھی ملاحظہ ہو۔ کیونکہ اگر تم موسیٰ کا یقین کرتے تو میرا بھی یقین کرتے۔ اس لئے کہ اُس نے میرے حق میں لکھا ہے۔ یوحنا ۵: ۴۶ خُداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُن ہی کے بھائیوں میں تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ یہاں موسیٰ اُس ہونے والے نبی کو اپنی مانند کہتا ہے۔ تو اب نبی برپا کروں گا۔ یہاں موسیٰ اُس ہونے والے نبی کو اپنی مانند کہتا ہے۔ تو اب یہ دیکھنا مناسب ہے کہ موسیٰ اور مسیح میں کن کن باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان دونوں میں خاص خاص صفات مشترک نہ ہوں تو پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان دونوں میں خاص خاص صفات مشترک نہ ہوں تو مشابہت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی ہم مسیح پر اس مشین گوئی کو چسپاں کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مشابہت ثابت ہو جائے تو پھر خُداوند مسیح ہی اس خبر کے مفہوم کا مصداق ہو گا نہ کوئی اور مندرجہ ذیل امور متقابلہ پر غور کیجئے۔

<p>۱۔ مسیح کی پیدائش کے وقت شاہ ہرودیس کے حکم سے لڑکے قتل کروائے گئے۔ متی ۲: ۱۶</p>	<p>۱۔ موسیٰ کی پیدائش کے وقت اسرائیلیوں کے لڑکے شاہ فرعون کے حکم سے مردائے جاتے تھے۔ خروج ۱: ۱۵-۱۶، ۲۲</p>
<p>۲۔ مسیح کو بچپن میں خُدا نے فرشتے کے ذریعے آگاہی دیکر عجیب طور پر شاہ ہرودیس کے دستِ ستم سے بچایا۔ اور لطف یہ کہ موسیٰ نے بھی مصر میں پناہ پائی اور مسیح نے بھی مصر ہی میں پناہ پائی۔ متی ۲: ۱۳-۱۵</p>	<p>۲۔ موسیٰ کی بچپن میں خُدا نے عجیب حکمت سے بادشاہ کے دستِ ستم سے بچایا۔ خروج ۲: ۵-۱۰</p>
<p>۳۔ مسیح کے شاگرد بھی بارہ تھے۔ بعد ازاں وہ تمام دُنیا کا ہادی ٹھہرا۔</p>	<p>۳۔ موسیٰ بارہ قبیلوں کا ہادی تھا۔</p>
<p>۴۔ مسیح کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو خُون بنا دیا۔ یوحنا ۴: ۷-۹</p>	<p>۴۔ موسیٰ کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو خُون بنا دیا۔ خروج ۷: ۱۹-۲۰</p>
<p>۵۔ مسیح نے اعجازی قوت سے جھیل کے طوفان کو روکا اور اپنے شاگردوں کی جانیں ہلاکت سے بچائیں۔ لوقا ۸: ۲۲-۲۵</p> <p>۶۔ خُداوند مسیح نے فرمایا زندگی کا پانی میں ہوں۔ جو کوئی مجھ سے پیتا ہے وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ یوحنا ۴: ۱۴ اور پولوس رسول حورب کی چٹان کو جس سے موسیٰ نے پانی نکالا خُداوند مسیح سے ملاتا ہے۔ ۱۔ کرنتھیوں ۱۰: ۶</p>	<p>۵۔ موسیٰ نے معجزانہ طور پر بحرِ قلزم کے دو حصے کر دیے۔ اور بنی اسرائیل سلامتی سے اُس میں سے گزر گئے اور دریا سے کسی جان کا بھی نقصان نہ ہوا۔ خروج ۱۴: ۲۱-۲۲</p> <p>۶۔ موسیٰ نے حورب کی چٹان سے پانی نکالا اور قوم کی پیاس بجھا کر اُنہیں مرنے سے بچایا۔ خروج ۱۷: ۳-۶</p>
<p>۷۔ مسیح نے ایک دفعہ پانچ ہزار کی بھیڑ اور دوسری دفعہ چار ہزار کی بھیڑ کو معجزانہ طور پر صرف چند روٹیوں سے آسودہ کیا اور بہت روٹی بچ بھی رہی متی ۱۴: ۱۵-۱۵، ۲۱-۳۲ اور پھر فرمایا تمہارے باپ دادا نے بیابان میں مَن کھایا اور مر گئے۔ میں ہوں وہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اُتری۔ اگر کوئی اس روٹی میں سے کھائے تو ابد تک زندہ رہیگا۔ یوحنا ۶: ۴۹-۵۱</p>	<p>۷۔ موسیٰ نے قوم اسرائیل کو مَن کھلایا جو معجزانہ طور پر آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ خروج ۱۶: ۱۳-۱۵</p>

<p>۸۔ مسیح نے ابلیس، گناہ اور موت کی غلامی سے ایمانداروں کو آزاد کیا۔ یوحنا: ۸: ۳۳-۳۶، عبرانیوں: ۲: ۱۵</p>	<p>۸۔ موسیٰ نے اسرائیلیوں کو شاہِ مصر کی غلامی سے چھڑایا۔</p>
<p>۹۔ مسیح نے فرستادہ خدا ہونے کے ثبوت میں معجزات پیش کئے۔ یوحنا: ۳۶: ۲۲ اعمال: ۲: ۲۲</p>	<p>۹۔ موسیٰ نے اپنے من جانب خدا نبی ہونے کو معجزات سے ثابت کیا۔ استثنا: ۳۳: ۱۰-۱۲</p>
<p>۱۰۔ مسیح چالیس روز تک بلا خوردنوش جنگل میں خدا کی قربت میں رہا۔ متی: ۴: ۱-۲</p>	<p>۱۰۔ موسیٰ چالیس روز تک بغیر کھائے پیئے خدا کے حضور میں رہا۔ خروج: ۳۳: ۲۸</p>
<p>۱۱۔ مسیح کی صورت کوہِ حرمون پر تبدیل ہو گئی اور سورج کی مانند چمکنے لگی۔ اور اُس کے شاگرد نہایت خوفزدہ ہوئے اور لطف یہ کہ موسیٰ بھی اُس وقت ایلیاہ کی ہمراہی میں مسیح کے ساتھ پایا گیا۔ متی: ۱۷: ۲-۸</p> <p>مرقس: ۹: ۲-۸، لوقا: ۹: ۲۸-۳۶ موسیٰ کی صورت کوہِ سینا پر نورانی ہو گئی۔ موسیٰ کی صورت کوہِ سینا پر تبدیل ہوئی اور مسیح کی صورت کوہِ حرمون پر نورانی ہو گئی۔ دونوں نظارے پہاڑی ہیں۔</p>	<p>۱۱۔ موسیٰ کا چہرہ خدا کے جلال کی تجلی سے چمکنے لگا۔ اور اُس کی صورت تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ لوگ اُس سے ڈرنے لگے۔ خروج: ۳۳: ۲۹-۳۵، ۲۔ کرنتھیوں: ۳: ۸</p>
<p>۱۲۔ نیا عہد مسیح کے خون سے باندھا گیا۔ لوقا: ۲۲: ۲۰-۲۱۔ کرنتھیوں: ۱۱: ۲۵، عبرانیوں: ۹: ۱۱-۲۲</p>	<p>۱۲۔ پرانا عہد موسیٰ کے ذریعے خون سے باندھا گیا۔ خروج: ۲۴: ۸، عبرانیوں: ۹: ۱۸۰-۲۰</p>
<p>۱۳۔ مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔ یوحنا: ۱۷: ۱۷</p>	<p>۱۳۔ شریعت تو موسیٰ کے ذریعے دی گئی۔ یوحنا: ۱۷: ۱۷</p>
<p>۱۴۔ مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو برکت دی۔ اور روح القدس سے مسح کر کے اپنی جگہ قائم مقام بنا کر وصیت کی۔ متی: ۲۸: ۱۸-۲۰، یوحنا: ۲۰: ۲۱-۲۳</p>	<p>۱۴۔ موسیٰ نے آخری وقت یسوع پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخصوص کیا۔ اور اپنی جگہ اُسے قوم کا ہادی بنا کر وصیت کی۔ گنتی: ۲۷: ۱۵-۲۳، استثنا: ۳۲: ۹</p>

۱۵۔ خُداوند مسیح کی قبر بھی معدوم ہے۔ اگر ہے تو خالی ہے۔ مسیح زندہ ہو گیا۔ متی ۲۸ : ۵-۷، لوقا ۲۴ : ۳-۷، ۱ کرنتھیوں ۱۵ : ۲۰، اعمال ۲ : ۳۲۔

۱۵۔ موسیٰ کی قبر عدیم الپتہ ہے۔ کوئی اُس کی بابت نہیں جانتا۔ استثنا ۳۴ : ۶، خطیبہ ہوداہ ۹ آیت۔

اوپر ہم نے پندرہ اُمور میں موسیٰ اور خُداوند مسیح کی مشابہت دکھائی ہے جس سے ہتمام و کمال طور سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ کی وہ خبر جو اُس نے اپنی مانند ایک نبی کے برپا ہونے کے متعلق دی تھی وہ بجز خُداوند کے اور کسی نبی کی بعثت کا اشارہ تک نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے یوں لکھا ہے۔ اور اُس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی بھی موسیٰ کی مانند جس سے خُداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اُٹھا۔ استثنا ۳۴ : ۱۱ اور اُس کے بعد بھی کسی نبی نے نہ تو بالصراحت اور نہ بالاشارت اُس موعود نبی کے آچکنے کا کہیں ذکر کیا۔ اس لئے عہد عتیق کے سب سے آخری نبی نے بھی موسیٰ شریعت ہی کی طرف قوم کی وجہ جی رہنمائی کی۔ اگر وہ موعود نبی اُسکے زمانہ تک آچکا ہوتا تو وہ قوم کی اُس کی طرف توجہ دلاتا نہ کہ موسیٰ کی طرف۔ لیکن وہ شرع موسیٰ ہی کی یاد دہانی کرتا ہے۔ تم میرے بندے موسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض و احکام کو جو میں نے حورب پر تمام بنی اسرائیل کے لئے فرمائے یاد رکھو۔ ملاکی ۴ : ۴ پس ثابت ہوا کہ توریت کے سب سے آخری نبی یعنی ملاکی کے زمانہ تک بھی وہ نبی ظاہر نہ ہوا تھا۔ اس لئے اُس نبی کی کھوج ہمیں ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں کرنی پڑے گی دریں عالیکہ ملاکی نبی نے بھی اُس موعود نبی اور اُس کے پیشرو (یوحنا بیسٹپٹ) کے ظہور آئندہ کی صریح خبر بدیں الفاظ دی۔ دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔ اور میرے آگے راہ درست کرے گا۔ اور خُداوند جس کے تم طالب ہونا گہاں اپنی ہیکل میں آمو جو ہو گا۔ ہاں عہد کار رسول جس کے تم منتظر ہو آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے۔ ملاکی ۳ : ۱ مطابق مرقس ۱ : ۲، لوقا ۷ : ۲۷، یوحنا ۲ : ۱۳ - ۱۷ اچنانچہ ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں خُداوند یسوع مسیح کا ظہور ہوا۔ اور وہ عدیم الپتہ شخصیت اور فقید المثل ہستی تمام انبیاء کی پیش خبریوں کو پورا کرنے اور قوم کے طویل انتظار کا جواب دینے کے لئے زینت افزائے کا شانہ گیتی ہوئی۔ پُرانے عہد کے موعود نبی و بادشاہ اور نئے عہد کے خُداوند مسیح کی فوٹو میں سرفرق نہیں۔ وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ایک جواب ہے تو دوسرا اُس کی تعبیر ہے۔ اگر عہد عتیق انتظار کی دراز تہرہ شب ہے تو عہد جدید اُس انتظار کا جواب اور حصول مقصود کار و زور و روشن ہے۔ اور خُداوند مسیح نے بارہا اخبار انبیاء سابقہ کو خود اپنی ذات پر چسپاں کیا۔ ملاحظہ ہو لوقا ۲۴ : ۲۴، ۴ : ۱۷ - ۲۱۔ متی ۲۲ : ۲۲ - ۲۴، یوحنا ۵ : ۳۹ - ۴۶ پس ثابت ہوا کہ توریت میں جو ایک عالمیگر نئے عہد کی خبر پائی جاتی ہے وہ عہد مسیحیت ہے۔ اور جس بانی عہد جدید کی خبریں عہد عتیق نے دی ہیں۔ وہ بانی خُداوند یسوع مسیح ہے جس نے اس عالم آب دنگل کو اپنے مبارک قدموں کی برکت سے سرفراز فرمایا۔

## الہام و مذہب الہی کی تدریجی کمالات

اگر صحیفہ فطرت پر ایک خائز اور تحقیقی نظر ڈالی جائے تو ایک قانون نظر آتا ہے جو تمام موجودات عالم میں مشترک طور پر جاری و ساری ہے۔ وہ قانون ہے تدریجی ارتقاء ہر شے ادنیٰ سے اعلیٰ اور ناقص سے کامل کی طرف ترقی کرتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ رات کو جاسن کا بیج بویا جائے اور صبح کو پچاس فٹ اونچا درخت ہو کر پھل دینے لگے۔ بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ایک مخصوص وقت پر کمال کو پہنچتا ہے۔ ہر شے کی پیدائش، وسطی اور انتہائی حالت اس حقیقت کی تائید و تصدیق کرتی ہے۔ جبکہ جسمانی و مادی عالم میں تدریجی ارتقاء کا قانون خالق نے موضوع کر دیا ہے۔

تولازمی امر ہے کہ اخلاقی و روحانی امور میں بھی ایسا ہی ہو۔ کیونکہ صحیفہ فطرت اور صحیفہ الہام دونوں کا مصنف خُدا تعالیٰ ہے۔ کائنات جس خُدا کا فعل ہے الہام اسی کا قول ہے۔ لہذا دونوں میں مطابقت و مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ عقلی و علمی ارتقاء میں بھی تدریجی ترقی و کمالیت کا اٹل قانون و ساری نظر آتا ہے۔ طالب علم جوں جوں عقلی منازل کو طے کرتا جاتا ہے ہر مرحلہ پر اُس کے حسب لیاقت کتب درسی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے ہی روز بچے کے ہاتھ میں گلستان بوستان دے دی جائیں۔ یہی حال نزول الہام الہی کا ہے۔ خُدا اہل دُنیا کی حالت اساسی و سطحی اور انتہائی کے تناسب سے اپنے مکاشفے و الہام نازل فرماتا ہے۔ اُس نے اپنا الہام و مکاشفہ انفرادیت سے شروع کیا۔ اور خاص اشخاص کو چند سادہ احکام و قوانین دے کر اُن سے اُن کی تعمیل طلب کی۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چن لیا اور اپنے احکام و قوانین زیادہ تعداد میں موسیٰ کی معرفت اُن پر نازل کئے۔ اور اُن کی تعمیل و تقلید کی تاکید زمانہ بہ زمانہ طرح بہ طرح انبیاء کی معرفت فرماتا رہا۔ وہ الہام صرف قوم اسرائیل ہی سے متعلق تھا اور مذہب الہی قومی مذہب تھا۔ اور ضروری تھا کہ مذہب الہی انفرادی خصوصیت سے نکل کر عمومیت میں تبدیل ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا جیسا ہم پیشتر تفصیل دکھا چکے ہیں۔ چونکہ خصوصیت عمومیت کی ایک فرد ہے۔ لہذا خُدا نے اپنا الہام و مکاشفہ ابتدائی خاص سے شروع کر کے عام تک پہنچایا۔ پہلے اُس نے خاص افراد کو چُننا۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چُن لیا۔ جس طرح خُداوند مسیح نے بھی پہلے بارہ شاگردوں کو چن لیا اور اُنہیں فرمایا میں نے تمہیں چن لیا اور تم کو مقرر کیا کہ جا کر پھل لاؤ۔ (۱۔ یوحنا ۱۵: ۱۶) اور اس عالمگیر مذہب کے بانی نے اپنی خدمت کو اسی جگہ سے شروع کیا جہاں انبیاء عہد عتیق نے اپنے کام کو چھوڑا تھا۔ یعنی یہودی قوم سے شروع کر کے تمام اقوام عالم تک اور یروشلیم سے شروع کر کے تمام دُنیا کی حدود تک اپنی خدمت کو وسعت دی (لوقا ۲۴: ۴۷) مرکز سے شروع کر کے محیط کی طرف بڑھنا مسیح کا مقصد تھا۔ اسی لئے آپ نے ایک جگہ فرمایا۔ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ (متی ۱۵: ۲۴) یہ ہی تھا مرکز سے شروع کرنا۔ یروشلیم سے شروع کرنا۔ لیکن بعد میں آپ نے فرمایا۔ میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانے (قوم اسرائیل) کی نہیں۔ مجھے اُن کو بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہو گا۔ یہی تھا محیط تک پہنچنا۔ زمین کی انتہا تک گواہ ہونا۔ (یوحنا ۱۰: ۱۶۔ اعمال ۱: ۸) دُنیا کی ہر شے مرکز سے محیط کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور خُداوند مسیح نے بھی اس مقررہ قانون کے مطابق اپنے کام کو مرکز سے آغاز کر کے دائرہ کی طرف بتدریج بڑھایا۔ اور قومی مذہب کو بتدریج عالمگیر مذہب میں منتقل فرمایا۔ اور الہام الہی کی تدریجی کمالیت کے متعلق خط عبرانی کا مصنف یوں فرماتا ہے۔ اگلے زمانے میں خُدا نے باپ دادوں سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے اس زمانے کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا (عبرانیوں ۱: ۲)۔

## عالمگیر مذہب

عالمگیر مذہب وہ ہو سکتا ہے جو جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہو۔ تمام نسلوں اور قوموں کی روحانی اور اخلاقی زندگی پر یکساں طور پر اثر انداز ہو اور جس میں من کل الوجوہ ہو۔ اور بنی نوع انسان کی اخلاقی ضروریات اور روحانی جذبات کی تسکین و سودگی کا ضامن ہو۔ اور کامل تحقیق کے بعد فرد واحد بھی یہ کہنے کی جرات نہ کر سکے کہ اس مذہب میں میری روحانی حوائج و ضرورت کا جواب نہیں ہے۔ ہم مسیحی مذہب کو اس معنی کا عالمگیر مذہب ادلہ یقینیہ و براہین شافیہ قطعاً سے ثابت کریں گے۔ ذراء انصاف پروری اور صدق دلی سے تمام دلائل پر غور فرمائے۔

# عہد جدید کی بنیاد عہد عتیق پر

عہد جدید کی بنیاد عہد عتیق پر رکھی گئی ہے۔ اور نئے عہد کے بانی نے پُرانے عہد کے سلسلے کو توڑا نہیں۔ بلکہ اسی کی بنیاد پر رد سے لگا کر قومی مذہب کی عمارت کو بتدریج تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اور جہاں عہد عتیق کے انبیاء نے اپنا کام چھوڑا تھا۔ خداوند مسیح نے اسی جگہ سے شروع کر کے اُسے قومی دائرہ سے نکال کر بتدریج عمومیت کی طرف ترقی دی۔ اور جو مخالفین مسیحیت ہٹ دھرمی اور تعصب کی سیاہ عینکیں لگا کر اصل حقیقت کو مشکوک نظر سے دیکھتے اور یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ خداوند مسیح نے تورات کو رد اور باطل کر دیا ہے۔ یہ اُن کی خوش فہمی ضد اور محض کوتاہ اندیشی ہے۔ اور حقیقت اس کے برعکس ہے تورات کی خبر ملاحظہ ہو۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں۔ خداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا (یرمیاہ ۳۱: ۳۱) پھر اس آنے والے عہد کی عمومیت کی خبر غور کرو۔ وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہل لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئینگے اور میرا جلال دیکھیں گے۔ (یسعیاہ ۶۶: ۱۸) الفاظ وہ دن آتے ہیں اور وہ وقت آتا ہے قابل غور ہیں۔ اور یہ اُس آنے والے نئے عہد اور اُس کے ہونے والے بانی کے متعلق صریح پیش خبری ہیں۔ خدا کے علم و ارادہ میں تورات کا حد و راج مسیح تک تھا۔ لیکن جب وقت پورا ہو گیا تو خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہوا۔ اور شریعت کے ماتحت پیدا ہوا۔ تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو مول لے اور ہم کو لے پالک ہونے کا درجہ ملے۔ (گلتی ۴: ۴)۔

(۵) اور لازم تھا کہ عہد جدید کا بانی شریعت کے ماتحت پیدا ہو۔ تاکہ شریعت سابقہ کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ جو شریعت موسوی کو کامل کرنے آیا تھا وہ پہلے خود اُس کا پابند ہوا۔ چنانچہ آٹھویں روز اُس کا ختنہ ہوا۔ لوقا ۲: ۲۱ مطابق احبار ۱۲: ۱۳ اور مریم مقدسہ شرع موسوی کے مطابق پاک ہونے کے دن پورے ہونے پر ہیٹل میں قربانی چڑھانے گئی۔ لوقا ۲: ۲۲ - ۲۳ مطابق احبار ۱۲: ۶ - ۸ مسیح نے پستمر بھی لیا۔ متی ۳: ۱۳ - ۱۷ اور ہر سال عیدوں کے لئے یروشلیم کو جایا کرتا تھا۔ لوقا ۲: ۴۱ - ۴۲ مطابق خروج ۳۰: ۱۴، ۱۷ اور ہیٹل کا محصول ادا کرتا تھا۔ متی ۱۷: ۲۴ - ۲۷ مطابق خروج ۳۰: ۱۳ اور یہودی روزہ رکھتے تھے مسیح نے بھی چالیس دن روزہ رکھا۔ متی ۴: ۴ لوقا ۴: ۲ مطابق احبار ۱۶: ۲۹، یسعیاہ ۵۸: ۳ - ۷ آپ نے ایک کوڑھی کو مجزا نہ طور سے شفا دی اور اُسے موسوی دستور کی ہدایت فرمائی۔ متی ۸: ۱ - ۴ مطابق احبار ۱۴: ۱ - ۷ اور آپ نے اپنی خدمت کے آغاز ہی میں فرمایا۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا (کامل) کرنے آیا ہوں۔ متی ۵: ۱۷ چنانچہ آپ نے شریعت دی۔ اُس کی تردید و تنسیخ نہیں بلکہ تکمیل فرمائی اور اُس کو انقیادی خصوصیت سے نکال کر عمومیت میں تبدیل کیا۔ اور تمام اقوام عالم کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت اُس میں پیدا کر دی۔ جس طرح ایک گورنر کا رعب و اقتدار اور حکومت و اختیار صرف ایک ہی صوبہ تک محدود و مختص ہوتا ہے۔ اور اُس کے اپنے صوبہ سے باہر اُس کے احکام و قوانین کچھ اثر نہیں رکھتے۔ اسی طرح موسوی شرائع و احکام کا دائرہ اثر صرف یہودی قوم تک ہی محدود تھا۔ اور یہودیت کے باہر انبیاء کے قوانین اور اُن کی آواز کچھ اثر نہ تھا۔ تعزیرات پاک و ہند کے قوانین و دفعات صرف ان ممالک کی حدود کے اندر ہی زور رکھتے ہیں۔ اور فرانس جرمنی اور امریکہ کے لوگوں سے اُن کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح شریعت موسوی تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کی ہنفسہ کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور خداوند مسیح کی آمد اور ظہور کا سب سے اعلیٰ مقصد یہی تھا کہ مذہب الہی عالمگیر ہو جائے۔ چونکہ خدا تمام دنیا کا واحد مالک اور شہنشاہ ہے اس واسطے مسیح شریعت کو جو مختص بالقوم و الزمان ہونے کے باعث کمزور اور ادھوری تھی کامل کرنے آیا۔ اور فرمایا کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ

پورا (کامل) کرنے آیا ہوں۔ ہم آگے چل کر اچھی طرح دکھائیں گے کہ توریت کی تکمیل مسیح نے کس صورت میں فرمائی۔ اور کس طرح قومی مذہب کو عالمیگر مذہب کی صورت دے دی۔

## توریت کا تجزیہ

توریت کا تجزیہ کیا جائے تو اُس میں تین قسم کے مضامین دستیاب ہوتے ہیں۔ اول۔ احکام۔ دوم۔ اخبار، سوم تعلیم، احکام کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی امر اور نہی امر وہ احکام ہیں جن پر عمل کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔ مثلاً آتو سبت کا دن پاک ماننا۔ تو اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزت کرنا۔ وغیرہ اس قسم کے تمام احکام کو امر کہتے ہیں۔ اور نہی وہ احکام کہلاتے ہیں جن میں کسی کام کے کرنے کی ممانعت پائی جائے۔ مثلاً تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی صورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا۔ اور نہ اُن کی عبادت کرنا۔ وغیرہ اس قسم کے امتناعی احکام کو نواہی کہتے ہیں۔ پھر اخبار تین قسم کی ہیں۔ یعنی حال کی، ماضی کی، اور مستقبل کی۔

**اول۔** اخبار حال وہ ہیں جو موسیٰ اور دیگر انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں واقعات موجودہ اور تجارب مشہودہ کی بنا پر لکھیں۔

**دوم۔** اخبار ماضی جیسے موسیٰ نے دُنیا کی پیدائش۔ آدم کی نافرمانی و استخراج از جنت عدن اور طوفان نوح کے واقعات لکھے۔ اور اُن اخبار سابقہ کو الہام الہی کی روشنی میں قلمبند کیا۔

**سوم۔** اخبار مستقبل۔ جیسے موسیٰ اور اُس کے ماقبل و مابعد کے انبیاء نے خداوند مسیح کے متعلق خبریں دیں۔ یہ خبریں انبیاء خدا سے حاصل کر کے بوساطت الہام لکھتے تھے۔ اور انہیں کو پیشین گوئی کہتے ہیں۔ اوامر و نواہی اور اخبار باقسام ثلاثہ تو تمام صحائف عتیقہ و جدیدہ کو من حیث المجموعہ شامل ہیں۔ یعنی انجیل میں بھی توریت کی طرح موجود ہیں۔ لیکن احکام کی دو اور خاص قسمیں ہیں جو صرف توریت ہی سے متعلق ہیں۔ یعنی:۔ احکام خاص اور احکام عام۔ اب ہم اُن کا مفصل بیان کریں گے۔

## احکام خاص

قربانیاں، ختنہ۔ روزہ، نذریں، طہارت بدنی، سبت، عیدیں اور حلت و خرمت وغیرہ جو سب ہیکل کے ساتھ متعلق تھے۔ اور احکام و قضاة و شاہان نبی اسرائیل کے متعلق سیاسی قوانین و فرائض سب احکام خاص میں شامل ہیں۔ اور شرائع رسمی و ملکی ان ہی سے متعلق تھیں۔ ان کا تعلق صرف قوم اسرائیل کے ساتھ تھا۔ دیگر اقوام میں نہ تو کبھی ان کی تردید کی کوشش کی گئی اور نہ ایسا کرنے کا کوئی حکم ہی تھا۔ احکام خاص اپنی ذات اور مقصد میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت ہی نہ رکھتے تھے۔ ان کا تعلق صرف یہودی مذہب۔ تمدن و معاشرت اور قومیت سے تھا۔ مثلاً عیدیں یہودی تاریخ کے خاص واقعات کی یادگاہیں تھیں۔

یہودیت سے باہر کی دنیا کو اُن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اُس کی تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں۔ مثلاً ایک فوجی آدمی اگر اپنے لباس پر تمنغے لگاتا ہے تو وہ اُس کی جنگی زندگی کے واقعات کی یاد گاریں اور نشانیاں ہیں۔ اگر دوسرے لوگ جن کو محاریہ و مکار برہ سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا اُس فوجی کی دیکھا دیکھی اپنے لباس پر تمنغے لگالیں۔ تو وہ بے مطلب اور بے معنی ہونگے۔ فوجی لوگوں کے چند خاص ظاہری امتیازات ہوتے ہیں۔ جن کے باعث وہ عوام الناس سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور وہ امتیازی علامات اُن ہی کے لئے خاص ہوتی ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے لئے۔ اسی طرح تورات کی رسمی و ملکی شرائع یہودیت کو اُس وقت کی تمام دیگر اقوام سے ممتاز کرتی تھیں۔ اور دوسری وجہ احکام خاص کے نفاذ کی یہ تھی کہ ہاں ظاہری اور جسمانی قوانین کے ذریعے اُن میں الہی متابعت و فرمانبرداری کی رُوح پیدا کی جائے۔ یہ گویا ایک ابتدائی تربیت تھی۔ اور اس تربیت اولہ سے منہائے مقصود یہ تھا کہ اخلاقی و روحانی شریعت کی پابندی کرنا سیکھیں۔ جیسے حروف تہجی بچوں کو محض اس لئے کھائے جاتے ہیں کہ اُن کے ذریعے وہ کسی وقت اعلیٰ علمی کتابیں پڑھ سکیں۔ اسی طرح احکام خاص بھی اُس قوم کے لئے بطور ابتدائی سبق کے تھے۔ اور جب کوئی طالب علم مولوی فاضل بن جاتا ہے تو پھر اُس سے حروف تہجی پر مغز مرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور قاعدہ حروف تہجی کے متروک ہونے سے وہ قاعدہ رد و باطل نہیں ہو جاتا بلکہ جس حد تک پہنچنا اُس کا مقصود تھا اُس تک پہنچ کر اُس کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح احکام خاص اعلیٰ اخلاقی و روحانی شریعت تک پہنچا کر متروک العمل ہو گئے۔ اور پھر پھر کر اُن کی رٹ لگانا ایسا ہی عبث ہے جیسے کوئی مولوی فاضل ہو کر دوبارہ حروف تہجی کی مشق شروع کرے۔ چراغ کی ضرورت اُس وقت تک ہو کر رہتی ہے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو۔ لیکن آفتاب کی آمد سے چراغ رد و باطل نہیں ہو جاتا بلکہ اُس کی ضرورت نہیں رہتی۔ پس سورج کی موجودگی میں مٹی کے چراغ جلانا نادانی ہے۔ اور ہمارے پاس نیوں کا وہ کلام ہے جو زیادہ معتبر ٹھہرا۔ اور تم اچھا کرتے ہو جو یہ سمجھ کر اُس پر غور کرتے ہو کہ وہ ایک چراغ ہے جو اندھیری جگہ میں روشنی بخشتا ہے۔ جب تک پونہ پھٹے اور صبح کا ستارہ تمہارے دلوں میں نہ چمکے۔ (۲- پطرس ۱: ۱۹) اور وہ شرعی زمانہ مذہب الہی کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اور خُداوند مسیح نے اسی کو شباب کے ی عہد تک پہنچایا۔ جب میں بچہ تھا بچوں کی طرح بولتا تھا۔ بچوں کی سی طبیعت تھی۔ بچوں کی سی سمجھ تھی لیکن جب جوان ہوا تو بچپن کی باتیں ترک کر دیں (۱- کرنتھیوں ۱۳: ۱۱) پس شریعت مسیح تک پہنچانے کو ہمارا اُستاد بنی۔ تاکہ ہم ایمان کے سبب راست باز ٹھہریں۔ مگر جب ایمان آچکا تو ہم اُستاد کے ماتحت نہ رہے۔ (گلیتوں ۳: ۲۴-۲۵) اب ذرا تفصیل کے ساتھ دکھایا جائے گا کہ کس طرح احکام خاص کا تکملہ عہد جدید میں آکر ہو گیا۔ اور شرع رسمی میں سے چند بڑی بڑی رسوم کو لے کر انجیل مقدس میں اُن کی تکمیل دکھائی جائے گی۔ یعنی اُس کا آغاز کا انجام دکھایا جائے گا۔ اسی خواب کی تعبیر پیش کی جائے گی۔

## قربانیاں

لفظ قربانی کا مادہ قرب (نزدیکی) ہے۔ یعنی قربانی ایک ایسا شرعی فعل ہے جس کے ذریعے انسان خاطمی۔ عاصی تقریب الہی کو حاصل کر سکے۔ شرع موسوی میں بنی اسرائیل قوم کو قربانی چڑھانے کے خاص احکام تھے۔ اور وہ بموجب فرمان الہی پانچ قسم کی قربانیاں گذرانتے تھے۔ احبار کی کتاب میں اُن کا مفصل بیان مل سکتا ہے۔ واضح ہو کہ انسان اس دُنیا کی کسی بھی شے کا مالک نہیں بلکہ مختار ہے۔ اور خُدا سب دُنیا کا واحد مالک ہے۔ زمین اور اُس کی معموری خُداوند کی ہے۔ جہاں اور اُس کے باشندے بھی (زبور ۲۲: ۱) اور ہزاروں پہاڑوں کے چوپائے میرے ہی ہیں۔ اگر میں بھوکا ہوتا تو تجھ سے نہ کہتا۔ کیونکہ دُنیا اور اُس کی معموری میری ہی ہے (زبور ۵۰: ۱-۱۲) اور انسان کے قبضے میں ان اشیاء کی ذاتوں کے منافع اور فوائد ہی ہیں۔ اور انسان کو یہی

حکم تھا کہ ان جانوروں کی ذاتوں کے فوائد کو قربان کر کے۔ اور چونکہ اُن کی ذات کے فوائد کو قربان کرنے کے لئے اُن کو ذبح کرنا پڑتا تھا۔ اور بغیر ذبح کئے وہ فوائد عقیدت الہی کے مذبح پر قربان نہیں کئے جاسکتے تھے۔ اس واسطے قربانی کے لئے جانور ذبح کئے جاتے تھے۔ اور یہ ایک طرح کا ایثار تھا جو وہ خدا کے حکم کے مطابق اُس کی خوشنودی و رضا جوئی کے لئے کرتے تھے۔ اور اس سے مقصود یہ تھا کہ تقریب الہی کے حصول کی خاطر ان معمولی منافع کو قربان کرتے کرتے اُن میں خدا کی محبت یہاں تک بڑھ جائے کہ کسی وقت وہ اپنی جان بھی اُس کی خاطر قربان کر دینے میں دریغ نہ کریں۔ اور ایک طرف تو خود انکاری و ایثار کی روح اُن میں پیدا ہو جائے۔ دوسری طرف وہ یہ احساس کرنے لگ جائیں کہ خدا کی شریعت کا عدول کرنے سے جو موت اُنہوں نے کمائی وہ جانوروں پر وارد ہو رہی ہے۔ اور خدا ہماری جانوں کو اس قدر عزیز رکھتا ہے کہ ان بیگناہ جانوروں کی جانوں کو ہماری جانوں کا مبادلہ ٹھہراتا ہے۔ تو بھی ممکن نہیں کہ بیلوں اور بکروں کا خون گناہوں کو دور کرے۔ (عبرانیوں ۱۰: ۴)۔ بلکہ وہ قربانیاں سال بہ سال گناہوں کو یاد دلاتی ہیں۔ (عبرانیوں ۱۰: ۳)۔ چونکہ خدا عادل ہے۔ اور عدل کا تقاضا ہے کہ جان کے بدلے جان لی جائے۔ اس لئے عارضی طور پر یہ حیوانی مجازی قربانیاں مسیح کی حقیقی قربانی کے انبیاء کے طور پر قائم رہیں۔ اور جب خداوند مسیح نے حقیقی اور اصلی قربانی دے دی تو اُن مجازی قربانیوں کا رواج اُسی وقت سے بند ہو گیا۔ اور موسوی قربانیاں مسیح کی قربانی کی ایک تمثیل ہی تھیں۔ کیونکہ شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کا عکس ہے اور اُن چیزوں کی اصلی صورت نہیں۔ (عبرانیوں ۱۰: ۱)۔ اگر بالفرض مجال حیوانی قربانی عدل الہی کے تقاضا کو پورا کر سکتی ہے تو سوال لازم آتا ہے کہ قربانی سے عابد کو فائدہ پہنچتا ہے یا معبود کو اور یا مذبح کو؟ اگر کہا جائے کہ عابد کو تو یہ خلاف انصاف ہے۔ کیونکہ مجرم کو فائدہ پہنچاتا عدل نہیں۔ بلکہ از روئے عدل مجرم کو خسارہ کا متحمل ہونا لازمی ہے۔ اور جبکہ گناہ کے باعث مجرم انسان سزائے موت کا مستحق ہے۔ (رومیوں ۶: ۲۳) تو اُس کی جان کا مبادلہ حیوان کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بھی عدل کو پورا نہیں کرتا۔ اور پھر جانور کسری طور پر قربان کیا جاتا ہے۔ اور فعل کسری نہ تو نیک ہو سکتا ہے نہ بد۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک خون کی جان کے عوض میں سرکار کو ایک بکر بائبل پیش کیا جائے۔ اور اگر کہا جائے کہ قربانی سے خدا کو فائدہ پہنچتا ہے تو یہ اُس کی ذات بے نیاز، لا احتیاج کے منافی ہے۔ اُس میں کوئی کمی نہیں۔ وہ غنی ہے اس لئے اُس کو کسی فائدہ کے حصول کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ غنی ہے اس لئے اُس کو کسی فائدہ کے حصول کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ جانور کی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تو یہ خلاف عقل ہے۔ کیونکہ ہلاکت کسی ذی جان کے لئے فائدہ مند ہو نہیں سکتی۔ اور اگر کہا جائے کہ قربانی سے کسی کو بھی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس صورت میں قربانی ایک فضول اور بے بنیاد کام ٹھہرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیوانی قربانی اگر خداوند مسیح کی حقیقی و اخلاقی قربانی کی علامت نہ سمجھ جائے تو وہ ظلم و تشدد کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور خداوند مسیح کی آمد پر قربانیوں کے رواج بند ہو جانے کی خبر خود عہد عتیق میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ اور باسٹھ ہفتوں کے بعد مسیح تفل کیا جائے گا۔ اور وہ ایک ہفتہ کے لئے بہتوں سے عہد قائم کرے گا۔ اور نصف ہفتہ میں ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا۔ (دانی ایل ۹: ۲۶ - ۲۷) جس طرح موسم برسات کی بافراط و بہتات بارشیں فصلوں کو چاہی آپاشی کی طرف سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ اور پھر آپاشی کے محدود انسانی ذرائع بند ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مسیح کی حقیقی اور کامل قربانی کے بعد پھر کسی حیوانی قربانی کی ضرورت نہ رہی۔ جانور کی قربانی کسری اور مجہول ہوتی تھی۔ اور خداوند مسیح کی قربانی اختیاری اور معلوم قربانی ہے۔ آپ کا فرمان ملاحظہ ہو۔

باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ تاکہ اُسے پھر لے لوں۔ کوئی اُسے مجھ سے چھینتا نہیں۔ بلکہ میں اُسے آپ ہی دیتا ہوں۔ مجھے اُس کے دینے کا بھی اختیار ہے۔ اور اُسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا (یوحنا ۱۰: ۱۷ - ۱۸)۔

# ختنہ

ختنہ کا آغاز ابراہام سے ہوا۔ خدا تعالیٰ نے اُس کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ اور ختنہ اُس عہد کے لئے بطور ایک نشان کے ٹھہرایا۔ خداوند نے ابراہام سے فرمایا۔ اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے۔ اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند زینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کو کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہو گا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ (پیدائش ۱۷: ۱۰-۱۱) اور ختنہ کا حکم صرف بنی اسرائیل کے ساتھ ہی خاص تھا۔ ابراہام کی نسل سے باہر کسی اور قوم کو اُس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں۔ بلکہ اقوام کی تفریق تو نوح کے بیٹوں سم۔ حام اور یافث ہی سے ہو جاتی ہے۔ صرف یہودی قوم ہی ابراہام کی نسل تھی۔ اس لئے ختنہ کا حکم صرف اُس کے لئے دیا گیا تھا۔ اور اس رسم کا روحانی مطلب بھی تورات میں بدیں الفاظ موجود ہے۔ اس لئے اپنے دلوں کا ختنہ کرو اور آگے کو گردن کش نہ رہو (استثنا ۱۰: ۱۶) اور خداوند تمہارا خدا تمہارے اور تمہاری اولاد کے دل کا ختنہ کرے گا۔ (استثنا ۱۰: ۳۰، ۶، یرمیاہ ۴: ۴) اگرچہ وعدے کی نسل ہونے کے سبب سے یہودی قوم کے لئے ختنہ لازمی تھا۔ لیکن اگر تمام دنیا کی اقوام کے لئے ختنہ کا حکم خدا یو سے تو وہ روحانی معنی میں ہی ہو سکتا ہے۔ اور ختنہ کا روحانی مفہوم ہی دل کی غلاظت کو کاٹ پھینکنا تھا۔ روحانی مفہوم و مطالب کا محسوسات و جسمانیات کے پیرایہ میں متمثل ہونا کوئی امر جدید اور دور از فہم بات نہیں۔ پولوس رسول فرماتا ہے۔ کیونکہ وہ یہودی نہیں جو ظاہر کا ہے۔ اور نہ وہ ختنہ ہے جو ظاہری و جسمانی ہے۔ بلکہ یہودی وہ ہے جو باطن میں ہے۔ اور ختنہ وہی ہے جو دل کا اور روحانی ہے نہ کہ لفظی (رومیوں ۲: ۲۸) نہ ختنہ کوئی چیز ہے نہ نامختونی بلکہ نئے سرے سے مخلوق ہونا (گلیتوں ۶: ۱۵-۱۔ کرنتھیوں ۷: ۱۹ گلیتوں ۵: ۲-۳ کلیسوں ۲: ۱۱) ختنہ بعض حافتوں میں طبعی لحاظ سے مفید ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی روحانی فائدہ ہر گز نہیں ہو سکتا۔ مختون اور نامختون ہر دو قسم کے لوگ دنیا میں موجود ہیں اور دونوں فریق گناہ کے ماتحت ہیں۔ اگر ختنہ سے روحانی اخلاقی زندگی کی اصلاح و بہبود ممکن ہوتی تو لازم تھا کہ مختون بلحاظ روحانیت و پاکیزگی کے نامختونوں سے بدرجہا افضل ہوتے۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ خداوند مسیح کا ختنہ ابراہام کی نسل ہونے کے سبب ہوا لیکن غیر یہودی چونکہ ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں اس لئے اُن پر ختنہ کروانا لازمی نہیں ہے۔ اسی واسطے مسیحیت کے قیام پر ختنہ موقوف ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ نئے عہد میں پستسمہ کی رسم قائم ہوئی (متی ۲۸: ۱۹)۔

# سبت

آفرینش عالم کے ی عظیم الشان اور لاثانی واقعہ کی یادگار کے طور پر سبت کو مقدس ٹھہرا گیا۔ اُس روز خدا نے تمام بے جان اور جاندار۔ دیدنی اور نادیدنی اشیاء کو بنا کر فراغت پائی (پیدائش ۲: ۳) اور خدا نے سبت کا دن شریعت میں دو جہات کے ماتحت شامل کیا۔

**اول** سبت کو آفرینش عالم کی یادگار ٹھہرانے اور شریعت میں داخل کرنے سے خُدا کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ مابعد زمانوں میں اس دُنیا

کی علتِ فاعلی کسی وہی ہستی کو نہ ماننے لگ جائیں۔ اور خیالاتِ باطلہ و توہماتِ مظنونہ میں نہ پھنس جائیں۔ بلکہ جب سبت کو منائیں تو یہ یاد کریں کہ یہ وہ دن ہے۔ جس میں خُدا نے تخلیقِ عالم سے فراغت پائی تھی۔ ایمان ہی سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ تمام عالم خُدا کے کہنے سے ہے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو۔ (عبرانیوں ۱۱: ۲)۔

**دوم**۔ سبت کے دن کو مقدس ٹھہرانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ قوم اسرائیل دُنوی دھندوں اور فکروں والی لٹھیڑوں میں یہاں تک نہ

پھنس جائے کہ خُدا کی یاد ہی بسر جائے۔ اس واسطے مصلحتاً پابندی اور عبودیت کی رُوح اُن میں پیدا کرنے کے لئے یہ خاص دن اُن کے واسطے جسمانی دھندوں سے فراغت پانے اور عبادت میں صرف کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ لیکن جو شخص سیدھی اور صاف نیت سے خُدا کی عبارت نہیں کرتا اُس کے لئے سبت اور باقی سب دن برابر ہیں۔ یہودیوں میں سبت کے متعلق ایسی سوء عقیدت پیدا ہو گئی کہ وہ اُس روز میں نیکی کرنا بھی گناہ سمجھنے لگے۔ اسی واسطے خُداوند مسیح نے بارہا اُن کے اس غلط خیال کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور ایک دفعہ فرمایا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ آیا سبت کے دن نیکی کرنی روا ہے یا بدی کرنا؟ جان کو بچانا یا ہلاک کرنا۔ (لوقا ۶: ۹) اور جب آپ نے اُس مریض کو تندرست کر دیا تو وہ آپ سے باہر ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم یسوع کے ساتھ کیا کریں؟ (آیت ۱۱) ایک اور موقع پر مسیح نے سبت کے روز ایک کبڑی عورت کو جو ۱۸ برس سے کسی بدروح کے باعث مریض تھی شفا بخشی تو عبادت خانے کا سردار ناراض ہو کر کہنے لگا۔ چھ دن ہیں جن میں کام کرنا چاہئے۔ پس اُن ہی میں آکر شفا پاؤں کہ سبت کے دن۔ (لوقا ۱۳: ۱۴) وہ سبت کیے روز سوئی تک کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کی سوء عقیدت اور فضول نمائش کو مٹانے کے لئے مسیح کے زندہ ہو کر صعود فرمانے کے بعد رسولی عدہ میں سبت کی جگہ ہفتے کا پہلا دن (اتوار) مقرر ہوا۔ اور جس طرح سبت آفرینش عالم کے عدیم النظیر واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح ہفتے کا پہلا دن مسیح کے گناہ موت اور قبر پر فوق الفطرت طاقت سے غالب آنے کی فقید المثل واقعہ کی یادگار ٹھہرا۔ سبت وہ دن ہے جو تمام دنیا میں زندگی کا مبداء سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اُس روز خُدا تعالیٰ نے قالبِ گیتی میں رُوح پھونکنے کے کام کو تمام کیا۔ اور ہفتے کا پہلا دن وہ ہے جس میں انسان بلکہ تمام مخلوقات کو گناہ موت اور بطالت و فنا کے قبضہ سے چھڑا کر کھوئی ہوئی زندگی کو پھر سے سجال کیا گیا۔ (رومیوں ۸: ۲۰-۲۱) اور خُداوند مسیح خُدی فرمایا۔ سبت آدمی کے واسطے بنا ہے ز آدمی سبت کے واسطے۔ پس ابنِ ادم سبت کا بھی مالک ہے (مرقس ۲: ۲۷-۲۸) اور صرف سبت کے روز ہی عبادت کو کافی نہیں ٹھہرتا بلکہ فرمایا۔ ہر وقت دُعائے مانگتے رہنا اور ہمت زبانی چاہئے۔ لوقا ۱۸: ۱ اور ہر وقت اور ہر طرح سے رُوح میں دُعائے اور منت کرتے رہو۔ اور اسی غرض سے جاگتے رہو کہ سب مقدسوں کے واسطے بلاناغہ دُعائے مانگا کرو (افیسوں ۶: ۱۸) اگر اب کوئی سبت کے دن کو دُنیا کی تخلیق کی یادگار سمجھ کر اُس کی تعظیم کرے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ پر یہودیوں کی طرح اُس کی سطحی و ظاہری پابندی جس میں نیکی کرنا بھی گناہ میں داخل ہے سراسر معیوب ہے۔ اس لئے سبت تمام عالم کا دستور العمل ہونے کے ناقابل ہے۔ اسی لئے پولوس رسول فرماتا ہے۔ پس کھانے پینے یا عید یا نئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں۔ (کلیسیوں ۲: ۱۶، گلتیوں ۳: ۹-۱۰) خُداوند مسیح نے سارے دن پاک رکھنے اور اُن میں عبادت کرنے کی تاکید فرمائی۔ پس سبت کی کوئی خصوصیت نہ رہی۔

# ظاہری طہارت

شریعت موسوی میں بدنی طہارت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (گنتی ۱۹: ۷-۲۲) اور اس ظاہری و جسمانی طہارت سے منشاء الہی یہ تھا کہ وہ لوگ باطنی اور روحانی پاکیزگی کے طالب ہوں۔ اور اُس کے لئے کوشش کریں۔ اگرچہ جسمانی صفائی، تندستی و صحت کے زایہ نگاہ سے نہایت ضروری و لازمی ہے۔ اور ایسی صفائی سے خُدا نارواض نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی خوش ہوتا ہے۔ تاہم روحانی زندگی کے ارتقاء میں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ باطنی پاکیزگی وہ ہے جس کے لئے داود نبی خُدا سے یوں التجا کرتا ہے۔

اے خُدا! میرے اندر پاک دل پیدا کر اور میرے بدن میں از سر تو مستقیم رُوح ڈال۔ (زبور ۵۱: ۱۰) اگرچہ ہندو لوگ تیر تھوں پر جا کر باطنی پاکیزگی کی بے کار اور موہوم اُمید پر اِشنان وغیرہ کرتے ہیں۔ تو بھی تیر تھ اِشنان کرنے والوں اور نہ کرنیوالوں میں بلحاظ پاکیزگی کوئی ماہہ الاتیاز نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر دو قسم کے لوگ گناہ کی غلامی میں خوب پھنسے ہوئے ہیں۔ کمنیوں تک ہاتھ دھونے، وضو کرنے۔ اور اِشنان کرنے سے باطنی طہارت ناممکن ہے۔ اسی واسطے ظاہر دار فقیہ و فریسی خُداوند مسیح کے سامنے اُس کے شاگردوں کی بوں شکایت کرنے آئے کہ۔ تیرے شاگرد بزرگوں کی روایت کو کیوں نال دیتے ہیں کہ روٹی کھاتے وقت ہاتھ نہیں دھوتے۔ (متی ۱۵: ۲) تو خُداوند مسیح انہیں یوں جواب دیا کہ۔ جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے۔ (آیت ۱۱) اور شاگردوں کی فرمائش پر اپنے جواب کی یوں تفصیل فرمائی جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا اور پاخانے میں نکل جاتا ہے۔ مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ برے خیال، خون ریزیاں، زنا کاریاں حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ مگر بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا۔ (متی ۱۵: ۱۷-۲۰، مرقس ۷: ۱۷-۲۲) اور فقہیوں اور فریسیوں! تم پر افسوس ہے کہ پیالے اور ربانی کو اوپر سے صاف کرتے ہو۔ مگر وہ اندر بوت اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں (متی ۲۳: ۲۵-۲۸) تمام اناجیل باطنی طہارت اور اندرونی پاکیزگی کی تعلیم و تلقین سے ملو ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہیں تو زیادہ حق ہو گا کہ مسیح کی تعلیم کا تہا تر مقصد مدعا ہی باطنی پاکیزگی تھا۔ پس مسیح کی کامل شریعت کی آمد سے تو ریت کی ظاہری اور اُدھوری شریعت خود بخود متروک ہو گئی۔ اور جس اعلیٰ مقصد کی انجام دہی کے لئے خُدا نے وہ ابتدائی اور ناکامل شریعت دی تھی اُس نے مسیح کی مال واکمل شریعت کے ذریعے تکمیل پائی۔ اور وہ مختص بالقوم و زمان شرع (احکام خاص) عالمگیر اور ابدی و دائمی شرع کی آمد پر متروک العمل ہو گئی۔ کیونکہ وہ صرف کھانے پینے اور طرح طرح کے غسلوں کی بناء پر جسمانی احکام ہیں جو اصلاح کے وقت تک مقرر کئے ہیں۔ عبرانیوں ۹: ۱۰ خُداوند مسیح کی کامل شریعت کا حکم طہارت باطنی کے متعلق ملاحظہ ہو۔ پس اے عزیزو! چونکہ ہم سے ایسے وعدے کئے گئے۔ تو آؤ۔ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی اور روحانی آلودگی سے پاک کریں۔ اور خُدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں۔ (۲۔ کرنتھیوں ۷: ۱)۔

# حَدِّتِ و حُرْمَتِ

توریت میں بعض اشیاء کھانے پینے کے لحاظ سے حلال اور بعض حرام ٹھہرائی گئی تھیں۔ (استثنا ۱۴: ۳-۲۱) امور معاشرت میں حلال و حرام اور پاک و ناپاک کے متعلق او مروا ہی خدا نے دو اعلیٰ روحانی مقاصد کے تحت فرمائے۔ اول یہ کہ وہ منازل جسمانیہ سے شروع کر کے بتدریج منازل روحانیہ کی طرف قدم اٹھائیں۔ ادنیٰ سے آغاز کر کے اعلیٰ کی طرف بڑھنا سیکھیں۔ اور جسم سے شروع کر کے روح کی طرف بڑھیں۔ حرام کارو روحانی مفہوم گناہ اور حلال کارو روحانی مطلب نیکی و پاکیزگی ہے۔ بدی سے نفرت رکھو نیکی سے لپٹے رہو۔ (رومیوں ۱۲: ۹) دوم یہ کہ خدا کی برگزیدہ قوم اور غیر اقوام میں امتیاز نظر آئے۔ اور رفتہ رفتہ روحانی و اخلاقی امتیاز جسمانی اور معاشرت امتیازات کی جگہ لے لے۔ اور کسی وقت وہ روحانی امتیاز خصوصیت کی قیود سے نکل کر عمومیت میں منتقل ہو جائے۔ تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔ تاکہ لوگ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں۔ (متی ۵: ۱۶) بے ایمانوں کے ساتھ ناہموار جوئے ہیں نہ جتو۔ کیونکہ راستبازی اور بے دینی میں کیا میل جول؟ یاروشنی و تاریکی میں کیا شراکت؟ مسیح کو بلی یعل کے ساتھ کیا موافقت؟ یا ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا۔ اور خدا کے مقدس کو بتوں سے کیا مناسبت ہے؟ (۲- کرنتھیوں ۶: ۱۴-۱۶) یہ امتیاز تھا جو اُس معاشرتی و جسمانی امتیازات کی جگہ لینے والا تھا۔ اسی واسطے جلت و حرمت کے قومی اور زمانی احکام کا باطنی اور روحانی مفہوم خداوند مسیح نے یوں ظاہر فرمایا۔ جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے۔ (متی ۱۵: ۱۱) مقدس پطرس رسول نے بھی توریت کے حکم کے مطابق خدا کی اُناری ہوئی چیزوں میں حلال و حرام کا امتیاز ظاہر کیا تھا۔ لیکن خدا نے فرمایا۔ کہ جن کو خدا نے پاک ٹھہرایا ہے تو انہیں حرام نہ کہہ۔ (اعمال ۱: ۱۱-۱۵)۔ قابل غور امر یہ ہے کہ جب خدا خود پاک ہے تو اُس نے ناپاک چیزیں کیسے پیدا کر دیں؟ کیا کبھی سورج سے تاریکی برآمد ہو سکتی ہے؟ ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں لہذا جب خدا پاک ہے تو اُس نے کوئی شے بذاتہ ناپاک پیدا نہیں کی۔ اور حلت و حرمت کے احکام کا نفاذ محض فرمانبرداری اور پابندی کی روح بنی اسرائیل میں پیدا کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ مقدس پولوس رسول فرماتا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے۔ (۱- تمثیلیں ۴: ۴) کوئی بذاتہ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔ (رومیوں ۱۴: ۱۴) پھر فرماتا ہے۔ کھانا ہمیں خدا سے نہیں ملایا گا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں۔ (۱- کرنتھیوں ۸: ۸) کیونکہ خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے۔ (رومیوں ۱۴: ۱۷) البتہ اگر ہمارے کھانے پینے سے کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہو تو اس نیت سے کہ کسی کو ٹھو کر نہ لگے اور محبت کا قاعدہ نہ ٹوٹے احتیاط لازمی ہے۔ (رومیوں ۱۴: ۱۵) ۱- کرنتھیوں ۸: ۱۳) کیونکہ ساری شریعت پر ایک ہی بات سے پورا عمل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے کہ تُو نے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ (گلنتیوں ۵: ۱۴)۔

## روزہ

جس روحانی مقصد سے روز کا حکم قوم یہود کو دیا گیا وہ بہت گہرا تھا۔ اس میں ایک تو عابد کے جسمانی ایثار کی علامت پائی جاتی ہے۔ کہ عابد اپنے معبود حقیقی کے عشق و محبت میں یہاں تک محو ہو جائے کہ کوئی جسمانی فکر اُس کی اس عقیدت و محبت پر غالب نہ آسکے۔ بلکہ اگر اُس کو اپنی تمام لذایذ و حظا یظ نفسانی اور آرائش وزینائش جسمانی اپنے محبوب حقیقی کی قربان گاہ عقیدت و محبت پر نثار کرنی پڑھائیں تو مطلق دریغ نہ کرے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگ جائے

کہ آدمی صرف روٹی سے جیتا نہیں رہتا۔ بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴: ۴) دوم یہ کہ بعض دفعہ عابد اپنے معبود کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کوئی گناہ کر کے اُس کی ناراضگی کو محسوس کرتا ہے۔ اور اُس کی ناراضگی کے باعث طبیعت میں بے چینی۔ اضطراب اور قلق اس درجہ بڑھ جاتا ہے۔ کہ کھانا پینا قدرتی طور پر اچھا نہیں لگتا۔ اور انسان خورد و نوش اور آسائش و زیبائش کو یکسر ترک کر کے سوگوار حالت میں بیٹھتا ہے۔ جیسے داود نبی سے جب خلاف مرضی خدا گناہ سرزد ہوا اور اُس نے خدا کی ناراضگی کو محسوس کیا تو نہایت غمگین اور بے چین ہو کر روزہ رکھا اور تخت کو چھوڑ کر ٹاٹ اوڑھا اور فرض پڑھا۔ (۲۔ سموایل ۱۲: ۱۶-۱۷) یوناہ (۵: ۳) سوم۔ حضرت ابوالبشر (آدم) کے گناہ میں گر جانے کے باعث تمام بنی آدم مورثی ناپاکی میں مبتلا ہیں۔ اور گناہ تمام دنیا پر مرض کی طرح غالب ہے۔ اور اس مرض نے زندگی کے شیریں چشمہ کو کڑوا کر دیا ہے۔ اور انسان اپنی ذاتی کوشش و تدبیر سے پاک بننے میں قطعی قاصر ہے۔ اس واسطے جب تک اُن کے اس مرض روحانی کا کوئی حکیم و شافی ظاہر نہ ہو تب تک مریضان گناہ کا غمگین حالت میں رہنا اور روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اور مرض کی حالت میں ویسے بھی کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ اور خداوند تعالیٰ نے زکریاہ نبی کی معرفت گویا مرض گناہ کے حکیم حاذق خداوند مسیح کی خبر دی اور فرمایا۔ کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہوداہ کے لئے خوشی اور خرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہوگا (زکریاہ ۸: ۱۹) اور یوحنا کے شاگرد اور فریسی جو روزہ کے بڑے پابند تھے مسیح کے شاگردوں کی شکایت کرنے لگے کہ وہ روزہ کیوں نہیں رکھتے؟ خداوند مسیح نے انہیں جواب دیا کہ۔ کیا برائی جب تک ڈولھان کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں؟ (مرقس ۲: ۱۹) گویا مسیح کی آمد سے مریضان گناہ کے دلوں میں ایک زبردست اُمید اس بات کی جھلک رہی تھی کہ اب غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے گناہوں کو مٹانے والا ظاہر ہو گیا ہے۔ اب کیوں مایوس رہیں۔ یسوع نے سُن کر اُن سے کہا تندرستوں کو حکیم درکار نہیں۔ بلکہ بیماروں کو میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں (مرقس ۲: ۱۷) یہودی لوگ دیگر دینی رسوم کی طرح روزہ کی رسم پر بھی ظاہر داری اور ریاکاری کی رنگ آمیزی کو چکے تھے۔ اس لئے خدا نے انہیں یوں ملامت کی۔ اور روزہ کی اصل غایت کو اُن پر بدیں الفاظ ظاہر فرمایا۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن ہاں اُس میں آدمی اپنی جان کو دیکھ دے۔ اور اپنے سر کو جھاو کی طرح جھکائے۔ اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے؟ کیا تو اس کو روزہ اور ایسا دن کہیگا جو خداوند کا مقبول ہو؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کھولیں۔ اور مظلموں کو آزاد کریں۔ بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں؟ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسیکنوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اُسے پہنائے۔ اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے (یسعیاہ ۵۸: ۵-۷) اور خداوند مسیح نے بھی فرمایا۔ اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ۔ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پانچکے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو۔ تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔۔۔ (متی ۶: ۱۶-۱۸) انجیل مقدس میں روزہ کے متعلق نہ تو تاکید ہے اور نہ امتناع بلکہ عابد کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ جب ایسے حالات پیش آئیں جن سے روزہ کی نوبت پہنچے تو روزہ رکھے۔ اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے پر کسی خاص دن یا مہینہ یا موسم کی تخصیص کی کوئی ہدایت نہیں اور نہ ہوتی چاہئے۔ روزہ ایمانداروں کی تمام زندگی پر حادی ہے۔ پس نئے عہد کی کامل شریعت میں آکر روزہ لازمی حکم نہ رہا اختیاری امر ہو گیا۔

## عیدیں

یہودیوں کے لئے تین عیدیں مقرر تھیں۔ تو سال بھر میں تین بار میرے لئے عہد منانا (خروج ۲۳: ۱۴) اور یہ عیدیں اُن کی گذشتہ تاریخ کے واقعات کی یادگاریں تھیں۔

✚ پہلی عید فصح تھی جو مارچ یا اپریل میں ہوتی تھی۔ یہ بنی اسرائیل کے مصر کی غلامی سے چھٹکارے کی یادگات تھی۔ اس موقع پر بھنا ہوا گوشت بے خمیر روٹی اور کڑوی ترکاری کے ساتھ کھانے کے حکم تھا (خروج ۱۲: ۸) اس کے بعد ہی مسات روز تک خمیر کو گھروں سے جدا کرنے کا حکم تھا۔ اسی واسطے اس کو عید فطیر بھی کہا گیا۔ کڑوی ترکاری کھانے سے مراد یہ تھی کہ جب جب یہ عید منائی جائے مصر کے گذشتہ دکھوں کو یاد کیا جائے۔ اور خمیر کو جدا کرنے سے مراد تھی کہ گناہ و شرارت کو اپنے دلوں سے نکالیں۔ عین اُس وقت جبکہ عید فصح کا موقع تھا خداوند مسیح نے اپنی جان تمام جہان کے اسیران گناہ کی خاطر دے کر انہیں شیطان اور گناہ کی شیدید غلامی سے آزاد فرمایا۔ (عبرانیوں ۲: ۱۴ - ۱۵) اور یہودی عید فصح کا تکملہ مسیح کی قربانی میں ہو گیا۔ اور کڑوی ترکاری کھانے کی رسم اور بھنا ہوا گوشت کھانے میں مسیح کے صلیبی دکھوں اور اُس کے جسمانی و روحانی صدمات کی پیشین گوئی موجود ہے۔ پھر اُس نے روٹی لی اور شکر کر کے توڑی اور یہ کہہ کر اُن کو دی کہ یہ میرا بدن ہے۔ جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو۔ اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ میرے اُس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے۔ (لوقا ۲۲: ۱۹ - ۲۰)۔ جس طرح فصح کی عید یہود کے لئے مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی یادگاری تھی۔ اُسی طرح پاک عشاء قربانی کی رسم ابلیس و گناہ کی غلامی سے چھٹکارے کی ابدی اور دائمی یادگار ٹھہری مقدس پولوس رسول فرماتا ہے۔ پرانا خمیر نکال کر اپنے آپ کو پاک کر لو۔ تاکہ تازہ گندھا ہوا آٹا بن جاو۔ چنانچہ تم بے خمیر ہو۔ کیونکہ ہمارا بھی فصح یعنی مسیح قربان ہوا۔ پس آو عید کریں نہ پرانے خمیر سے اور نہ بدی و شرارت کے خمیر سے بالکل صاف دلی اور سچائی کی بے خمیر روٹی سے (۱۔ کرنتھیوں ۵: ۷ - ۸) اور یوں ہو مختص بالتقوم و زمان یادگار ایک عالمگیر اور دائمی روحانی عید میں منتقل ہو گئی۔

✚ عید پنتی کوست یا ہفتوں کی عید۔ یہ عید مصر کی غلامی سے چھٹکارے کے پچاسویں دن قائم ہوئی۔ ماہ مئی یا جون کے درمیان میں ہوتی تھی۔ یہ ایک طرف مصر سے آزادی کی اور دوسری طرف شریعت الہی کے دئے جانے کی یادگاری تھی۔ اس میں یہودی لوگ اپنے گھروں اور جو کے پہلے پھل خُدا کی لئے نذر کرتے تھے۔ یہ عید روح ہے وہاں آزادی ہے۔ (۲۔ کرنتھیوں ۳: ۱۷) چنانچہ خُداوند مسیح کے صعود کے دس روز بعد روح القدس اسی عید کے موقع پر نازل ہوا تھا۔ اور روحانی معنی میں پہلے پھل وہ تین ہزار مرد تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خُدا کے نذر کر دیا (اعمال ۲: ۴۱) انجیل میں اپنی شخصیت کو نذر کرنے کا حکم ہے (رومیوں ۱۲: ۱؛ کلیسیوں ۱: ۱۳؛ عبرانیوں ۱۳: ۱۵) عید پنتی کوست کا تکملہ روح القدس کے نزول پر ہو گیا اور روح القدس اُن پر آگ کی پھٹی ہوئی زبانوں کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ غیر زبانیں بولنے لگے۔ ہر ایک اپنے اپنے ملک کی بولی وہاں سنتا تھا۔ یہ گویا الہی اشارہ تھا کہ خُدا کا مذہب قومی دائرہ سے نکل کر تمام اہل لغت کا دستور العمل بن جائے۔ اور پاک صحائف کے تراجم تمام دُنیا کی زبانوں میں ہو جائیں۔ تاکہ سب قومیں بلا امتیاز و خصوصیت اُن سے فائز المرام ہو سکیں۔ اور مذہب الہی تمام دُنیا کا مذہب ہو جائے۔

✚ عید خیام یہ عید قوم یہود کی غریب الوطنی اور دشت نوردی کی یادگار تھی۔ ستمبر یا اکتوبر میں ہوتی تھی۔ اُن کی مسافرت کے ایام اور خمیوں کی سکونت کے دوران میں فیوض الہی و برکات سماوی کے نزول کی یادگار تھی۔ آخر اُن کی دشت گردی اور بادیہ پیمائی ملک کنعان کی مستقل سکونت پر منتج ہوئی۔ اگرچہ اُن کی مسافرت کا نشانہ ملک کنعان تھا۔ مگر حقیقت میں وہ ایک بہتر۔ یعنی آسمانی ملک کے مشتاق تھے۔ (عبرانیوں

۱۱ : ۱۶) اور تمام ایمانداروں بندوں کا بھی وہی نصبت العین ہے۔ مقدس پولوس رسول فرماتا ہے۔ جب تک ہم بدن کے وطن میں ہیں خداوند کے ہاں سے جلا وطن ہیں۔ (۱۔ کرنتھیوں ۵ : ۶)۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیے کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا۔ تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنایا ہوا گھر نہیں۔ بلکہ ابدی ہے (۲۔ کرنتھیوں ۵ : ۱) اور اسی آسمانی وطن کی بابت خداوند مسیح نے فرمایا۔ میرے باپ کے گھر میں بہت سے مکان ہیں۔ کیونکہ میں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے جگہ تیار کروں (یوحنا ۱۴ : ۲) مقدس پطرس رسول فرماتا ہے اپنے آپ کو پر دیسی اور املا فرجان کر اُن جسمانی خواہشوں سے پرہیز کرو جو روح سے لڑائی دیکھتی ہیں (۱۔ پطرس ۲ : ۱۱) ان تین بڑی عیدوں کے علاوہ دو اور چھوٹی عیدیں بھی تھیں۔ یعنی عید پوریم اور عید تجدید۔ لیکن یہ خدا کی مقرر کردہ نہ تھیں۔ بلکہ ایک ملکہ آستر کے زمانے میں اور دوسری یہوداہ مکابی کے وقت میں یہودیوں نے خود مقرر کر لی تھیں۔ ان دونوں موخراند کر عیدوں کا یروشلیم کی ہیکل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ سب عیدیں جن واقعات کی یادگاریں تھیں وہ صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق تھے۔ اور تمام دنیا کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے وہ تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کے قابل نہ تھیں۔ اس لئے وقت پورا ہونے اور اپنے حد رواج کے اختتام پر وہ بند ہو گئیں۔ اور ہیکل کے بغیر اُن پر عمل کرنا ہی ناممکن تھا۔ اس لئے جب ہیکل نہ رہی تو عیدیں کیسے وہ سکتی تھیں۔ خداوند مسیح کی قربانی اور محبت کا تعلق تمام دنیا کے ساتھ ہے (انجیل یوحنا ۳ : ۱۶، خط ۱، یوحنا ۲ : ۲) لہذا اُس کے متعلق تمام واقعات کا تعلق عام طور پر تمام افراد عالم کے ساتھ ہے۔

## طریق عبادت

ہم پیچھے کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ یہودی مذہب کا مرکز ہیکل تھی۔ جس میں اُن کی تمام مذہبی رسوم اور عبادت قومی صورت میں انجام پاتی تھیں۔ اور خدا کا یہ حکم تھا کہ اگر تم غیر معبودوں اور بتوں کی پرستش کرو گے اور نیک نیتی سے میری عبادت بجا نہ لاو گے۔ تو میں اس ہیکل کو گرا دوں گا اور تمہیں اس زمین سے نکال دوں گا۔ (۱۔ سلاطین ۶ : ۹-۹) اور اس انتظام سے اُن کے اندر عبادت الہی کی خالص رُوح پیدا کرنا مقصود تھا۔ اور جب وہ خدا کی خالص عبادت کے کھنڈرات پر بت پرستی کی عمارت اٹھانے لگے۔ اور غیر معبودوں ک طرف مائل ہوئے۔ تو خدا نے بھی انہیں ترک کر دیا۔ اور ایک بت پرست کسدی بادشاہ نبوکدنظیر کے ذریعے اسری ہو کر بابل لے جانے گئے۔ اور مقدس ہیکل بھی برباد کی گئی (یرمیاہ ۵۲ : ۱۳) ایماندار یہودی اُس غریب الوطنی اور اسیری کے زمانہ میں بھی خدا کو نہ بھولے اور کثرتین مرتبہ دن میں یروشلیم کی طرف رخ کر کے نماز کیا کرتے تھے۔ اور جب دانی ایل نے معلوم کیا کہ اُس نوشتہ پر دستخط ہو گئے۔ تو اپنے گھر میں آیا۔ اور اپنی کوٹھڑی کا درپچہ جو یروشلیم کی طرف تھا کھول کر دن میں تین مرتبہ حسب معمول گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور دعا اور اُس کی شکر گزاری کرتا رہا۔ (دانی ایل ۶ : ۱۰-۱۰، سلاطین ۸ : ۳۸) اس بیان سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہیکل کے رخ پر تین دفعہ دن میں نماز پڑھتے تھے۔ اور بانی اسلام نے رخ کعبہ پر نماز گزارنا یہودیوں سے سیکھا۔ اور کئی ماہ تک بیت المقدس (ہیکل) کے رخ پر نماز ادا کرتے اور کرواتے رہے۔ اور یہودی کی نماز عبرانی زبان میں ہوتی تھی۔ اہل اسلام بھی عربی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ اس سے اسلام کا ایک قومی مذہب ہونا ظاہر ہے۔ بھلا اہل عرب تو اپنی ملکی زبان عربی میں نماز پڑھیں۔ دیگر ممالک کے مسلمان تو عربی نہیں ہیں۔ اُن پر عربی زبان کی قید لگانا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ کیا خدا سوائے عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا؟ مسیحیت کی عمومیت اور عالمگیری کی یہ کیسی بین دلیل

ہے کہ مسیحی ہر زبان میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور تہاؤنیا کی زبانوں میں انجیل کا رواج پایا جاتا ہے۔ یہ صرف مقدان آخاند کی کوئی اپنی ایجاد کردہ تجویز نہ تھی جس پر انہوں نے عمل کر لیا۔ بلکہ رُوح القدس کے ہدایت کے ماتحت انجیل مقدس کے دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے کئے گئے (اعمال ۲: ۳-۸) اور زبان کی تخصیص کسی مذہب کے عالمگیر ہونے کی محدود مانع ہے۔ اسی واسطے مقدس پولوس رسول بیگانی زبان میں دُعامانگنے اور کلام کرنے و معیوب ٹھہراتا ہے۔ (۱- کرنتھیوں ۱۴: ۱-۲۳) یہودی ہیكل کے رُخ پر نماز پڑھتے تھے اور اہل اسلام کعبہ کے رُخ پر۔ لیکن خُداوند مسیح نے تخصیص جہت و سمت کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ جس میں ظاہر داری کا بھی امکان نہیں رہتا۔ (ملاحظہ ہو متی ۶: ۵-۶) یعنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے پوشیدگی میں دُعامانگنے کا حکم دیا۔ شریعت موسوی پر عمل درآمد کے لئے ہیكل کا وجود لازمی تھا۔ اور بغیر ہیكل کے یہودی مذہب ایک قالب بے جان کی مثال تھا۔ خُداوند مسیح چونکہ عالمگیر مذہب کا بانی ہو کر آیا تھا۔ اس لئے جب ایک دفعہ اُس کے شاگردوں نے ہیكل کی زیارت کے لئے اُس سے سوال کیا تو اُس نے فرمایا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہیگا جو گرایا نہ جائے۔ (متی ۲۴: ۲) اور پھر سامری عورت نے آپ سے کہا کہ۔ ہمارے باپ دادوں نے اس پہاڑ پر پرستش کی۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ جگہ جہاں پرستش کرنی چاہئے یروشلیم میں ہے۔ یسوع نے اُس سے کہا اے عورت میری بات کا یقین کر کہ وہ وقت آتا ہے کہ تم نہ تو اس پہاڑ پر باپ کی پرستش کرو گے اور نہ یروشلیم میں۔۔۔ مگر وہ وقت آتا ہے بلکہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار باپ کی پرستش رُوح اور سچائی سے کریں گے۔ (یوحنا ۴: ۲۰-۲۳) اور ایمانداروں کے دلوں کو خُدا کا مقدس (ہیکل) کہا گیا۔ (۱- کرنتھیوں ۳: ۱۶-۱۷) اور آپ کے قول کے مطابق ہیكل سلیمانی ۷۰ عیسوی میں برباد ہو گئی اور مذہب الہی خصوصیت کی قیود سے آزاد ہو گیا تاکہ کل رُخ نیا کا دستور العمل بن سکے۔

ہم بالتفصیل دکھا چکے کہ کس طرح اور کن معنوں میں خُداوند مسیح نے شریعت موسوی کی تکمیل فرمائی۔ اور احکام خاص کس طرح اور کیوں متروک العمل ہو گئے۔ رد نہیں کئے گئے بلکہ اُن کی ضرورت نہ رہی۔ شباب کی آمد سے طفلی رد نہیں ہو جاتی بلکہ شباب کی کمالیت میں گم ہو جاتی ہے۔ جب بنیاد پر ردے لگا کر عمارت کو انجام تک پہنچایا جاتا ہے تو بنیاد رد نہیں ہو جاتی بلکہ چھپ جاتی ہے۔ توریث کی ناکامل شریعت مسیح کی کامل شریعت (یعقوب ۱: ۲۵) کی آمد پر رد و باطل نہیں ہوتی بلکہ اُس کی کمالیت میں چھپ گئی۔ اس واسطے کامل اور عالمگیر شریعت کے رواج پانے سے موسوی ناکمل شریعت ایسے ہی غائب ہو گئی جیسے آفتاب کے طلوع ہونے پر چراغ گل کر دیا جاتا ہے۔ خُداوند مسیح نے شرع الہی کے حقیقی اور باطنی معنوں کی روشن کر دیا۔ اور اُس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونک کر اور اُس کے حجاب خصوصیت کو اُتار کر عمومیت کے وسیع میدان میں بے نقاب کر کے اور تمام دُنیا کے لئے نور ہدایت بنا کر دکھ دیا ہے۔ اب اس متروک شدہ شرع موسوی احکام خاص پر عمل کرنے کے خلاف انجیل مقدس کی تعلیم ملاحظہ ہو۔ مگر اب جو تم نے خُدا کو پہچانا۔ بلکہ خُدا نے تم کو پہچانا تو اُن ضعیف اور نکمی ابتدائی باتوں کی طرف کس طرح پھر رجوع ہوتے ہو جن ک دوبارہ غلامی کرنا چاہتے ہو۔ تم دنوں اور مہینوں اور مقررہ وقتوں اور برسوں کو مانتے ہو۔ (گلیتوں ۴: ۹-۱۰) پس کھانے پینے یا عید یا کئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں (کلیسوں ۲: ۱۶-۱۷) جب تم مسیح کے ساتھ دُنوی ابتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ آدمیوں کے حکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو۔ کہ اسے نہ چھو نا اُسے نہ چکھنا اور اُسے ہاتھ نہ لگانا (کلیسوں ۲: ۲-۲۱) اور اُس عالمگیر نئے عہد کی آمد اور اُس کی شرع کامل کے رواج پانے پر نہ یونانی رہانہ یہودی۔ نہ ختنہ نہ ناخنوںی نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے (کلیسوں ۳: ۱۱) جیسے ایک معمار جب امکان کی محراب بناتا ہے اور اُس کے نیچے اینٹوں کا ایک عارضی سہارا لگاتا ہے اور جو نہی وہ محراب پختہ ہو جاتی ہے وہ ماتحت قالب کو گرا دیتا ہے۔ اسی طرح توریث کے احکام خاص کامل مذہب اور کامل شریعت کے قیام پر متروک العمل ہو گئے۔

# احکام عام

اخلاقی شریعت کے احکام عشرہ جو خدا نے موسیٰ کو لکھے لکھائے سوئے (خروج ۳۱: ۱۸) انہیں کو احکام عام کہا جاتا ہے۔ اور یہ احکام ہیں جو ہر زمانے میں متبوع اور مطالعہ ہے اور رہیں گے۔ یہ احکام خاص کامرکز اور روح رواں تھے۔ اور ان میں تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح انسان کی جسمانی زندگی کے لئے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ طبعی و فطری سامان کافی ودانی ہیں۔ اسی طرح ہماری روحانی اور مجلسی زندگی کے لئے یہ احکام نہایت ضروری اور مفید ہیں۔ ان احکام کا بیان (خروج ۲۰: ۱-۱۷) اور مفصل تشریح (احبار باب ۱۹) میں موجود ہے۔ اور خداوند مسیح نے ان کا خلاصہ بدیں الفاظ پیش کیا ہے۔ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔ (متی ۲۲: ۳۷-۴۰) جیسے توریت کے احکام خاص ظاہر بات سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح احکام عام انسان کی باطنی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مسیح کی تمام تعلیم باطنیت سے متعلق ہے۔ تمام ماموران ربانی اور داعیان حقانی ایک ہی قومی مرکز کے گرد چکر لگاتے رہے۔ اور اپنی قومی حدود سے نہ تو وہ خود آگے بڑھے اور نہ ہی انہیں خدا کی طرف سے ایسا اختیار ہی دیا گیا تھا۔ لیکن عہد جدید کے بانی و مبدانے تمام دنیا کو اپنا دائرہ عمل بنایا۔ اور توریت کے قومی مذہب کی معیاد کو یوحنا تک محدود ٹھہرایا۔ کیونکہ سب نبیوں اور توریت نے یوحنا تک نبوت کی (متی ۱۱: ۱۳) شریعت اور انبیاء یوحنا تک رہے اُس وقت سے خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ (لوقا ۱۶: ۱۹) اور شریعت اخلاقی (احکام عام) کے متعلق فرمایا۔ آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطے کے مٹ جانے سے آسان ہے۔ (لوقا ۱۶: ۱۷، متی ۵: ۱۸-۱۹) اور جس طرح ایک گورنر کے اختیارات کا زور صرف ایک ہی صوبے تک محدود ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیائے توریت کا اختیار اور منصب قوم یہود سے باہر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا ان کا یہ سلسلہ یوحنا اصططاطیٰ علیہ السلام کی ایک اسی خصوصیت سے چلا آیا۔ ایک شہنشاہ کے اختیارات ایک گورنر کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہیں۔ چنانچہ اسی طرح عالمگیر عہد کے بانی کے اختیارات اور ذاتی قابلیت انبیاء عہد عتیق سے بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ اور درحقیقت ایسا ہی ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو تمام انبیاء سابقہ سے بہر صورت افضل ظاہر کیا۔ مثلاً یہاں وہ ہے جو یونس سے بھی بڑا ہے۔ (متی ۱۲: ۴۱) یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے (آیت ۴۲) داود سے بڑا ہونا (متی ۲۲: ۴۲-۴۵) یہاں وہ ہے جو ہیکل سے بھی بڑا ہے (متی ۱۲: ۶) بیشتر اس سے کہ ابراہام پیدا ہوا میں ہوں۔ (یوحنا ۸: ۵۸) موسیٰ پر فضیلت (عبرانیوں ۳: ۳-۶) فی الحال ہم مسیح کے فضائل کے متعلق ان چند امثلہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ کسی مناسب مقام پر مفصل بیان کریں گے۔

واضح ہو کہ خداوند مسیح نے اپنی مختصر سی زمینی زندگی میں عالمگیر مذہب کی صرف بنیاد ہی رکھی۔ اور جس طرح توریت کا زمانہ مذہب کی ابتدائی حالت کا زمانہ تھا۔ اسی طرح مسیح کا زمانہ مذہب الہی کی وسطی حالت کا زمانہ تھا۔ اور جس طرح توریت کے تمام انبیاء مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عالمگیر وسعت کی خبر دے گئے تھے، اسی طرح خداوند مسیح بھی اپنے بعد ایک دوسرے مددگار کے نزول و ظہور کی خبر دے گئے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔۔۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۵، ۲۶) اور مذہب الہی کو انتہائی کمالیت تک پہنچانا روح القدس کا کام تھا۔ جس کا خداوند مسیح نے وعدہ فرمایا تھا۔ مذہب کی ارتقائی حیثیت سے توریت کا زمانہ ابتدائی مسیح کی زمینی زندگی کا زمانہ وسطی۔ اور روح

القدس کا زمانہ انتہائی کمالیت کا زمانہ ہے۔ خداوند نے اپنی زمینی زندگی میں عالمگیر مذہب کی صرف بنیادیں رکھیں۔ اور کسی قدر خصوصیت سے نکال کر عموماً میں بدل دیا۔ مثلاً یہودی قوم تمام دیگر غیر اقوام کا ناخنوں بے دین۔ لامذہب اور گمراہ سمجھ کر اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ اور بالخصوص یہودی لوگ سامریوں سے بہت زیادہ متنفر تھے۔ اور اُنہیں حقیر اور ناچیز جانتے تھے۔ مگر مسیح نے سامریوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا۔ اور اُن کی قدر کی یہود کو اُن کی ظاہری داری۔ خود پرستی اور تعصب پر بارہا ملامت کی۔ ایک رحم دل سامری کی تعریف کی اور مغرور کاہن اور خود سر لادی کو ملامت کی (لوقا ۱۰: ۲۵-۳۷) پھر ایک دفعہ دس کوڑھی آپ سے شفا پا کر گئے۔ اُن میں سے ایک نے جو سامری تھا لوٹ کر خداوند کی شکر گزاری کی۔ آپ نے اُس کے ایمان کی تعریف کی (لوقا ۱۷: ۱۵-۱۹)۔ ایک دفعہ جب سامریوں نے آپ کو اپنے گاؤں میں نکلنے نہ دیا اور شاگردوں کا پارہ طیش بہت چڑھ گیا اور اُس گاؤں پر آسمان سے آگ برسانا چاہتے تھے تو آپ نے شاگردوں کو جھڑکا اور فرمایا ابن آدم لوگوں کی جان برباد کرنے نہیں بلکہ بچانے آیا ہے۔ (لوقا ۹: ۵۱-۵۶) اور پھر یوحنا ۴: ۷-۲۶ میں سامری عورت کا مشہور قصہ سب جانتے ہیں۔ کہ مسیح نے کیسے محبت سے اُس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ اور سُورینیکی عورت جو غیر قوم تھی مسیح کے پاس آئی۔ آپ نے اُس کی مراد کو پورا کرنے کے علاوہ اُس کے ایمان کی تعریف کی (متی ۱۵: ۲۱-۲۸) اور ایک دفعہ جب ایک غیر قوم صوبہ دار کے نوکر کو آپ نے شفا دی تو اُس صوبہ دار کے ایمان کی بدیں الفاظ تعریف کی۔ میں نے ایسا ایمان اسرائیلی میں بھی نہیں پایا (لوقا ۷: ۹) اور آپ نے ایک جگہ جو انگوری باغ کے ٹھیکداروں کی تمثیل کہی ہے۔ اُس میں باغ سے مراد یہودی قوم اور ٹھیکداروں سے مراد اُس کے رہبر اور کرتادھر تالیقی فقہیہ اور فریسی۔ اور باغ کو اُن ٹھیکداروں سے چھین کر اوروں کو دے دینے مراد غیر اقوام کو دینے سے ہے۔ یہ مذہب کی عالمگیر ہی کی ایک تمثیلی پیشین گوئی تھی۔ (لوقا ۲۰: ۹-۱۸، متی ۲۱: ۳۳-۴۵) پھر آسمان کی بادشاہت کو رانی کے دانہ اور خمیر سے تشبیہ دے کر مسیحیت کی عموماً و ہمگیری کی خبر دی (متی ۱۳: ۳۱-۳۳) غیر ضحیکہ مسیح نے ہر پہلو اور ہر صورت سے شریعت کو کامل کیا۔ اور عالمگیر مذہب کی بنیادیں پختہ کر کے اُن پر عملی طور سے کام بھی کیا۔ اگرچہ اس عظیم مہم کی راہ میں حاسد اور مخالف طاقتیں دیوار بن کر حائل ہوئیں۔ مگر آپ کے عدم آہنی نے اپنی مقدس خدمت کے لے اس خادزار میں رستہ تلاش کر ہی لیا۔ اور بے پناہ نفرت کے جنوبی دھارے جو یہود کے اعصاب میں تیر رہے تھے۔ اور مخالف و منافرت کا مہیب سمندر جو اُن کے اعماق قلب میں طوفان خیز تھا آپ کے لئے پائے استقلال کو مثل نہ کر سکا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ آپ کی شدید مصیبت مظلومیت اور موت میں اپنے سارہ اقبال کی فال نکالتے تھے۔ اور اُس نور کے سامنے اپنی پوشیدہ ذلتوں کو مجبور مصائب و نقائص کو بے نقاب دیکھ کر اُس کو بچھا دینے کے ہر وقت درپے رہتے تھے۔ اور اپنی ان کمروہ مساعی میں کامیاب بھ ہوئے لیکن پھر بھی جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوا۔ اُس نئے عہد کے بانی کو نئے عہد کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنی جان دینی پڑی۔ اس لئے پہلا عہد بھی بغیر خون کے نہیں باندھا گیا۔ (عمرانی ۹: ۱۸) مطابق خروج ۲۴: ۱۸) ذر شریعت موسوی کی تکمیل کا تمام تردد رمدار آپ کی پاک اور بے عیب عالمگیر قربانی پر تھا۔ اسی واسطے آپ مذہب الہی کو عالمگیر کی انتہائی حدود تک اپنی زمینی زندگی میں پہنچانہ سکے۔ بلکہ انتہائی کمالیت کی ابتداء آپ کی موت قیامت اور صعود کے بعد ہوئی۔ کیونکہ آپ کی قربانی کے بغیر شریعت عتیقہ کامل نہ ہو سکتی تھی۔ اور وہ آپ کی صلیب پر کامل ہوئی۔ اور آپ نے کہا۔ پورا ہوا۔ اور سر جھکا کر جان دے دی۔ (یوحنا ۹: ۳۰) اور قبر دعوت پر کامل فتح پا کر اپنے حواریوں کو یہ وصیت کی کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اور اُنہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اور اُنہیں یہ تعلیم دو کہ اب سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا۔ دیکھو میں زمانے کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں (متی ۲۸: ۱۸-۲۰) اور اُس نے اُن سے کہا کہ تم تمام دیان میں جا کر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔ جو ایمان لائے اور بپتسمہ لے وہ نجات پائے گا۔ اور جو ایمان نہ لائے وہ مجرم ٹھہرا یا جائے گا (مرقس ۱۶: ۱۵-۱۶) اور اُن سے کہا یوں لکھا ہے کہ مسیح

دُکھ اُٹھائے گا۔ اور تیسرے دن مردوں میں سے جی اُٹھیگا۔ اور یروشلیم سے شروع کر کے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے گی (لوقا ۲۴: ۲۶-۲۸)۔

# رُوح القدس کا نزول اور مذہب الہی کی انتہائی کمالیت

ہم پیچھے دکھا چکے کہ عہد عتیق نے مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عمومیت کی خبریں دیں چنانچہ وقت پورا ہونے پر خُداوند مسیح آیا۔ اور اُس نے اُسی مذہب کی ابتدائی حالت سے اُٹھا کر وسطیٰ حالت تک پہنچایا۔ اور اپنی جان تمام جہان کے گناہوں کے لئے دے کر شریعت کی تکمیل فرمائی۔ لیکن دُنیا کی حدود تک اُس مذہب کو وسعت نہ دے سکے۔ بلکہ آپ نے بھی اپنے ایک اور قائم مقام یعنی رُوح القدس کے نزول کی خبر اپنے شاگردوں کو دی۔ اور مذہب کو وسطیٰ حالت سے نکال کر انتہائی کمالیت تک پہنچانا اپنے ہونے والے قائم مقام کے لئے چھوڑ گئے۔ اور زندہ ہو کر اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کی۔ اور دیکھو جس کامیرے باپ نے وعدہ کیا ہے میں اُس کو تم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالم بالا سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو۔ (لوقا ۲۴: ۴۹) اور قبر سے زندہ ہو کر چالیس دن تک اُن پر طرح بہ طرح ظاہر ہوتے رہے۔ لیکن صعود فرمانے سے پہلے پھر اُسی خبر کو دہرایا۔ لیکن جب رُوح القدس تم کو قوت پاوے گا۔ اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہوئے (اعمال ۱: ۸) آپ کے ان الفاظ سے خوب روشن ہے کہ آپ نے مذہب الہی کی ہمہ گیر وسعت کو رُوح القدس کے نزول کے ساتھ مشروط ٹھہرایا۔ اور حسب وعدہ اپنے صعود کے دس روز بعد ہی رُوح القدس کو اُن پر عیدِ بنتی کو ست کا دن آیا تو وہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ کہ یکایک آسمان سے ایسی آیا جیسے زور کی آمدھی کا سناٹا ہوتا ہے۔ اُس سے سارا گھر جہا وہ بیٹھے تھے گونج گیا۔ اور اُنہیں آگ کے شعلے کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں دکھائی دیں اور اُن میں سے ہر ایک پر آٹھہریں۔ اور وہ سب رُوح القدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں بولنے لگے۔ جس طرح رُوح نے انہیں بولنے کی طاقت بخشی (اعمال ۲: ۱-۴) اور دیگر غیر مسیحی لوگوں نے جو لاکھوں کی تعداد میں اُس وقت وہاں عید کے لئے جمع تھے یہ تمام ماجرا دیکھا۔ اور سب حیران اور متعجب ہو کر کہنے لگے۔ دیکھو یہ بولنے والے کیا سب گلیلی نہیں؟ پھر کیونکر ہم سے ہر ایک اپنے اپنے وطن کی بولی سنتا ہے؟ (اعمال ۲: ۷-۸) اور رُوح القدس نے نازل ہو کر اُسی وقت لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسیح پر ایمان لے آئی۔ پس جن لوگوں نے اُس کا کلام قبول کیا انہوں نے پستسمہ لیا اور اُسی روز تین ہزار آدمیوں کے قریب اُن میں ہل گئے۔ (اعمال ۲: ۴۱) اور مقلدان مسیح کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ مگر کلام کے سننے والوں میں سے بہترے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ مردوں (عورتوں کا شمار شامل نہیں) کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہو گئی (اعمال ۴: ۴) اور رُوح القدس نے جو اُن کو ملک ملک کی غیر زبانیں بولنے کی قوت بخشی۔ تو یہ گویا خُدا کا ایک صاف و صریح اشارہ اس امر کا تھا کہ کلام مقدس کے ترجمے دُنیا کی تمام زبانوں میں کر دئے جائیں تاکہ کوئی بشر خُدا کی رُوحانی برکتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ خُدا کی اسی ہدایت کے ماتحت مسیح کی شمع عشق کے پروانوں کے انجیل جلیل کے ترجمے دُنیا کی ہر زبان میں کر دئے۔ اور یسعیاہ نبی کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ۔ وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہل لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئیں گے اور میرا جلال دیکھیں گے (یسعیاہ ۶۶: ۱۸) اور جس طرح یہودیوں نے خُداوند مسیح کو دُکھ دیا اور ستایا تھا اُسی طرح اب اُس کے شاگردوں کو ستانے لگے۔ اُن کو قیدوں میں ڈالنے اور طرح طرح سے ایذا کیں

دینے لگے۔ تاکہ وہ مسیح کے نام کی منادی بند کر دیں۔ لیکن مسیح کی محبت کا شعلہ اُن کے دل کے مذبح پر اور بھی تیزی سے جلنے لگا۔ اور سب سے پہلے مسیح کے خادم سنٹنس نے جام شہادت نوش کیا۔ تاہم خُدا کا کلام پھیلتا رہا۔ اور یروشلیم میں شاگردوں کا شمار بہت ہی بڑھتا گیا۔ اور کاہنوں کا بڑا گروہ اس دین کے تحت میں ہو گیا (اعمال ۷: ۶) اور وہ ہیکل میں اور گھروں میں ہر روز سکھانے اور اس بات کی خوشخبری دینے سے کہ یسوع ہی مسیح ہے باز نہ آئے۔ (اعمال ۵: ۴۲)۔

## مسیحیت غیر اقوام میں

آخر وہ وقت آ گیا کہ یروشلیم سے شروع کر کے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے (لوقا ۲۴: ۴۷)۔ چنانچہ شاگردوں نے یروشلیم میں اپنی خدمت کو شروع کیا۔ اور رُوح القدس کی طاقت سے معمور ہو کر بہت کامیابی حاصل کی۔ اب وہ یروشلیم سے باہر نکلتے ہیں۔ سامریہ میں جاتا ہے اور سامری لوگ اُس کے کلام سے بہرہ مند و زہوتے ہیں (اعمال ۸: ۴-۸) پطرس بھی غیر قوموں میں منادی کرنے لگا اور اُن پر رُوح القدس نازل ہوا (اعمال ۱۰: ۴۵) اور اُنہوں نے پستہ لیا۔ (آیت ۴۸) مگر جب رسولوں نے غیر اقوام کی طرف رخ کیا اور انہیں خُدا کی بادشاہت کشادہ دلی سے شامل کرنے لگے تو یہودی مسیحی اُن پر اعتراض کرنے لگے اور اُن میں بڑی بحث ہوئی (اعمال ۱۱: ۱-۲) اور پطرس نے دُن کو یوں جواب دیا۔ پس جب خُدا نے اُن کو بھی وہی نعمت دی جو ہم کو خُداوند یسوع مسیح پر ایمان لا کر ملی تھی تو میں کون تھا کہ خُدا کو روک سکتا۔ وہ یہ سُن کر چپ رہے اور خُدا کی بڑائی کر کے کہا۔ تو بے شک خُدا نے غیر قوموں کو بھی زندگی کے لئے توبہ کی توفیق دی ہے (اعمال ۱۱: ۱۷-۱۸) اور جب یہودیوں کی مخالفت و محاصرت اور بغض و حسد کا یہاں لبریز ہو کر چھلکنے لگا تو پولوس اور برنابا لبر ہو کر بولے۔ کہ ضرور تھا خُدا کا کلام پہلے تمہیں سُنایا جائے۔ لیکن چونکہ تم اُسے رد کرتے ہو اور اپنے آپ کو ہمیشہ کی زندگی کے ناقابل ٹھہراتے ہو۔ تو دیکھ ہم غیر قوموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں (اعمال ۱۳: ۴۶) چنانچہ اُس وقت سے رسول دلیرانہ طور پر غیر اقوام میں مسیح ک گواہی دینے لگے اور پولوس رسول اپنے آپ کو غیر قوموں کا رسول کہتا ہے (اعمال ۱۸: ۶، رومیوں ۱۱: ۱۳، گنتی ۲: ۸-۹، افسوس ۴: ۸، ۱) اور خُداوند مسیح کا وہ قول پورا ہو کہ۔۔۔ جب رُوح القدس تم پر نازل ہو گا تو تم قوت پاؤ گے۔ اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گئے۔

(اعمال ۱: ۸) اور مذہب الہی کی ہمہ گیر وسعت اور انتہائی کمالیت کا زمانہ رُوح القدس کے نزول سے لے کر قیامت کے دن تک وسیع ہے۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی سے لے کر آج تک جو عالمیگر ترقی مسیحیت نے کی ہے وہ کسی منطقی دلیل سے ثابت کئے جانے کی محتاج نہیں۔ عیاں راجح بیاں۔ قالب دُنیا کے اعضائے رئیسہ اسی کے حلقہ بگوش ہیں۔ علمی، عقلی، مذہبی اور مالی ہر قسم کی ترقی بھی اُنہی کے ہاتھوں کو چوم رہی ہے۔ اور ہر ملک و قوم میں مسیح کے گواہ تمام زبانوں میں انجیل مقدس کا اشتہار نہ لے رہے ہیں۔ خُداوند تعالیٰ نے اپنے مذہب کی حقانیت اور صداقت کو تمام زوئے زمین پر پھیلانے کے لئے اپنی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ سے ذرائع وہ وسائل بھی ایسے زبردست مہیا کر دے ہیں کہ اُس کی نشر و اشاعت باآسانی تمام ہو سکے۔ مثلاً اُس نے اپنے خادموں کو پریس اور مطابع ایجاد کرنے کی حکمت بخشی۔ تاکہ وہ انجیل کو ہر زبان میں بہ تعداد کثیر تھوڑے عرصہ میں چھاپ کر تیار کریں۔ اور موٹر وریل گاڑی اور ہوائی جہاز اور بحری جہاز و تار برقی کے ذریعے انجیل مقدس دُنیا کے ہر حصے میں پہنچا سکیں۔ ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں، اور پریس کی اختراع کچھ ایسے خُداداد عجیب و غریب سامان ہیں کہ جن سے بڑھ کر انجیل کی ترویج و توسیع اشاعت کے معاون بننے محال ہیں۔ ریڈیو کی دریافت نے

مبشران کلام کے حوصلوں کی اور بھی بلند کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ ذرائع جو مسیحیت کی ترویج اور تشہیر عامہ کے لئے خدا تعالیٰ کی حکمت و دانش پر دلالت کرتے ہیں۔ آج اقوام عالم اور ادیان دہر تمام امور میں مسیحیت کی تقلید پر جھکے ہوئے ہیں۔ اگرچہ زبان سے مسیح اور مسیحیت کو طعن و دشنام کرتے ہیں مگر باطن میں اُس کی تاثیر سحرِ تخمیر کو خوب محسوس کرتے ہیں۔ اور مسیحیت کے آفتابِ صداقت کے سامنے تمام دیگر مذاہب کے چراغ گل ہوئے جاتے ہیں اور وہ وقت آنے والا ہے کہ سب اپنے اپنے مدہم عارضی چراغوں کو پھونک مار کے کربھجادیں گے۔ اور مسیحیت کے نیورخشاں کی ضیاءباریوں سے بہرہوں گے۔ اور خداوند مسیح کو جو تمام دُنیا کے پیر طریقت میں اپنے دلوں کے سرسیر آفرمائیں گے۔ تاکہ یسوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا لگے۔ خواہ آسمانیوں کو خواہ زمینوں کا۔ خواہ اُن کا جو زمین کے نیچے ہیں۔ اور خدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خداوند ہے۔ (فلپیوں ۲: ۱۰-۱۱)۔

## مسیحیت ہند میں

اس وقت متعدد مذاہب پاکستان ہندوستان میں نظر آتے ہیں۔ اور روز بروز بہت سے مذہبی فرقے برپا ہوتے جاتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں مذاہب اور ہر فرقہ یہی دعوے کرتا ہے کہ وہ واحد عالمگیر الہی مذہب ہے اور دوسرے مذاہب باطل اور انسانی اختراع ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب خدا واحد مسلم ہے تو وہ ایک ہی خدا تھے متناقض و متضاد مکاشفے کیسے دے سکتا ہے؟ اگر تمام مذہبی کتابیں الہامی مان لی جائیں تو مانا پڑے گا۔ کہ اُن سب کا الہام خدا کی طرف سے نہیں ہوا۔ اور تعجب انگیز امر یہ بھی ہے کہ عام طور پر مسیحیت کے باہر تمام مذاہب امور معاشرت کو بھی مذہب کا جز بنائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ کھانا پینا۔ پہننا اور چند امتیازی علامتیں رکھنا مناسب جسمانی باتیں ہیں۔ آج جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کی عالمگیری کے دعویدار ہیں۔ وہ محض مسیحیت کی تقلید پر خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ اور عالمگیر مذہب جیسا ہم ثابت کر چکے مسیحیت سے باہر اور کوئی نہیں۔ انجیل ہی کے آفتاب فیضان صداقت کی ضیاءباریوں سے دختر کشی۔ رسم متی۔ اور غلامی نسواں ویردہ فروشی کی ستم رانیوں کو سرسیر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔ اور وہی رسوم بوجوہ کو تاہی نظر و فکر وار خست و انقباض طابع مجموعہ عند الخواص ناباعث صدا افتخار و مہابت اور موجب حسنت سمجھی جاتی تھیں۔ آج مسیحیت خواص عجیبہ اور تاثیرات غریبہ کے طفیل معیوب و مذموم سمجھی جاتی ہیں۔ اگر تم تھا تو اس قدر کہ آہنسا پر مودھرما کے خیالات مروج تھے۔ اور اگر ظلم تھا تو اس انتہا کا کہ سستی اور دختر کشی کی قبیح رسوم کو ثواب عظیم سمجھا جاتا تھا۔ اور رحم و قہر کی ضدین پر بطور افراط و تفریط عمل درآمد ہوتا تھا۔ مسیحیت نے ہر شعبہ انسانیت میں من کل الوجود اعتدال و میانہ روی کی عملی صورت میں رواج دیا۔ راجہ رام موہن رائے جب یونانی و عبرانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیرامپور گئے تو وہاں ولیم کیمری صاحب نے سستی کی رسم کے خلاف اُن کو ابھارا اور آخر کار اُن دونوں کی کوشش سے سرکار اس رسم کے خلاف قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوئی۔ اور ولیم کیمری صاحب کے تبلیغی اثر سے سرکار ہند نے ہندوستان کی قبیح رسوم کو مثلاً دختر کشی وغیرہ کو قانوناً بند کیا۔ جس طرح مکان کے اندر چراغ کے داخل ہونے سے چھت کے جالے۔ دیواروں کی گرد آلودگی و گندگی شہتیروں کی بوسیدگی اور فرش کی ناہمواری و غلاظت صاف نظر آتی اور صاحب خانہ کو اپنے مکان کی ایسی ردی حالت سے نفرت و کراہیت پیدا ہو کر اُس کی قطع و بُرید اور صفائی کا فوری خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مسیحیت جو ایک چراغ معرفت الہی اور مفارق سفیدی و سیاہی ہے۔ جب ظلمت کو ہند میں داخل ہوا تو ہر مذہب کو اپنے اپنے معائب و نقائص صاف نظر آنے لگے۔ اور اُس چراغ معرفت و حقیقت اور شمع فیضان صداقت کی آمد سے ہر کسی کو اپنے اپنے گھر کی پڑگئی۔ اور مسیحیت کے اخلاق فاضلہ اور شمائلِ حسنہ کی روشنی میں ہر مذہب و ملیت نے اپنے اپنے مذہبی عقائد و رسوم اور اخلاق و آداب کی کتر پیونت اور نئی نئی تاویلیں و تشریحیں کر کے مسیحیت کے سانچے میں

ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور تمام ہندوستان میں سوشل ریفرمیشن کے آثار نظر آنے لگے۔ اور مسیحیت نے نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے خاستگان کو گل و گلزار بنایا بلکہ ہمہ اقوام عالم میں باوجود انتہائی مشکلات کے اپنی ترویج و اشاعت کے لئے میدان تلاش کر لئے۔ اس وقت انجیل مقدس کے تراجم قریب نو صد (۹۰۰) زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور یہ ترجمے و تفسیریں دوسری صدی عیسوی سے ہی ہوتے آئے ہیں کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ آج مسیحیت کی تقلید برقرآن شریف بھی چند زبانوں میں چھپنے لگا ہے تاکہ مسیحیت کی طرح اپنی عالمگیری کا دعوے کر سکے۔ اور ویدہ وغیرہ اول تو جرمنی علماء کی جاز کا ہیوں اور ویدہ ریزیوں سے انگریزی اور چند دیگر زبانوں میں نظر آئے۔ اور اب چند مشرقی زبانوں میں بھی ملبس نظر آنے لگے ہیں۔ یہ سب مسیحیت کی خوش چینیوں کے نتائج ہیں۔ آج سے پیشتر کبھی دیدوں نے سوائے سنسکرت کے کسی اور زبان کا منہ بھی دیکھا؟ کبھی یادنی اقوام میں اُن کی منادی کی گئی؟ اور اچھوتوں کی وید کے واعظ ہونے کا حق دیا گیا؟ ہر گز نہیں۔ بلکہ اُن کو وید سنا ناگناہ کبیرہ سمجھا گیا۔ آج کیوں اچھوتوں کو وید پڑھنے سے منع نہیں کیا جاتا؟ آج کیوں گھر گھر میں وید پڑھے ہیں؟ آج کیوں شدھی سنگٹھن قائم ہیں؟ صرف مسیحیت کی نظر فیض اثرک نتائج ہیں۔ مسیحیت بغیر کسی سیاسی غرض کے صرف خُداوند مسیح کے ارشاد فیض بنیاد کی تعمیل کی خاطر اچھوت و پسماندہ اقوام کو وقت قابلیت اور سم و زر خرچ کر کے اپنے میں ملا کر اونچ نیچ کے مذموم امتیازات کو علام رہی ہے۔ ہندو مسلم اقوام دو بڑے درخت ہیں۔ اور پسماندہ گروہ چھوٹی کمزور پود جو اُن کے سایہ میں صدیوں رہ کر نشوونما پانے کے قابل رہی مسیحیت اس کمزور اور نیم جان یود کو اُن کے نیچے سے اُکھاڑا اُکھاڑ کر علیحدہ لگاتی اور تعلیم و تہذیب کے پانی سے سیرتی ہے۔ تاکہ وہ بھی اُن تناور درختوں کی طرح پرورش پائے سر بلند سرفراز ہو جائے۔ انجیل تمام اقوام عالم کو ایک دوسرے کے بھائی اور ایک ہی نسل و خاندان کے آدمی بیان کرتی ہے۔ اور اُس (خُدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی۔ (اعمال ۱۷: ۲۶؛ کلمیسوں ۳: ۱۱؛ گلٹیوں ۳: ۲۷-۲۸) اور مسیحیت ہی واحد عالمگیر مذہب ہے۔ اور تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کی کامل اور اکمل۔ قابلیت و صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کھانے پینے پہننے کے متعلق کوئی قید نہیں لگاتا۔ ذات پات کے منافرت و مخاصمت کے برخلاف سخت امتناعی احکام لگاتا ہے۔ مسیحیت ایک خورشید رخششاں ہے اور تمام دیگر مذاہب ستارے۔ مسیحیت ایک بحر بیکراں ہے اور تمام دیگر مذاہب ندی نالے۔ آخر ان سب ندی نالوں اور دریاوں اور نہروں کو اسی ایک سمندر (مسیحیت) میں آکر گرنے ہے۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا (یوحنا ۱۰: ۱۶؛ فلپیوں ۲: ۱۰-۱۱، افسیوں ۱: ۱۰؛ متی ۲۸: ۱۸-۱۹؛ اعمال ۴: ۱۲)۔

## لوگ مذہب سے کیوں بسزا رہیں

آج کل لاکھوں مذہب سے بیزا نظر آتے ہیں اور ایسے حضرات تمام خرابیوں کی جڑ مذہب کو قرار دیتے ہیں۔ اور مذہب کی جان کا فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اس بیجا نیت کی اولیت کا سہرا بالخصوص اُن سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں کے سر ہے جنہوں نے اس بیسویں صدی کے آغاز سے آج تک جنم لیا ہے۔ اور بالعموم ہندو مذہب کی ناستک تعلیمات کے سر ہے۔ جس نے لوگوں کو خُدا اور مذہب کی طرف سے لاپرواہ کر دیا ہے۔ اور تیسری و چوتھی صدی سے بیزاری کی مغربی خیالات و نظریات کی ہند ترویج ہے۔ مذہب تو انسانی فطرت کا ایک جزو غیر منفک ہے۔ اور اُس سے پیچھا چھڑانا فطرۃ کے خلاف جہاد ہے۔ البتہ یہ بات سو فیصدی درست ہے کہ نقلی مذاہب جو لوگوں کے خود ساختہ ضرور موجود انحطاط و تخریب کے ذمہ دار ہیں۔ اور اُن کا استیصال ہی تعصب۔ مخاصمت و منافرت۔ حسد و کینہ اور خود غرضی کے وجود کے لئے جو اس وقت انسانیت کے شر ائین میں خون حیات بن کر تیر رہے ہیں موت کا

پیغام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اقداسے پہلے نقلی واصلی مذاہب کی تحقیق ضروری ہے۔ ہم آگے چل کر مناسب مقام پر اس موضوع کو چھیڑیں گے۔ فی الحال انسان کی مذاہبی بیزاری کے موجبات کا سراغ لگانا! نسب اور ضروری ہے۔

## وجہ اول

لوگ چاہتے ہیں کہ خدا ہماری حسب منشاء ہو۔ جو ہم چاہیں وہ فوراً گرے۔ اور جدھر چاہیں اُسے پھیر لیں۔ وہ ہماری جائز و ناجائز خواہشات کے پورا کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کرے۔ اگر آدھے لوگ چاہیں کہ بارش نہ ہو اور آدھے چاہیں کہ بارش ہو تو خدا اُن واحد میں ان دونوں کی خواہش کو پورا کرے۔ لوگوں نے خدا کو لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر سمجھ رکھا ہے۔ جس کا انتخاب رائے عامہ پر منحصر ہے۔ اور جس کی عبادت مشروط اس بات سے ہے کہ پہلے وہ اُن کی ہر طرح کی نیک و بد خواہشات کو بلا حیل و حجت پورا کرے۔ چونکہ حرص و ہاکے بندوں کی نفسانی خواہشات کا جواب خدا کی طرف سے دیا نہیں جاتا۔ اس لئے وہ جھٹ ایسے ایک طرفہ خدا سے منکر ہو کے کسی ایسے نئے خدا کو ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہر وقت اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرے۔

## وجہ دوم

مذہب کی پابندی نفسانیت اور دُنیا داری سے روکتی ہے۔ (متی ۱۰: ۳۷-۳۸) اور ایک ہی وقت میں انسان خدا اور دولت دُنیا کو کبھی پیار نہیں کر سکتا۔ (متی ۶: ۲۴) اور بنی آدم کا دل اُن میں بدی پر بشتد مائل ہے۔ (واعظ ۸: ۱۱) چونکہ مذہب کی پیروی میں رخارف دُنیا اور حیفہ جہان کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ اور لوگ اس وقت اس دلفریب و دلآویز دُنیا کے تیر نگاہ کے زخم خوردہ ہیں۔ اور مذہب کی بُنیاد پر دولت پرستی۔ اقبال؛ و کامرانی، نفسانیت و عشرت پرستی اور حکومت و سیاست کی نظر فریب عمارتیں اٹھا چکے ہیں۔ اور ان دلکش مگر فانی عمارتوں کو ڈھانا اور مذہب کی محبت کو دل میں بٹھانا اُن کے لئے جوئے شیر کے لانے سے زیادہ محال معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کو اپنی نفسانی خواہشات کی راہ میں سد سکندری سمجھ کر اُسے اٹھا پھینکنا چاہتے ہیں۔ مذہب اور نفسانیت دو متضاد اشیاء ہیں۔ اور ایک ہی وقت میں ایک شخص ان دونوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جسم رُوح کے خلاف خواہش کرتا ہے۔ اور رُوح جسم کے خلاف اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ تاکہ جو تم چاہتے ہو وہ نہ کرو۔ (گلیتوں ۵: ۱۷-۱۸؛ کرنتھیوں ۲: ۱۴)۔

## وجہ سوم

مذہبی احکام اور تعلیمات کا رُوحانی نکتہ نگاہ بہت بلند و بالا ہے۔ اسلئے عامتہ الناس اُن تعلیمات کو صرف سُن اور پڑھ کر ہی محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔ اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کا عملی پہلو بہت پست اور کمزور ہو چکا ہے۔ اب ان مذہبی درس و تدریس اور قوانین پر عمل کرنا محال و ناممکن سمجھ کر مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ مذہب کا نکتہ نظر نہایت اعلیٰ و ارفع ہے اور کاش ہم اُس تک پہنچ سکتے۔ اس صورت میں مذہب کا نکتہ نظر نہایت اعلیٰ و ارفع ہے اور کاش ہم اُس تک پہنچ سکتے۔ اس صورت میں مذہب کی فضیلت کا اقرار اور اپنی قابلیت کا انکار ہوتا۔ لیکن یہاں مذہب کا انکار اور اپنی قابلیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ تو اُس شخص کا ساحل ہوا۔ جو کسی اُستاد کامل کے آگے زانوئے شاگرد طے کرنے سے تو عار کرے اور جب علم حاصل نہ ہو سکے تو کہے کہ علم فضول شے ہے اور اس کا وجود و عدم برابر ہے۔

## وجہ چہارم

لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں خُدا دکھاو بغیر دیکھے ہم اُس کو کیسے مان لیں؟ اگر خُدا اپنی شانِ کبریائی والو ہیبت کے ساتھ نادیدہ و پوشیدہ اور فوقِ افلیم و ادراک رہے تو لوگ اُس کو کسی دیدنی و ظاہری صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وہ دیدنی صورت میں ظاہر نہ ہو تو اُس کی ہستی کے متعلق شکوک میں پڑا کر آخر اُس سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی دیدنی مظہر میں تجسم اختیار کر کے مرئی و مجسم ہو جائے اور انسان کی فہم و سمجھ کے مطابق اُس کی خُدا بینی کی خواہش کا جواب دے تو لوگ اُس کو محض ایک خُدارسیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کر اُس کی الوہیت و خُدائی کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ اب تبائے ان دو صورتوں کے علاوہ اور کونسی تیسری صورت ممکن ہے جس سے خُدا انسان کی آرزوں کو پورا کر سکے۔

## وجہ پنجم

در حقیقت لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے معجون مرکب سے بیزار ہیں۔ آپ یہ خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ امور معاشرت ہر گز مذہب کا جز نہیں ہیں۔ جس طرح لوہا زہر نہیں اور نہ زر لوہا ہے۔ اسی طرح معاشرت مذہب نہیں اور مذہب معاشرت نہیں ہے۔ روٹی سے بھوک مٹی اور پانی سے پیس تو بجھتی ہے مگر جس طرح روٹی سے پیاس نہیں بجھ سکتی اور پانی سے بھوک دور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح معاشرت کو مذہب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی مذہب معاشرت کی جگہ لے سکتا ہے۔ دونوں کے اغراض و مقاصد میں بعد المشرقین ہے۔ کھانا پینا اور پہننا (امور معاشرت) حوائجِ جسمانیہ و نفسانیہ کی آسودگی کے لئے ضروری ہے۔ اور مذہب حوائجِ روحانیہ و خواہشاتِ اخلاقیہ کی تسکین و آسودگی کا ذمہ دار ہے۔ دونوں کے مقاصد میں مغائرت و تقادراتِ ظہر بن الشمس ہے۔ خُدا کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے خُداوند نے ہر ایک چیز خاص مقصد کے لئے بنائی (امثال ۱۶: ۴) دراصل امور معاشرت کو غلطی سے مذہب کا جز سمجھ کر لوگوں نے تمدنی معاشرتی اور سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مذہب کی آڑ میں جھگڑے کھڑے کر کے مذہب کو بدنام کر رکھا ہے۔ اور اسی قسم کے جھگڑے ہمارے ملک میں لانتہا قتل خون اور غارت گری اور منافرت کا صریح سبب ٹھہرے ہیں۔ خون کرواتے ہیں۔ ان میں سے ایک سو اور گائے کا مسئلہ ہے حیوانی جانوں کی حفاظت کی خاطر انسانی جانوں کو ہلاک کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر حیوان کون مارنا گناہِ صغیر ہے تو انسان کو مارنا گناہِ کیسی نامعقول فلاسفی ہے۔ جب تک کھانے پینے اور مختلف ظاہری امتیازی نشانات رکھنے کو مذہب کا جز سمجھا جائیگا تب تک ہماری سر زمین پر خون کی ندیاں بہتی رہیں گی۔ اور اتحاد تعاون و اشتراک کے الفاظ ایک قالبِ مردہ کی طرح روحِ معانی سے تابد خالی رہیں گے۔ ان الفاظ کو اگر شرمندہ معانی بنانا مقصود ہے تو معاشرت کو مذہب سے جدا کر کے دونوں میں امتیازی حدود لگا دو۔ افسوس کا مقام ہے کہ غیر مسیحی اکثریت کا ظالمانہ دنیوی اقتدار انجیل کے ہمہ گیر و ہمہ رس روحانی مذہب کو گوشہِ لحد میں لٹا دینے کے لئے محض اس واسطے تیار ہوا ہے کہ وہ معاشرت کو مذہب کو جز نہ سمجھتے ہوئے دونوں کو الگ الگ رکھتا ہے۔ انجیل کا فرمان ملاحظہ ہو۔ کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائیگا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں۔ اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں (۱۔ کرنتھیوں ۸: ۸؛ ۱۳: ۸) کوئی چیز بذاتہ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔ اگر تیرے بھائی کو تیرے کھانے سے رنج پہنچتا ہے تو پھر تو محبت کے قاعدے پر نہیں چلتا۔ (رومیوں ۱۲: ۱۲-۱۴) کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے (رومیوں ۱۷: ۱۴) کیونکہ خُدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے۔ (۱۔ کورنتھیوں ۱۰: ۳۱)۔

جب تم مسیح کے ساتھ دنیوی ابتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ آدمیوں کے حکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو۔ کہ اسے نہ چھو نا اُسے نہ چکھنا۔ اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ (کلیسیوں ۲: ۲۰-۲۱) پھر ختنے کے

امتیازی نشان کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ نہ ختنہ کوئی چیز ہے۔ نامختونی بلکہ خُدا کے حکموں پر چلنا ہی سب کچھ ہے (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۱۹؛ کلیسیوں ۳: ۱۱) طبعی نکتہ نگاہ سے گائے و سور کے گوشت اور حقہ نوشی کے فوائد یا نقائص کچھ ہی ہوں پر۔ طبعی و معاشرتی معاملات پر رائے زنی کرنا مذہب کا کام نہیں۔ شراب کو اگر مذہب ناجائز قرار دیتا ہے تو محض اس لئے کہ اُس کے معائب و نقائص کا پلڑا اُس کے فوائد کی بہ نسبت بہت بھاری ہے۔ انسان شرابی ہو کر بدکلامی کرتا۔ گالیاں دیتا لڑائی دنگا کرتا۔ اور مدہوش ہو کر خُدا کی عبادت سے اضطرابی طور پر غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن گوشت خوری و حقہ نوشی سے نہ تو مدہوش ہو کر عبادت میں غفلت کر سکتا اور نہ ہی اُن سے کسی قسم کی بے ہوشی طاری ہو کر کسی ناجائز حرکت یا فعل کے صدور کا امکان ہوتا ہے۔ اگر شراب نیک نیتی سے حالات پیش آمدہ کے مطابق جائز فائدہ کے حصول کے لئے (مثلاً نمونیہ) استعمال کی جائے۔ تو کم از کم مسیحیت اُس کی مخالف نہیں ہے۔ دیکھئے سکھیا شراب کی بہ نسبت زیادہ خطرناک اور مہلک شے ہے۔ لیکن ہر مذہب کا مریض اطباء سے دوا کے طور پر لے کر استعمال کرتا ہے۔ صرف نیت کی نیکی یا بدی کی بات ہے۔ اگر کوئی نیک نیتی سے سکھیا استعمال کرے تو مرض سے شفا پاتا ہے۔ اور اگر بد نیتی (خود کشی کے لئے) سے استعمال کرے تو نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔ اور یہی گناہ ہوتا ہے۔ یہی حال شراب کا ہے ہر شے میں حد سے تجاوز کرنا مضرت رساں ہے۔ اور امور معاشرت میں یہ اصول بالکل درست ہے۔ پھر ذات پات اور اُونچ نیچ کے امتیازات مسیحیت کے باہر تمام مذاہب میں خاص اُبھری ہوئی جگہ رکھتے ہیں۔ اس امتیاز پسندی کے اختلال و خط نے مذہبی دیوانوں کے دماغ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ اور ہر منصف مزاج شخص اپنی ضمیر سے جنگ کئے بغیر ان کو انسان نمادِ مندے کہہ سکتا ہے۔ دُنیا کے اس حرماں نصیب برصیگر کی تباہ حالی۔ عدم تعاون عدم، اشتراک اور عدم مساوات کی حمایت کرنے والی یہی ذات پات کی واہیات ریت و رسوم ہیں۔ یہاں ہر پیشہ ایک مستقل مذہب کا قائم مقام ہے۔ یہ سب معاشرتی امور ہیں۔ مذہب کے اندان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور مسیحیت واحد حقیقی مذہب ہے جو ذات پات کے امتیازات کی جان پر ذات پتہ پڑھنے میں نہایت سنگدل واقع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ اُس (خُدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی (اعمال ۱۷: ۲۶) نہ یہودی رہانہ یونانی نہ ختنہ نامختونی نہ وحشی، نہ سکوتی نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے۔ (کلیسیوں ۳: ۱۱) اور تم سب جنتوں نے مسیح میں شامل ہونے کا پستسم لیا مسیح کو پہن لیا۔ نہ کوئی یہودی رہانہ یونانی۔ نہ کوئی غلام نہ آزاد نہ کوئی مرد و عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو (گلٹیوں ۳: ۲۷-۲۸) مسیحیت کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب آقا و غلام اور محمود ایاز کو سلک اتحاد و اشتراک میں منسلک کر کے ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ البتہ آج ہر مذہب مسیحیت کی اُدھوری اور ناتمام سی نقل ضرور اُتار رہا ہے۔ تاہم نقل نقل ہی ہے اور اصل اصل۔

کچھ سال ہوئے ایک شخص میرے ساتھ مذہب کے متعلق بات چیت کرنے آیا۔ اور اُس نے حسب معمول گوشت خوری کے جواز و عدم جواز کے متعلق گفتگو چھیڑی۔ میں اُس بحث کا خلاصہ! اس جگہ پیش کرتا ہوں تاکہ معاشرت و مذہب کے موضوع پر زیادہ روشنی پڑے۔

ہندو صاحب۔ صاحب تم لوگ گوشت کھاتے اور جیو ہتیا جیسے مہاں باپ کے مرتکب کیوں ہوتے ہو۔

راقم۔ پہلے میرے سوالات کا جواب دیں۔ پھر میں آپ کے سوال کا ہعقول اور تسلی بخش جواب دوں گا۔

ہندو صاحب۔ بہتر! فرمائے۔

**راقم۔** آپ انسانی اجسام۔ حیوانی اجسام اور نباتی اجسام میں کیا فرق مانتے ہیں؟

**ہندو صاحب۔** انسانی اجسام کو ہم ارواح کے اصلی گھر مانتے ہیں۔ اور حیوانی و نباتی اجسام کو قیدیں۔۔ یا یوں سمجھیں کہ جسم انسانی کرم حونی اور جسم حیوانی و نباتی بھوگ جونی ہیں۔ جب رُوح انسانی جسم میں رہ کر بُرے اعمال کرتی ہے۔ تو وہ اُن کا پھل بھوگنے کے لئے حیوانی و نباتی اجسام (قیدوں) میں ڈالی جاتی ہے۔

**راقم۔** بہت خوب! میں نے آپ کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ اب مجھے یہ بتائے کہ کسی قیدی کو قید سے رہا کرنا یا کروانا رَحْم میں داخل ہے یا نہیں؟

**ہندو صاحب۔** جی ہاں! قیدیوں اور مظلوموں پر رَحْم کرنا نہایت مستحسن فعل ہے۔ اسی واسطے ہم لوگ اندھوں لیگڑوں اور پانچوں اور حیوانات پر رَحْم کرتے ہیں۔ ہمارے گٹو سالہ اور یتیم خانے اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

**راقم۔** بہت بہتر! تو اب اپنے سوال کا جواب سنئے۔ ہم نباتات کو کھاتے ہیں تاکہ قیدی ارواح کو نباتی اجسام سے آزاد کریں۔ لیکن وہ ارواح نباتی قیود سے چھوٹ کر فوراً حیوانی اجسام میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ہماری ہمدردی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ انہیں حیوانی قیود میں رہنے دیں۔ چنانچہ ہم حیوانات کو کھالتے ہیں۔ حیوانی قیود سے نکل کر ارواح انسانی قابلوں میں یعنی اپنے اصلی گھروں میں آجاتی ہیں۔ اب ظاہر ہے۔ کہ ہم انسانوں کو نہیں کھاتے ہم اُن قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے اصلی گھروں میں پہنچا کر و م لیتے ہیں۔ آپ بھ یاس پَرَم پکار میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ یعنی نباتات کو کھاتے ہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اور ہم اُن کی آزادی کی خاطر ایک اور کٹھن منزل کو طے کرتے ہیں۔ کہو صاحب پھر گوشت کھانا کیسے پاپ ٹھہرا؟

**ہندو صاحب۔** واہ صاحب! آپ نے نئی فلاسفی سے اس مسئلہ کو حل کیا۔ لیکن میرا دل قائل نہیں ہوا۔ ہم تو آہنسا پر مودھرا ماکلے قائل ہیں۔

**راقم۔** خیر آپ قائل رہیں۔ لیکن اس مسئلہ کی حمایت سے آپ کی مشکلات بہت بڑھ جائیں گی۔

**ہندو صاحب۔** وہ کیسے؟

**راقم۔** اول تو یہ بُدھ مت کی تعلیم ہے۔ اور ویدوں کے صریح مخالف ہے۔ ویدوں میں اسو میدھ یگ گٹو میدھ یگ اور نر میدھ یگ (انسانی قربانی) کے احکام صاحب موجود ہیں۔ اور اُن پر صدیوں عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ مغربی مسیحی علماء کے علاوہ ڈاکٹر راجندر لال متر جیسے وحدی العصر اور یگانہ روزگار سنسکرت عالم نے بھی ویدوں کی کامل تحقیق موشگافی کے بعد صاف اقرار کیا۔ کہ ویدوں میں جانوروں کی قربانی کا ویسا ہی حال ہے جیسے اتوریت کی کتاب

احبار ہیں (دیکھو ڈاکٹر مذکور کی تصنیف انڈیا آرٹس) بدھ مذہب کے عروج اور ہمہ گیر وہمہ ہیں رسوخ واثر نے ان ویدوں کی تعلیم کو زواہ پھنچایا۔ اسی وقت سے یہ قربانیاں تو بند ہو چکیں۔ لیکن ویدوں میں ان کے احکام اب بھ یا صی طرح موجود ہیں۔

**دوم۔** لیکن اب بدھ کی تقلید سے بھی آپ کا دامن چھوٹ نہیں سکتا۔ یعنی آہنسا پر مودھریا کے اصول پر عملدرآمد قطعاً محال ہے۔ دیکھئے پانی اور ہوا اور نباتات میں بیشمار جیو موجود ہیں لیکن آپ ان کو استعمال کرتے ہیں۔ پلنگ کے دنوں میں کروڑوں چوہے عدم آباد پہنچائے جاتے ہیں۔ جراثیم کی برکت سے ملیں اور ہیضہ و تپ دق وغیرہ امراض لاحق ہوتے ہیں۔ ایسے امراض میں مریض کو دوا دینے یا ٹیکہ کرنے سے بھی مقصد ہوتا ہے کہ بیماری کے جراثیم دوا کے زہر سے ہلاک ہو جائیں۔ کپڑوں یا بالوں میں جوئیں پڑ جائیں یا گندے پانی پر چھڑ پیدا ہو جائیں۔ یا کھلیاں بیضے کے ایام میں بڑھ جائیں تو ان کو فنا کر دیا جاتا ہے۔ زہریلے جانوروں کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ ٹڈی دل کٹے انڈوں بچوں کو زندہ دبا دیا جاتا ہے۔ کیا کوئی آریہ یا ہندو ڈاکٹر اس خلاف فطرہ اصول پر عمل کر سکتا ہے؟ ہاں! اگر حکمت و طبابت کو بند کر دیا جائے۔ اور انسانی زندگی کی قیمت ایک صفر کے برابر سمجھی جانے لگے تو یہ ہو سکتا ہے۔

**سوم۔** آپ رُوح کو قدیم اور ناقابل فنا سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں گوشت خوری سے جیو ہتیا تو نہیں البتہ پر کرتی (مادہ) ہتیا ہو سکتی ہے۔ پھر آپ پر کرتی کو بھی قدیم اور غیر فانی مانتے ہیں۔ تو اس صورت میں جیو ہتیا پر کرتی ہتیا دونوں ناممکن ہیں۔ کیونکہ ارادہ و ارواح ناقابل فنا ہیں۔

**چہارم۔** جیو ہنسا خلاف فطرہ نہیں بلکہ موافق فطرہ ہے۔ ایک زندگی کا قیام دوسری زندگی کی فنا پر منحصر ہے۔ مثلاً بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کا کر جیتی ہیں۔ اس طرح تمام موجودات پر غور فرمائیے۔

**پنجم۔** اگر کہو کہ یہ قانون صرف حیوانات کے لئے ہے انسان کے لئے نہیں۔ تو اول تو اس میں یہ قباحت آئے گی کہ انسان بھی حیوانات میں شامل ہے۔ وہ حیوان ناطق مسلم ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ امر قابل غور ہے۔ کہ دنیا کے بعض حصص ایسے سرد ہیں کہ وہاں نباتی زندگی قطعی ناپید ہے۔ مثلاً سائبیریا کے میدان کے باشندے اور اسکیمو لوگ صرف گوشت کھاتے اور کھالیں پہنتے ہیں۔ اب آپ کا یہ استنقر اٹوٹ گیا کہ انسان کے لئے گوشت کھانا گناہ ہے۔ کل انسانوں کے لئے گوشت خوری گناہ ہے یہ غلط ہے۔ اگر کل کی جگہ بعض استعمال کریں تو خیرہ بعض انسانوں سے ہندو آریہ مراد لے لیں گے۔ یعنی انسان کُلی کے بعض افراد (ہندو) کے لئے گناہ ہے۔ اگر آہنسا پر مودھریا۔ خدا کا ایک عالمگیر قانون ہے۔ تو اس پر عمل در آمد ناممکن ہے۔ اور نیچر کی یہ کیا دل لگی ہے کہ بعض اقوام (اسکیمو وغیرہ) کا جینا صرف گوش خوری ہے۔ مسیحی کھانے پینے کو مذہب کو کوئی حصہ نہیں سمجھتے۔ مذہب رُوحانی زندگی سے متعلق ہے کہ جسمانیات سے۔ اگر ہم گوشت کھائیں تو مذہب کی خلاف ورزی نہیں اور اگر نہ کھائیں تو مذہب کی اطاعت نہیں۔ حکم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک امر دوسرا نہی جیسے گناہ نہ کرو یہ نہی ہے۔ نیکی کرو یہ امر ہے۔ لیکن گوشت کے متعلق یہ دونوں قسم کے حکم نہیں ہیں۔ اس لئے امور معاشرت اختیاری باتیں ہیں اور مذہب کا جُز نہیں ہیں۔ پس تم کھاؤ یا پو یا جو کچھ کرو۔ سب خدا کے جلال کے لئے کرو (۱۔ کرنتھیوں ۱۰: ۳۱)

وہ صاحب ان دلائل سے قائل ہو کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی درشن نہ دئے۔ میرا مقصد یہ نہ تھا کہ اُس کو دلائل سے ہرا دوں۔ بلکہ صرف اظہارِ حق سے غرض تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ معاشرت و مذہب کی تقادت و مغائرت کو سمجھ لے۔ اب میں پھر۔ پہلے جملے کو دوہراتا ہوں کہ لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے معجون مرکب سے بیزار ہیں۔

ششم۔ حضور خداوند مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ (متی ۲۸: ۱۹) اور کہ تم زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گئے۔ (اعمال ۱: ۸) جب اُس قادر ہستی نے یہ حکم دیا تو اس کی تعمیلی کے لئے اس قسم کی آسانیاں بھی بہم پہنچادیں کہ جن سے مذہب الہی کی تردیح و اشاعت ہر جگہ بلا وقت ہو سکے۔ اور مبشران انجیل کے ذہنوں کو اس قدر روشن کر دیا کہ وہ دنیا کے گمنام حصص اور در درازا قالم و ممالک کی دریافت میں کامیاب ہو گئے۔ اور تمام ملکوں کے راستے کھل گئے اور ذرائع آمد و رفت نہایت آسان ہو گئے۔ اور چھاپہ کی مشین کی ایجاد سے انجیل کی اشاعت کو بہت مدد ملی۔ اور چھاپہ کی ایجاد سے وہ تمام مشکلات جو مختلف فلسفوں کی تردیح و تشہیر عامہ کی سید راہ تھیں مکیس دور ہو گئیں۔ اور ذرائع سفر کی آسانیاں ایک ملک کے فلسفوں و خیالوں کو دوسرے ملکوں میں لے گئیں۔ پہلے ایک دو فلسفوں سے ایک ذہن آشنا ہوتا تھا۔ کیونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں ایک تو گراں قیمت پر ملتی تھیں۔ اور پھر دوسرے ممالک کے راستے نامعلوم ہونے کے باعث ہر جگہ مروج نہ ہو سکتی تھیں۔ اس لئے بہت کم لوگ اُن سے واقف ہو سکتے تھے۔ اور لوگ غیر ممالک کے مذہبی فلسفوں سے نابلد و بے نصیب رہتے تھے۔ اب سینکڑوں فلسفوں اور نظریوں نے دماغ کو متعدد مختلف خیالات کی گھڑ دور کا میدان بنا رکھا ہے۔ اور مختلف فلسفوں اور علوم نے باہم اخذاب و تجزیب اور ناثر و تاثر کر کے ایک نیا نمیر اُٹھایا ہے جس کو مذہب سے بیزاری کہنا درست ہے۔ اب لوگ اس شش و پنج میں ہیں کہ کس خیال یا نظریہ کو اپنا نہیں اور کس کو ترک کر دیں۔ اتنے کثیر خیالات کا موازنہ و مقابلہ کر کے کسی صحیح عقیدہ کی بنیاد رکھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ آخر انسان کا محدود دماغ کیا کرے۔ اس ذہنی کشمکش و بے چینی سے لاپچار ہو کر لوگ مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں۔ عقائد کی روز افزوں کثرت بھی مذہب کی بے قدری کو موجب ہے کیونکہ جب قدر کسی چیز کی زیادتی ہو اسی قدر لوگ اُس کی بے قدری کرتے ہیں۔

## مذہبی بیزاری کا علاج

ہم ماس بیان کے آغاز میں ذکر کر چکے کہ مذہب انسان کی فطرت کا جزو اعظم ہے۔ اور اُس سے دامن چھڑانا مشکل ہے۔ جب لوگ خدا کو چھوڑ دیتے ہیں تو ان کو ایک عموماً معبود ایجاد کرنا پڑتا ہے۔ ویو سماجیوں نے خدا کو چھوڑا تو انہیں ستیہ نندا گنی ہو تری موجودیود سماج کے منگین مجسمہ پر جین نیاز رگڑنی پڑی۔ اسی طرح بت پرستوں نے خدا کی جگہ عموماً بت بنا کر ان کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت ہے۔ اور اُس کی قیود سے آزاد ہونا محال۔ جب مذہب کی ضرورت ثابت ہو گئی تو اب موازنہ مذاہب سے اس امر کا کھوج لگانا ضروری ہے کہ کونسا مذہب خدا کا عطا کردہ ہے۔ ہم عقل اور مذہب کے بیان میں بخوبی ثابت کر چکے کہ خدا ایک ہے اور اُس کا مذہب بھی ایک ہے۔ اب ہمایک سادہ سامعیار پیش کریں گے جس سے ناظرین کو مذہب الہی اور انسان کے اختراعی مذاہب میں نمایاں امتیاز نظر آئے گا۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ عقلمند والدین اپنے بچوں کو ہمیشہ وہ چیز دیتے ہیں۔ جس کی اُن کے پاس کمی ہو۔ اور ضرورت بھی اُسی شے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ تم میں ایسا کونسا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے۔ پس جبکہ تم بڑے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتا ہو۔ تو تمہارا آسمانی باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا؟ (متی ۹: ۱۱-۱۲) اگر ایک بچے کے پاس دس جوڑی کپڑے ہوں۔ اور وہ پاؤں سے بالکل ننگا ہو۔ اور اُس کے والدین اُس کو کپڑے دو جوڑی اور بنادیں مگر جوتی نہ بنا کر نہ دیں۔ تو کیا اُس بچے کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔؟ ہر گز نہیں جس چیز (جوتی) کی ضرورت اور کمی تھی وہ اُسے دی نہیں گئی اور جس شے کی کمی نہ تھی بلکہ افراط تھی وہ دے دی گئی۔ لہذا وہ اُس کی ضرورت پوری نہ ہوئی۔ ایک

اور مثال تھی وہ دے دی گئی۔ لہذا وہ اُس کی ضرورت پوری نہ ہوئی۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص فاقہ زدہ گرسنگی سے لاپچار ہو کر لب دریا بیٹھا ہوا ہے۔ اس حالت میں اگر کوئی ازراہِ رحم پانی کا گلاس اُسے لا کر دیوے تو کیا اُس کی ضرورت پوری ہو جائے گی؟ ہر گز نہیں۔ کیونکہ پانی کی تو اُس کے پاس پہلے ہی قلت نہیں بلکہ افراط ہے۔ اور روٹی جس کی سخت حاجت تھی وہ اُسے ملی نہیں۔ اور ضرورت اُس شے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ خداؤِ نیا کا باپ ہے وہ بھی دُنیا کو ایسا ہی مذہب دیتا ہے جس کی دُنیا کو ضرورت ہو۔ اس وقت دُنیا میں نا اتفاقی۔ عداوت۔ خصومت فساد تکبر۔ خود غرضی لنع و تیر کی محبت اور سیاسی و تمدنی مخصوص کی کثرت ہے۔ اب اگر کوئی مذہب دُنیا کو یہی چیزیں دیوے تو ظاہر ہے کہ ان کی تو آگے ہی کیا کمی ہے۔ بلکہ اُن کی کثرت نے اہل دنیا پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اب دیکھیے۔ کہ دُنیا میں کمی کس شے کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محبت اور میل ملاپ کا اس وقت قحط پڑا ہوا ہے۔ لہذا خدا کا عطا کردہ مذہب وہ ہو سکتا ہے جس میں میل ملاپ اور محبت ک تلقین ہو۔ اور دشمنی عداوت اور شمشیر زنی کے خلاف سخت انتہائی احکام ہوں۔ کیونکہ معاشرت و سیاست ہو گز مذہب کے جُز نہیں ہیں۔ اب مختلف مذاہب کی تعلیمات کو اس معیار پر رکھ کر دیکھ لیجئے۔ کرشن بھگوان گیتا میں ار جن سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ اے ار جن جو تو بدھ کھے لڑ کر مر گیا تو سُرگ کو جائے پر اپت ہو گا۔ اور جو جیتے گا تو راج کے بھوگے گا۔ اس کارن سے اٹھ کر بدھ کر لاجھ اور بان اور سگھ اور دُکھ اور جیت ہار کر سماں جان کر بدھ کر (بھگوت گیتا دو تہی ادھیائے آیت ۳۸، ۳۷) یہاں سُرگ اور راج کے بھوگوں کی تحریص دلا کر ار جن کو جنگ و جدل کے لئے اُبھا جاتا ہے۔ حالانکہ شمشیر زنی اور قتل و غارت کا انعام سُرگ نہیں ہو سکتا۔ محض دُنیوی اغراض کے حصول کی خاطر سُرگ کا لالچ دیکر شمشیر زنی و خون ریزی پر آمادہ و دلیر کیا گیا ہے۔ لہذا گیتا نے دُنیا کو وہ چیز دی جس کی دُنیا میں پہلے ہی کثرت تھی۔ اور سیاست کو مذہب کے ساتھ ملا دیا۔ اب قرآن شریف کی تعلیم پر غور فرمائیے جو گیتا کے مندرجہ بالا خیال کے ساتھ ہو بہو ملتی ہے۔ جب تم کافروں سے بھڑو تو اُن کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب تم اُن میں خوب خون ریزی کو چکو تو اُن کی مشکلیں باندھ لو۔ اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دو۔ یا ندیہ لے کر۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اُن کے اعمال وہ ہر گز نہ کھوئے گا۔ اُنہیں ہدایت کرے گا اور اُن کا ال درست کرے گا۔ اور اُنہیں بہشت میں داخل کرے گا۔ جس کا بیان اُس نے اُن کے لئے کر دیا ہے (سورۃ محمد ۴- ۷ آیت و بقرہ ۱۸۶- ۱۸۹، ۲۱۲) جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں۔ اور جن لوگوں نے جگہ دی (نبی کو پناہ دی) اور اُس کی مدد کی وہی ہیں مسلمان ٹھیک۔ اُن کو بخشش ہے اور روزی عزت کی۔ (سورۃ انفال آیت ۷۵) قرآن شریف نے بی شمشیر زنی اور دشمنی و خون ریزی کو مذہب کو جُز بنا دیا۔ اور جنگ و جدل کے ساتھ بہشتی خوشیوں کو مشروط ٹھہرایا۔ لہذا قرآن نے دُنیا کی ضرورت کو پورا نہیں کیا۔ سکھ ازم اگرچہ ویدک دھرم کی ایک شاخ ہے۔ تاہم اُس کی تعلیم بھی اس بارہ میں ہم پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ رہیے اس گھ واک پادشاہی دس۔

ہم رے دُست سبھی تم گھا دو۔۔۔ آپ ہاتھ دے سوہے کرتارا

مورا چھانج کر دے کرے۔۔۔ سب بیرن کو آج سنگھریئے

پُورن ہوئے ہماری آسا۔۔۔ تور بھجن کی رہے پیاسا

تمھیں چھاڈ کو اور نہ دھیاو۔۔۔ جو برچا ہوں سو تم نے پاوں

سیوک سکھ ہمارے تارئے۔۔۔ چُن چُن سترہ ہمارے ماریئے

وسٹ جیتے اُٹھو اتپاتا۔۔۔ سگل ملیچھ کرورن گھاتا

اپنا جان مجھے پرت پرئے۔۔۔ چُن چُن سترہ ہمارے مریئے

ویگ تیغ جگ میں دو دچلے۔۔۔ راک آپ ہو ہے اور نہ دلے۔

ناظرین خود غور کر کے دیکھ لیں کہ سکھ ازم کس حد تک دنیا کی ضرورت کو پورا کرتا ہے تیغ و تبر کی ہدایات اور دشمنوں کے حق میں بددعائیں مانگنے سے میل ملاپ اور باہمی محبت ہر گز ترقی نہیں کر سکتی۔ اب ہم انجیل مقدس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ابتدا ہی میں نہایت عجز و انکسار سے گذرا کرتے ہیں کہ انجیل جلیل کے کل ۲۷ صحیفوں میں باوجود گہری تحقیق و تدقیق کے ہمیں ایک بھی آیت ایسی نہیں ملی جو مندرجہ بالا تین کتابوں کی مذکورہ آیات و تعلیمات کے ساتھ کسی قسم کی مماثلت و مشابہت رکھتی ہو۔ اگر ایک بھی آیت ایسی مل جاتی تو ہم اُس کو ایماندار سے پیش کر دیتے۔ اگر اور کوئی مسیحی یا غیر مسیحی صاحب انجیل مقدس سے کوئی ایک بھی آیت جس میں عداوت شمشیر زنی۔ خون ریزی اور خود غرضی سکھائی گئی ہو پائیں تو راقم کو مطلع فرما کر مشکوری کا موقع دیں۔ اب ہم انجیل کی وہ امتیازی تعلیم جو مسیحیت کو تمام دیگر مذہب عالم سے ممتاز کر دیتی ہے پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ذرا صدق دلی اور انصاف پروری سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے ہم انجیل سے وہ تعلیم پیش کریں گے جو شمشیر زنی و خون ریزی کے خلاف ہے۔ جب خُداوند مسیح کو گرفتار کیا گیا تو آپ کے ایک حواری پطرس نے تلوار سے سردار کاہن کے نوکر ملخس کا کان اڑا دیا۔ یسوع نے اُس سے کہ اپنی تلوار میان میں کرنے۔ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے۔ (متی ۲۶: ۵۲؛ مکاشفہ ۱۳: ۱۰) خُداوند مسیح نے مذہب کی مختصر سی تعریف اس طرح پیش کی ہے۔ خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اُس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔ (متی ۲۲: ۳۷-۳۰) خُدا محبت ہے۔ اور جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خُدا میں قائم رہتا ہے۔ اور خُدا اُس میں قائم رہتا ہے۔ (۱ یوحنا ۴: ۱۶) اگر کوئی کہے کہ میں قائم رہتا ہے۔ اور خُدا سے محبت رکھتا ہوں۔ اور وہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جھوٹا ہے۔ کیونکہ جو اپنے بھائی سے جسے اُس نے دیکھا ہے محبت نہیں رکھتا وہ خُدا سے بھی جسے اُس نے نہیں دیکھا محبت نہیں رکھ سکتا (۱ یوحنا ۴: ۲۰) اور خُدا اور اپنے ہم جنس مخلوقوں کی محبت کو لازم ملزوم ٹھہرایا گیا ہے۔ جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اُس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے (۱ یوحنا ۵: ۱) قول المسیح "میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو۔ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرے (متی ۵: ۴۴، ۴۶) اگر تیرا دشمن بھوکا ہو تو اُس کو کھانا کھلا۔ اگر پیاسا ہو تو اُسے پانی پلا (رومیوں ۱۲: ۲۰) محبت کی جامع تعریف ملاحظہ ہو (۱ کرنتھیوں ۱۳ باب) محبت کا مفصل بیان دیکھئے (اول خط یوحنا تمام)۔

ایک دفعہ ایک اچھے تعلیم یافتہ غیر مسیحی شخص سے میری گفتگو ہو رہی تھی۔ اور ہماری گفتگو کا موضوع مذہب اور محبت تھا۔ جب میں نے محبت کے متعلق انجیلی تعلیم کو پیش کیا۔ تو وہ فرمانے لگے کہ بھی وہ کونسا مذہب ہے جو محبت کی تعلیم نہیں دیتا؟ اور کس مذہب میں شمشیر زنی و خون ریزی جارہے؟ میں نے کہا کہ انجیل کے باہر تمام مذہب میں (یہاں سے یہ گفتگو مکالمہ کی صورت میں چلیگی)

سائل۔ اگر میں اپنی مذہبی کتاب میں سے وہ آیات پیش کر دوں جن میں محبت کرنے کی تعلیم ہے تو پھر کیا کہو گے؟

راقم۔ آخر ایسی کتنی آیات پیش کرو گے؟

سائل۔ خواہ دو تین ہی ہوں۔ آخر خُدا ہی کی دی ہوئی ہوں گی۔

**راقم**۔ ہاں سچ ہے کہ آپ کی کتاب میں دو تین سے زائد آیات محبت کی تعلیم نہیں دیتیں۔ پراس سے آپ کا مذہب محبت پر مبنی ثابت نہ ہو جائیگا۔

**سائل**۔ کیوں نہیں؟ آخر وہ تین آیات بھی تو خدا کے الہام سے ہیں۔

(ان کی منطق دیکھئے) آپ کے قائم کردہ معیار کے مطابق جس کتاب میں محبت کی تعلیم ہو وہ الہامی ہو سکتی ہے۔ میری کتاب کے اندر (نہ کہ باہر) محبت کی تعلیم ہے۔ لہذا وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور دنیا کا مذہب ہے۔

**راقم**۔ واہ صاحب! آپ کا فلسفیانہ استدلال خوب ہے۔ دیکھئے اگر کنکروں کے بڑے سے ڈھیر میں تین چار گندم کے دانے پڑے ہوں تو کیا وہ گندم کا ڈھیر کہلائے گا۔؟ ہر گز نہیں! اسی طرح جس کتاب میں معرکہ آرائیوں نبرد آزمائیوں اور جدال و قتال کی تعلیم کا حصہ غالب ہو۔ اور محبت کی تعلم محض تین چار آیات تک محدود ہو وہ ہر گز محبت کی تعلیم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ خدا کی عطا کردہ کتاب اور دنیا کا روحانی دستور العمل ہونے کے قابل ہے۔ اب انجیل شریف میں متی سے لے کر مکاشفہ تک ۲۷ صحائف میں ایک بھی آیت تلوار۔ خون ریزی اور عداوت کی موید نہیں ہے۔ اور اُس کی تمام تعلیم میل ملاپ، محبت، برداشت و صبر، حلیم و فروتنی۔ خود انکاری و ایثار، ہمدردی اور نیکی و پاکیزگی سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے مسیحیت ہی واحد عالمگیر الہی مذہب ہے۔

**سائل**۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک مسیحیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگیں کیں جن کو "صلیبی جنگ" کہا جاتا ہے۔ تو آپ کس صورت میں اس داغ کو مسیحیت کے پاکیزہ دامن سے دھو سکتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی واقعات کا انکار اہل دانش سے بعید ہے۔

**راقم**۔ چونکہ مسلمانوں نے عمدتاً و قصداً مسیحیوں کے معاہدہ مقاسمہ اور مقامات متبرکہ پر قبضہ جما کر اور اُن کی زیارت و عبادت پر ناحق پابندیاں لگا کر مسیحیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ اور اُن کی امن پسندی۔ صرب پروری اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے اگر مسیحی اپنے جائز مطالبات کے حصول کی خاطر لڑے تو محض اس لئے کہ مسلمانوں نے اپنی تحریصات نفسانیہ اور اغراض جسمانیہ کے زیر اثر خود اُن کو اس قسم کا قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔

**دوم**۔ حروبِ صلیبیہ کی علت غائی ملک گیری نہ تھی۔ اور نہ دولت و ثروت اور بیگانی عورتیں چھیننے یا بلا وجہ جہاد کرنے کی ہوس نے اُن کے جذبات کو جنگ کے لئے متحرک کیا۔ جیسا کہ مسیحیت کے باہر تمام دیگر اقوام میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے۔

**سوم**۔ ہندو مسلمان اقوانے حق تلفی و ظلم اور محاربہ و مکابہ کر کے ہمیشہ اپنی مذہبی گتے کے فرامین کی تعمیل کی ہے۔ لیکن مسیحیوں نے صلیبی جنگوں کے ذریعے انجیل مقدس کی خلاف ورزی اور مخالفت کی۔ کیونکہ انجیل میں ایک بھی ایسا حکم نہیں جو جو حروبِ صلیبیہ کا محرک و ہودی ہو۔ بلکہ صاف لکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ غیر قوموں کے سردار اُن پر حکومت چلاتے اور امیر اُن پر اختیار جتاتے ہیں۔ تم میں بڑا ہونا چاہئے وہ تمہارا خادم بنے۔ اور جو تم میں اول ہونا چاہئے وہ تمہارا غلام بنے (متی ۲۰: ۲۵-۲۷) کیونکہ ہم اگرچہ جسم میں زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جسم کے طور پر لڑتے نہیں۔ اس لئے کہ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی نہیں (۲۔ کرنتھیوں ۱۰: ۳-۴، افسوس ۶: ۱۰-۱۸)

**چہارم۔** اگر کوئی شخص نسخہ استعمال نہ کرے اور مرض سے صحت یاب نہ ہو تو اس سے کُتب حکمت کا نقص ثابت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسیحی لڑائی بھگڑے کرے تو اس کی اس کجروی کی علت انجیل کی تعلیم کو قرار دینا محض خوش فہمی اور ضد ہے۔

جنگی ہتھیاروں کی موجودگی محبت پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ زور اور زبردستی پر۔ اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار ہی سے مارے جائیں گے (متی ۲۶: ۵۲) "میں تم سے کہتا ہوں کہ شریک مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیرے دے۔" (متی ۵: ۳۹) اگر اہل دُنیا مسیح کے ان اقوال کی تعمیل کرنے لگ جائیں تو آج یہی خارستان (دُنیا) جنت کا نمونہ بن جائے۔ سائل۔ پُرانے عہد نامے میں یہودیوں نے مختلف قوموں کے ساتھ متعدد لڑائیاں لڑیں۔ اور توریت میں جنگ کے خلاف امتناعی احکام کا وجود ناہود ہے۔

**راقم۔** توریت کا مذہب مذہب الہی کی ناقص حیثیت تھا۔ خُداوند مسیح عہد جدید کے بانی ہو کر اُسی کو کامل کرنے آئے تھے۔ ہر شے کا کمال یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ وہ کسی وقت ناقص اور ادھوری تھی۔ مسیحی مذہب توریت کے ناقص مذہب ہی کی کامل حالت ہے۔ اس لئے انجیلی کامل مذہب کے مقابلے میں توریت کے ناقص مذہب کو رکھ کر اُس کے نقائص بیان کرنا تحصیل لا حاصل ہے۔ جس طرح ایک گنبد کو تعمیر کرنے کے لئے اُس کے نیچے اینٹوں کا عارضی ساہارا لگایا جاتا ہے۔ اور جو نہی وہ گنبد مکمل ہو جاتا ہے تو اُس ماتحت قالب کو گرا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح عہد عتیق میں معاشرت و مذہب مخلوط صورت میں تھے۔ عہد جدید میں آکر مذہب الہی کمالیت کو پہنچا اور معاشرت کو اُس سے جد کیا گیا۔ جس طرح پھول اور پھل ایک خاص معیار تک اکٹھے رہتے ہیں۔ اور جو نہی پھل ترقی کرنے لگتا ہے پھول کو دُجوڈ جھڑ جاتا ہے۔ اسی طرح عہد عتیق میں معاشرت و مذہب مخلوط صورت میں تھے۔ اور خُداوند مسیح نے دونوں کو یکسر جُدا کر دیا۔ اس لئے اس قسم کا اعتراض کرنے سے پہلے انجیل مقدس کی پوری واقفیت حاصل کر لینا ضروری ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ توریت میں خُون ریزی کے خلاف حکم نہیں۔ لکھا ہے۔ تو خون نہ کر۔

**دوم۔** ہم لوگ یہودی یا موسائی نہیں بلکہ مسیحی ہیں۔

**سوم۔** یہ مانا کہ پُرانے عہد میں یہود کے قومی جنگوں کا ذکر موجود ہے مگر اُن جنگوں کی نوعیت قرآن اور ویدک محاربات سے غیر ہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہود نے کبھی بھی اپنے مذہب کی جبری اشاعت کی غرض سے دیگر اقوام سے جنگ نہیں کی۔ اگر مذہب ہی اشاعت اُن کی جنگوں کی علت غائی تھی تو آپ بائبل مقدس میں سے کوئی ایسا مقام پیش کر کے ثابت کریں۔ اور دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کبھی ان جنگوں کے صاد میں خُدا نے انہیں بہشت کی خوشیاں عطا کرنے کا وعدہ نہیں کیا۔ جیسے کہ قرآن وید اور گیتا میں نہایت کھلے الفاظ میں ایسے انعامی اشتهار خُدا کی طرف سے موجود ہیں۔ یہودیوں نے صرف تمدنی و سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر غیر اقوام سے محاربے کئے۔ پس جس سے کی کمی ہو اُسی کی ضرورت ہو اُرتی ہے۔ دُنیا میں محبت کا سخت افلاس بلکہ قحط ہے۔ اور مسیحیت صرف یہی شے دُنیا کو بخششی ہے۔ اس واسطے وہ دُنیا کی سب سے بڑی روحانی و اخلاقی ضرورت کو پورا کرتی اور جنت کے دروازے اُس کے لئے کھولتی ہے۔ اے منکران مذہب! مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو کر اطمینان قلبی اور سکون باطنی کو جلد حاصل کریں۔ مذہب سے بیزاری کی وجوہات بیان کر دی گئیں۔ اور اُن کا شافی اور بے خطا علاج بھی ہم نے لکھ دیا۔ اب یہ آپ کا اختیار ہے کہ اُس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔

مطلب۔ ہر اعلیٰ سے اعلیٰ چیز ہر عزیز سے عزیز ہستی جس سے تمہیں جدا ہونا پڑے اس دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں اُس کو عوض مل سکتا ہے۔  
لیکن یاد رکھو اگر اللہ سے جدا ہو جاو گے تو اُس کا بدل کہیں نہیں پاو گے۔

## مسیحیت کی مخالفت

لوگ مسیحیت پر واہبات اعتراضات کی بوچھاڑ کر کرے اُس کی شان کو گھٹانے کی ہمیشہ اس لئے کوشش کرتے ہیں۔ کہ۔

**اول۔** وہ جانتے ہیں کہ مسیحیت کا معیار روحانی بہت بلند ہے۔ جب وہ اپنے مذہبی اصولوں کو مسیحیت کی لاثانی تعلیمات کے مقابلہ میں کمزور اور حقیر دیکھتے ہیں تو اُن کو جھٹ بھی تجویز سو جھتی ہے کہ چونکہ ہمارے اصول تو مسیحیت کی بلندی تک پہنچنے سے قطعی قاصر ہیں۔ اس لئے کس طرح انجیلی اصولوں کی جاو بجاتا ویلیں کر کے اور اُن کو گھٹا کر اپنے برابر کر لیں۔ وہ مسیحیت کے حجج قطعہ اور براہین شافیہ کے بالمقابل مشککانہ دلائل سے صف آراء ہیں۔ لیکن مسیحیت کے نور کر پھوٹوں سے بھنا محال ہے۔

**دوم۔** وہ مسیحیت کو ایک بدیشی مذہب سمجھتے ہوئے بدیشی حکومت کی طرح اُس سے بھی دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مذہب صرف حوائج روحانیہ و اخلاقیہ کی تسکین و آسودگی کا ذمہ داری ہے۔ اور حکومت محض جسمانی و نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس قدر روح جسم سے اعلیٰ ہے اسی قدر مذہب کا کلتہ نظر حکومت سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے۔ ایسے لوگوں کو خوب جان نینا چاہئے کہ مسیحیت مغربی مذہب نہیں بلکہ ایشیائی ہے۔ یعنی اُس نے جنم ایشیا میں لیا تھا تا کہ کل دنیا کا دستور العمل ہو کر اپنی روحانی و اخلاقی برکات و حسنات کو من حیث الاجتماع تمام صفحہ گیتی پر پھیلا دے۔ اور تمام اقوام عالم کو واحد برداری بنا کر ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیازات کی جان فاتحہ پڑھ دے۔

**سوم۔** لوگ مسیحیت کے اس لئے بھی مخالف ہیں کہ مسیحی مذہب ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات کی نفی کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتا۔ اور مسیحیت کا سب سے بڑا مدعا یہی ہے کہ آقا و غلام اور محمود و ایاز کو ایک ہی سلک اتحاد و اشتراک میں منسلک کر کے دنیا کو ایک واحد برداری بنا دے۔ تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا پتہ لیا مسیح کو پہن لیا۔ نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی۔ نہ کوئی غلام نہ آزاد۔ نہ کوئی مرد نہ عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو (گلتیوں ۳: ۲۷-۲۸؛ کلیسیوں ۳: ۱۱) چونکہ اس قسم کے مساوات کے قیام کا دوسرا نام اعلیٰ اقوام کی امتیازی عظمت اور بزرگی کی نفی ہے۔ اس لئے لازمی امر ہے کہ وہ مسیحیت کی بنیاد پر کوئی دیکھ کر گل حکمت کی ہنڈیاں کی طرح اندر ہی اندر چرغ کھایا کریں۔ اس کا مقاطعہ کریں اور اسکی جلا وطنی کی دعائیں مانگا کریں لیکن اگر دعائے فطلاں مستجاب ہو دے یک معلم در عالم زندہ نہ ماندے۔

**چہارم۔** جب ایک ڈاکٹر مریض پر جراحی عمل کرتا ہے۔ تو شدت درد کے باعث مریض اکثر بے اختیار ہو کر ڈاکٹر کو کوستا ہے۔ اور ڈاکٹر کو اپنا دشمن سمجھتا ہے تاہم ڈاکٹر مریض کی بھلائی کی خاطر اس طعن و تشنیع کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ اسی طرح روحانی مریضوں کو مرض عصیاں اور عارضہ جہالت

سے آزاد کرنے کے لئے جو عمل مسیحیت کر رہی ہے وہ ہے تو ان کے لئے کثیر المنفعت لیکن عارضی طور پر وہ بلا وجہ مسیحیت کے خلاف شور مچا رہے ہیں۔ لیکن مسیحیت کروڑوں جانوں کی سلامتی اور بہتری کی اُمید پر اس تمام مخالفت و مخالفت اور منافرت کی طرف سے آنکھیں بند کر چکی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ مخالفین مسیحیت معاذ نبین مسیحیت ہیں۔ اگر وہ منفی ہیں تو مسیحیت مثبت، برق ہمیشہ منفی و مثبت کے اتصال ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس قدر مخالفت شدید اور اُس کے خطرات عظیم ہوتے ہیں۔ اسی قدر خود حفاظتی اور مقابلہ کے سامان عظیم ہوتے ہیں۔ اگر مخالفت اور خطرہ نہ ہو تو مضبوطی اور استقلال کی نفی ہوگی۔ ہم مشکور ہیں اُن مخالفین کے جو مسیحیت کے لئے وجہ استحکام ہیں۔

## مِعیارِ الہام

گذشتہ ابواب میں ہم مسئلہ الہام پر روشنی ڈالتے ہوئے الہام کی اشد ضرورت کو ثابت کر چکے۔ اور دکھا چکے کہ حقائق و دقائق الہیہ اور رموز اسرار لطیفہ روحانیہ کے ادراک و تفہیم کے لئے عقل مجرد کی رہنمائی کافی نہیں ہے۔ اور نہ ہی عقل کے حاصلات و نتائج میں مطابقت تام ہے۔ اس لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا قطعی ناممکن اور معلومات عقلیہ پر اپنے ایمان و یقان کی بنیاد رکھنا سراسر غیر معقول ہے۔ جس طرح دنیا میں سچ کی بہ نسبت جھوٹ کا دائرہ اثر وسیع ہے اسی طرح دنیا میں سچے انبیاء کی بہ نسبت جھوٹے نبیوں کے دعویٰ نبوت کرنے کا زیادہ احتمال ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ ۱۔ سلاطین ۲۲: ۶۔ ۲۸ میں جھوٹے نبیوں کا نقشہ موجود ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ اُن نبیوں کی باتیں نہ سُنو۔ جو تم سے نبوت کرتے ہیں۔ وہ تم کو بطالت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اپنے دلوں کے الہام بیان کرتے ہیں۔ نہ کہ خداوند کے مُنہ کی باتیں (یرمیاہ ۲۳: ۱۶، ۲۱، ۳۲، ۱۴: ۱۴) اور خداوند مسیح نے فرمایا۔ جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں۔ مگر باطن میں پھانسنے والے بھیڑیے ہیں (متی ۷: ۱۵) اسی طرح صحائف مطہرہ میں بار بار جھوٹے نبیوں سے محتاط رہنے اور اُن کے گمراہ کن خیالات و باطل تعلیمات سے خبردار رہنے کے متعلق تاکید پائی جاتی ہے۔ پس ہم کس طرح جانیں کہ جو بھی نبی دعویٰ نبوت کرے وہ سچا ہے یا جھوٹا جس طرح کھرے اور کھوٹے سونے میں تمیز کرنے کے لئے ایک معیار یا کسوٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح کلام مقدس میں ہر دو قسم کے انبیاء کی جانچ کا معیار رکھا گیا ہے۔ اگر اُس معیار پر پرکھے بغیر کسی نبی کی اندھاؤہند تقلید کی جائے تو راہ حق سے گمراہ ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ چنانچہ میری ذاتی تحقیقات کے مطابق الہام اور نبوت کی جانچ کا معیار ان پانچ اصولوں پر مشتمل ہے۔ یعنی ۱۔ معجزہ ۲۔ پیشینگویی ۳۔ نیک سیرتی ۴۔ مطابقت بہ الہام ماقبل ۵۔ مسیح کا اقرار۔

## معجزہ

الہام الہی فوق العادات امر ہے۔ جب کوئی فوق العادات ظہور منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے تو انسانی عقل فطری طور پر اُس کی صحت کا ثبوت طلب کرتی اور جب تک ثبوت نہ ملے مشکوک و مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ دنیا ہی میں دیکھنے کہ جب کسی سلطنت کا سفیر کسی دوسرے بادشاہ کے پاس کوئی شاہی پیغام لیکر جاتا ہے۔ تو اُس وقت تک اُس کو شاہی نمائندہ تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک وہ اپنے ثبوتِ سفارت میں کوئی شاہی تصدیق نہ دکھائے۔ جب وہ بادشاہی مہر دکھاتا ہے تو اُس کے دعویٰ سفارت کو حق سمجھا جاتا اور اُس کے الفاظ کو عین بادشاہ کے الفاظ سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ عقل انسانی ذنبوی معمولی باتوں کی صحت و عدم صحت کے متعلق تصدیق اور یقینی ثبوت کا مطالبہ کرتی ہے۔ تو کس قدر فوق العادات امور کے متعلق اُس سے زیادہ قوی ثبوتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ جب کوئی نبی من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اُس کو اپنے دعویٰ کا ثبوت معجزات کے ذریعے دینا ہوتا ہے۔ اور لازم ہے کہ وہ

فوق العادت پیغام کو فوق العادت نشانوں کے ساتھ اہل دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو دنیا کو حق حاصل ہے کہ اُس کے پیغام کو الٰہی پیغام نہ مانے۔ موسیٰ پر جب توریت نازل ہوئی تو اُس نے اپنے الہام اور دعویٰ نبوت کو بڑے بڑے معجزات سے ثابت کیا (استثنا ۳۴: ۱۰-۱۲) اور جو نبی معجزات سے اپنی نبوت نہ دے پر سابقہ الہامی صحائف سے اُس کا پیغام مطابقت رکھے تو وہ پہلی کتابوں کا واعظ ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ اس سے زیادہ جب پُرانے عہد کا حدر رواج اختتام پذیر ہوا۔ تو نئے عہد کی بنیاد خُداوند مسیح نے رکھی۔ اور وہ ہزار معجزوں کا ایک معجزہ تھا۔ اُس کی تمام زندگی فوق العادت حقائق و اظہارات کا ایک حسین و جمیل مجسمہ تھی۔ اُس نے اپنے پیغام کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں بے شمار معجزے دکھائے۔ اور فرمایا کہ "جو کام باپ نے مجھے بھیجا ہے (۱- یوحنا ۵: ۳۶) اور آپ کے صعود فرمانے کے بعد رسول یہ گواہی دیتے ہیں۔ اے اسرائیلی مردو! یہ باتیں سُنو کہ یسوع ناصری ایک مرد تھا۔ جس کا خُدا کی طرف سے ہونا تم پر ثابت ہوا۔ اُن معجزات اور اچھنبھوں اور نشانیوں سے جو خُدا نے اُس کی معرفت تمہارے بیچ میں دکھائیں۔ جیسا تم آپ بھی جانتے ہو۔ (اعمال ۲: ۲۲) پھر مسیح کے رسولوں نے اپنی رسالت کو معجزات سے ثابت کیا۔ ملاحظہ ہو (اعمال ۳: ۱-۱۰؛ ۳۶-۴۲؛ ۱۴: ۱۱-۱۶؛ ۲۰: ۹؛ ۱۸-۲۰؛ ۱۴) پس معجزات کسی نبی کے من جانب خُدا ہونے کا ڈاکٹر کٹ ثبوت ہیں۔ اور جو نبی پیغمبر یا رسول معجزات نہ دکھائے۔ وہ انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شامل کئے جانے کے ہر گز ہرگز لائق نہیں۔ ہاں البتہ جلد باز اور سرلیج الاعتقاد لوگ ایسے دعویدار ان نبوت کی کورا نہ تقلید پر ایک دم کمر بستہ ہو جاتے اور ضلالت و گمراہی کے لِق و دِق صحرا کی خاک چھانتے ہیں۔ اور بعض مذہبی کتب کے ذاتی وعادی سے بڑھ کر دعوے کرتے۔ اور خواہ مخواہ بعض لوگوں سے معجزات منسوب کر کے انہیں انبیاء صادق کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت متصدقہ کو چھوڑ کر توہمات کو حقیقت کا لباس پہنانا عیب ہے۔ عہد عتیق اور عہد جدید ہر دو کی بنیادیں معجزات پر رکھی گئی ہیں۔ اور انجیل میں آکر الہام کامل ہو گیا۔ اور اُس کے وسعت رواج کا زمانہ تاقیامت ہے۔ اور انجیل نے کسی مزید الہامی کتاب کے نزول کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بلکہ کل واقعات جو ابتدائے عیسویت سے تاقیامت انسان اور خُدا کے درمیان ظہور میں آنے چاہئیں اُس میں بالتفصیل و تشریح قلمبند ہیں۔ اور معجزات بالخصوص اُس نبی کے لئے ضروری ہیں جو ایک نئی کتاب کا مُلّم اور کسی نئے دین کا بانی ہونے کا داعی ہو۔ موسیٰ عہد عتیق کا بانی تھا۔ اس لئے اُس نے اپنی نبوت کو معجزات سے ثابت کیا۔ اُس کے بعد کے انبیاء کے لئے معجزات دکھانا لازمی شرط نہیں بلکہ معجزہ یا پیشین گوئی میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے اگرچہ وہ یہ دونوں کام کریں۔ اسی طرح عہد جدید کے بانی نے اس نئی کتاب (انجیل مقدس) اور نئے عہد کی بنیاد معجزات پر رکھی۔ اب اگر کوئی تیسری کتاب انجیل کے بعد آئے تو اُس کے مُلّم و منزل علیہ کے لئے معجزات دکھانا ضروری و لا بدی ہے۔ لیکن انجیل نے کسی تیسری کتاب کے لئے بالکل گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس لئے مقدس پولوس رسول فرماتا ہے۔ اگر ہم یا آسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوش خبری کے سوا جو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوش خبری تمہیں سنائے تو معلون ہو۔ (گلتیوں ۱: ۸)۔

## پیشینگوئی

لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُس کو حکم نہیں دیا۔ یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تم اپنے دل میں کہو جو بات خُداوند نے نہیں کہی ہے اُسے ہم کیونکر پہچانیں۔ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خُداوند کے نام سے کچھ کہے اور اُس کے کہنے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خُداوند کی کہی ہوئی نہیں۔ بلکہ اُس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے۔ تم اُس سے خوف نہ کرنا (استثنا ۱۸: ۲۰-۲۳)۔

وہ نبی جو سلامتی کی خبر دیتا ہے جب اُس نبی کا کلام پورا ہو جائے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت خداوند نے اُسے بھیجا ہے (یرمیاہ ۲۸: ۹) ان حوالہ جات سے خوب روشن ہے کہ نبوت کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کی معیار پیشینگوئی بھی ہے۔ اتنی طاقت نہ تو قلم میں اور نہ ذہن میں ہے کہ بائبل کے تمام انبیاء کی تمام پیشینگوئیوں کو حیطہ تحریر میں لایا جائے۔ ناظرین خود تحقیق کر سکتے ہیں۔ ہم صرف خداوند مسیح کی چند پیشینگوئیوں کے پورا ہونے کا ثبوت پیش کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ (متی ۲۴: ۲۳-۲۴) چنانچہ۔

۱۔ بعہد اثر جان ۱۱۴ء میں ایک شخص انڈریو نے مسیحائی کا دعویٰ کیا۔

۲۔ ایڈریان کے عہد ۱۳۲ء میں بارکو کسب کو مسیح سمجھا گیا۔ اور یہود پر اُس کے باعث بہت تباہی آئی۔ آخر تک آکر یہود نے اُسے جھوٹا مسیح سمجھا۔

۳۔ ۴۳۴ء میں جزیرہ کریٹ میں ایک جھوٹا نبی اُٹھا۔ اُس نے موسیٰ ہونے اور لوگوں کو سمندر سے پار کرنے کا دعویٰ کیا۔ آخر جھوٹا ثابت ہوا۔

۴۔ ۵۲۰ء میں عرب میں ایک ڈونان نامی جھوٹا مسیح اُٹھا۔ اور اپنے یہودی پیروکاروں کے ہمراہ نگر اشہر میں مسیحیوں پر حملہ کر دیا۔ آخر مارا گیا۔

۵۔ ۵۲۹ء میں جولیان نامی ایک جھوٹے مسیح نے یہودیوں اور سامریوں سے بغاوت کرائی۔ اور بہتیرے ہلاک ہوئے۔ حضرت محمد صاحب کی بعثت کا بھی یہی زمانہ تھا۔ اور آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس توریت اور انجیل میں۔ (سورۃ اعراف ۱۵۸)۔

۶۔ ۲۱ء میں ایک سُریانی مسیحائی برپا ہوا اور جھوٹا ثابت ہوا۔

۷۔ ۱۳ء میں یہود نے فرانس میں کسی کو مسیح مان لیا اور ملک بدر ہوئے۔

۸۔ ۱۱۵ء میں یہود نے ملک ہسپانیہ میں کسی بناوٹی مسیح کے زیر ہو کر بغاوت کی اور قریباً کل تباہ ہوئے۔

۹۔ ۱۱۶ء میں سلطنت فیز کے اندر یہود نے ایک جھوٹے مسیح سے دھوکا کھا کر بہت دکھ اُٹھایا۔ اسی صدی میں عرب میں بھی ایک مسیح اُٹھا۔ اور پھر اسی سن میں دریائے فرات کے پار ایک مسیح اُٹھا۔ اور دعویٰ کیا کہ میں کوڑھی ہو کر سور ہوں گا اور تندرست ہو کر اُٹھوں گا۔

۱۰۔ ۱۲۲۲ء میں جرمنی میں یہود نے ایک شخص کو مسیح سمجھا اور اُسے ابن داود کہنے لگے۔ اسی برس وہ ایک عورت سے جو رمس کی تھی مسیح کے پیدا ہونے کی اُمیدیں رکھتے تھے۔ لیکن اُس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ چودھویں صدی میں ابھی اسی طرح ایک نقلی مسیح اُٹھا۔

۱۱۔ ۱۵۰۰ء میں ربی اسخر لیملا جرمنی میں مسیح پیشتر ہونے کا داعی ہوا۔ اور یہودیوں میں اُس کی باتوں سے بہت سرگرمی اور اُمید پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے روزوں اور نمازوں کے باضابطہ اوقات مقرر کرے اُس کی انتظاری کی۔ مگر لاحقہ حاصل ثابت ہوئی۔

۱۲۔ ۱۶۲۲ء میں وہ مشہور جھوٹا مسیحائی زیوی اُٹھا۔ اور اپنی جان بچانے کے خاطر آخر محمدی ہو گیا۔

(منقول از کتاب عدم ضرورت قرآن مصنفہ جی۔ ایل ٹھاکر داس۔)

اور انیسویں صدی میں مرزا غلام احمد<sup>۱</sup> قادیانی کو بھی دعویٰ مسیحائی کا شوق چرایا۔ اور ہزاروں بندگان خدا کو گمراہی میں ڈالا۔ آپ نے تحصیل لاحقہ میں اپنی سعی گرانمایہ صرف فرمائی۔ تاہم آپ کا خیالی قصر ویسے کا دیا گند بے در بنا رہا۔ اسی طرح قیامت تک جھوٹے مسیح و نبی اُٹھتے اور خداوند مسیح کی پیشین گوئی پر مہر صداقت لگاتے رہے رہی گے۔

پھر خداوند مسیح کی یوحنا ۱۶: ۲ کی پیشین گوئی اعمال ۸: ۹: ۱-۲ کے علاوہ ہر زمانے میں پوری ہوتی رہی۔ ہیکل کی بربادی کی خبر دی مرقس ۱۶: ۱-۱۸ جو ہمیشہ پوری ہوتی رہی۔ اپنی صلیبی موت کی خبر دی وہ پوری ہونے والی ہے۔ برخلاف اس کے مرزا قادیانی کی مردم آزاد پیشین گوئیوں کا

<sup>۱</sup>مرزات کی مزید تفصیل ضروری ہے۔

جو حشر ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ڈیٹی عبداللہ آتھم مسیحی مناظر کی موت۔ محمدی بیگم کانکاح۔ سلطیان احمدی کی موت اور پھر شیخ محمد حسین۔ جعفر ز ٹلی اور مولوی ابوالحسن تبتی کی موت کی پیشین گوئیاں سراسر باطل اور بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ پس آپ کے دعویٰ مسیحائی د نبوت کے بطلان کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ نبی صادق کی ہر پیشینگوئی کا سچا ہونا اُس کے دعوے کی صداقت کی دلیل ہے۔

## نیک سیرتی

فرستادہ خُدا اور مدعی نبوت کانیک سیرت ہونا ضروری ہے۔ اور یہاں نیک سیرتی سے وہ نیکی و پاکیزگی مراد نہیں جو خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ نبی و رسول کی زندگی بہ نسبت عامتہ لناس کے بہترین ہو۔ خُداوند مسیح نے فرمایا۔ جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو۔۔۔۔۔ اُن کے پھلوں (اعمالوں) سے تم انہیں پہچان لو گے۔ کیا جھاڑیوں سے انگور اور اونٹ کنٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا بعض لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ (متی: ۷: ۱۵-۱۷) پولوس رسول فرماتا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ جھوٹے رسول اور دغا بازی سے کام کرنے والے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مسیح کے رسولوں کے ہم شکل بنا لیتے ہیں (۲۔ کرنتھیوں ۱۱: ۱۳) پھر پطرس رسول فرماتا ہے۔ اور جس طرح اُس اُمت میں جھوٹے نبی بھی تھے۔ اسی طرح تم میں بھی جھوٹے استاد ہوں گے۔۔۔ اور بہترے اُن کی شہوت پرستی کی پیروی کریں گے۔ جن کے سبب سے راہِ حق کی بدنامی ہوگی۔ اور وہ لالچ سے باتیں بنا کر تم کو اپنے نفع کا سبب ٹھہرائیں گے۔

(۲۔ پطرس ۲: ۱-۳) مندرجہ بالا مقامات سے نبی کو اُس کی اخلاقی اور عملی زندگی کے نکتہ نگاہ سے سچایا جھوٹا کہنا ظاہر ہے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب نیک سیرت نبی ہوتے ہیں۔ سب نیک سیرت نبی نہیں پر سب نبی نیک سیرت ہوتے ہیں اور نیک سیرتی کے ساتھ معجزہ یا پیشینگوئی دونوں میں سے ایک قابلیت ضرور اُن میں ہونی چاہئے محض نیک سیرتی نبی ہونیکے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ وہ تو غیر نبی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس معیار کے مطابق کون کون نبی صادق کہلانے کا حقدار ہے؟

## مطابقت بہ الہام ما قبل

جو نبی خُدا کی طرف سے الہام لے کر مبعوث ہو اور نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو نہایت لازمی ہے کہ اُس کی تعلیم و تلقین اور مضامین و خیالات اپنے سے ماسبق نوشتوں کے ساتھ مطابقت تام رکھیں۔ اور اگر برعکس اس کے اختلاف و تناقض دکھائیں تو وہ نبی ہرگز خُدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خُدا متناقض مکاشفے نہیں دے سکتا۔ اُس کے مکشوفات میں تعلیم کے لحاظ سے تدریجی ترقی و کمالات تو لازمی ہے۔ مگر تردید و تنسیخ محال ہے۔ چنانچہ یہ معیار کسی مدعی نبوت کی صداقت کی جانچ کو اُس کی تعلیمات و خیالات کی مطابقت بہ صحائفِ علمہ سابقہ پر مبنی ٹھہراتا ہے۔ واضح ہو کہ عہد جدید کی دیوارِ عہدِ عتیق کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اور اس نئے عہد کے قیام کی وجہ خود عہدِ عتیق میں یوں مرقوم دیکھ وہ دن اتے ہیں خُداوند فرماتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ یرمیاہ ۳۱: ۳۱ اور عہدِ عتیق کی آخری کتاب کے آخری باب میں یوں مرقوم ہے۔ تم میرے بندے موسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض و احکام کو جو میں نے حورب پر تمام بنی اسرائیل کے لئے فرمائے یاد رکھو۔ ملاکی ۴: ۴ اس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ عہدِ عتیق کے ابتدائی۔ وسطیٰ اور انتہائی صحائف مابعد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آخری صحائف میں توریث کی تنسیخ نہ تردید کی گئی ہو۔ بلکہ آخری کتاب بھی توریث ہی کی طرف رجوع کرواتی ہے۔ اب عہد جدید کی مطابقت عہدِ عتیق کے ساتھ ملاحظہ ہو۔ خُداوند مسیح کا قول۔ یہ نہ سمجھو کہ میں

توریت یانیوں کی کتابوں کی منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ (متی ۵: ۱۷؛ لوقا ۱۶: ۱۶) اور ایک عالم شرع فریسی کو تمام توریت کا خلاصہ بتا کر فرمایا کہ۔ ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے کہ (متی ۲۲: ۴۰) عہد عتیق کی تقسیم تلاش کی تائید فرمائی۔ اور اپنے حق میں اُن کی خبروں کا پورا ہونا ثابت کیا۔ ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں (لوقا ۲۴: ۴۴) مقدس پطرس رسول خداوند مسیح کو عہد عتیق کے تمام انبیاء کی نبوتوں کا نشانہ ٹھہراتا ہے۔ اسی نجات کی بابت اُن نبیوں نے بڑی تلاش اور تحقیق کی جنہوں نے اُس فضل کے بارے میں جو تم پر ہونے کو تھا نبوت کی (۱۔ پطرس ۱: ۱۰) مگر جن باتوں کی خُدا نے سب نبیوں کی زبانی پیشتر خبر دی تھی کہ اُس کا مسیح ڈکھ اُٹھائے گا وہ اُس نے اس اس طرح پوری کہیں۔ (اعمال ۳: ۱۸؛ ۲۴: ۷؛ ۵۲) پس خداوند مسیح کے اپنے اقوال اور اُس کے رسولوں کی گواہیوں سے یہ حقیقت خوب روشن ہوتی ہے کہ عہد جدید کی بنیاد عہد عتیق پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے ان دونوں میں مطابقت تام ہے۔ اگر مخالفت و مغاارت ہوتی تو توریت کے انبیاء کی نبوتوں کو عہد جدید کے واقعات کے ثبوت میں پیش کرنا عبث ہوتا۔ ہم بزرگ عنوان عالمگیر مذہب اس حقیقت کو بدلائل قاطع و براہین سا طبع ثابت کر چکے ہیں۔ پس اگر دونوں کتابوں میں مطابقت دیکھنی ہو تو اُس مضمون پر پھر سے غور فرمائیں۔ انجیل کے بعد اگر اور کوئی نبی کوئی مزید الہامی کتاب لے کر نازل ہو تو اُس کتاب کی تعلیمات و خیالات کی مطابقت انجیل کے ساتھ لازمی امر ہے۔ انجیل تعلیم دیتی ہے کہ خُدا مجسم ہوا۔ مسیح کا کفارہ حصول نجات کے لئے شرط ہت۔ مسیح خُدا کا بیٹا ہے خُدا کی واحد ذات میں تین اقانیم ہیں۔ مسیح مصلوب ہوا مر گیا، تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر صعود فرما گیا۔ وہی دوبارہ آکر تمام دُنیا کی عدالت کریگا۔ اور عدالت انجیل کے مطابق ہوگی۔ ختنہ کرانا اور قریبیاں چڑھانا غیر ضروری باتیں ہیں۔ ان کو چھوڑ کر صرف مسیح کی قربانی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سوائے مسیح کے کوئی دوسرا نجات دہندہ نہیں۔ یہ ہیں انجیل کی اصولی تعلیمیں۔ اب اگر انجیل کے بعد کوئی اور نبی برپا ہو اور ان تعلیمات و اصولات کا قائل ہو اور انہیں کی تلقین کرے۔ تو ہم ہزار جان سے اُس پر نثار ہونے کی تیار ہیں۔ اور اگر اُس کی تعلیم اس کے خلاف ہو تو ہم اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر مجبور ہیں کہ اُسے نبی برحق نہ مانیں بلکہ جھوٹا نبی سمجھیں۔ کیونکہ انجیل کی یہ تاکید ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ہر مدعی نبوت کے قائل ہو جائیں۔ اگر ہم یا آسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوشخبری (انجیل) کے سوا جو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوشخبری تمہیں سُنائے تو ملعون ہو (گلتیوں ۱: ۸)۔

## مسیح کا اقرار

انبیاء عہد عتیق اس شرط کے ماتحت نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ مسیح کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے ہوئے ہیں۔ لیکن مسیح کے بعد جو بھی کوئی رسالت یا نبوت کا دعویٰ کر اُٹھے اُس کی پہچان کا یہ حقیقی اور صحیح معیار ہے کہ وہ خُداوند مسیح کا اقرار زبان اور عمل دونوں سے کرے۔ اے عزیزو ہر ایک روح کا یقین نہ کرو۔ بلکہ روجوں کو آزماؤ کہ وہ خُدا کی رُوح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی رُوح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے۔ وہ خُدا کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی رُوح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خُدا کی طرف سے نہیں۔ اور یہی مخالف مسیح کی رُوح ہے (۱۔ یوحنا ۴: ۱-۳) پس میں جتنا ہوں کہ جو کوئی خُدا کی رُوح کی ہدایت سے بولتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ یسوع ملعون ہے۔ اور نہ ہی کوئی رُوح القدس کے بغیر کہہ سکتا ہے کہ یسوع خُداوند ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱۲: ۳) مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی نے اپنی عمر عزیز مسیح کو ملعون ثابت کرنے کی کوشش میں ضائع کی مگر ناکام ہی رہے۔ اور قنوطیت و یاسوت کی حالت میں اس عالم آب و گل سے بصد حسرت چل دئے۔ انجیل اُس پر اور اُس کے ہم خیالوں پر لعنت کا حکم لگاتی ہے۔ پس اگر کوئی تمہارے پاس آئے اور یہ تعلیم نہ دے تو نہ اُسے گھر میں آنے دو اور نہ سلام کرو۔ (۲۔ یوحنا ۱: ۱۰) جس طرح عہد عتیق کے انبیاء اپنے الہامی پیغام کو ہمیشہ خُدا سے منسوب

کرتے ہیں۔ اسی طرح عہدِ جدید کے رسول اپنے الہام و کلام کو خُداوندِ مسیح سے منسوب کرتے ہیں۔ (گلتیوں ۱: ۱۱-۱۲؛ افسیوں ۱: ۱۰ وغیرہ) اور انجیل کے بعد جو بھی کوئی نبی اُٹھے ضروری ہے کہ وہ مسیح کا اقرار کرے اور اپنے کلام کو مسیح سے منسوب کرے۔ ورنہ اُس کی نبوت بے ثبوت۔ ناقابل قبول و فضول سے منسوب کرے۔ ورنہ اُس کی نبوت بے ثبوت۔ ناقابل قبول و فضول اور تمام ماقبل و ماسبق صحائف کے استقرائی اصولوں کے خلاف ہو کر باطل ٹھہرے گی۔

یہ امر مخفی نہ رہے کہ مندرجہ بالا پانچ شرائط کا ہر نبی میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض انبیاء میں دو۔ بعض میں چار۔ اور بعض میں پانچوں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً پولوس رسول نے معجزات دکھائے پیشین گوئیاں کیں۔ نیک سیرت تھا۔ اُس کا کلام باقی تمام صحائف مطہرہ سے مطابقت تام رکھتا ہے۔ اور اُس نے زبان اور عمل سے مسیح کا اقرار کیا۔ یاد رہے کہ تمام نیک سیرت نبی نہیں بلکہ تمام نبی نیک سیرت ہوتے ہیں۔ اور اس نیک سیرتی سے مراد معصومیت تام نہیں۔ اور تمام جو مسیح کا اقرار کرتے ہیں رسول نہیں پر تمام رسول مسیح کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پانچویں و آخری شرط صرف مسیح کے رسولوں کے لئے لازمی ہے۔ عہدِ عتیق کے انبیاء اس سے آزاد ہیں۔ اگر اب بھی کوئی بائبل کی صحت پر شک کرے اور ہمارے دعویٰ کی مزید تحقیق کرنا چاہے تو مسیحیوں کے کتب خانے اور لائبریریاں اُن کی تسلی کے لئے ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ اور مسیحی علماء نے صحت صحائف مطہرہ کے باب میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مندرجہ ذیل مشہور کتابیں اس موضوع پر زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ ہماری بائبل و مسلم علماء میزان الحق "کلام حق" اور تصنیف التحریف " وغیرہ۔

## تجسم الہی

### کلام مجسم ہوا (یوحنا ۱: ۱۴)

عقل اور مذہب کے زیر عنوان ہم نے یہ ثابت کیا کہ عقل طبعی خُدا کے صحیح اور یقینی علم کے حصول میں قطعی قاصر ہے۔ اور موجودات کے محدود دائرہ میں ہزار ہا سال سے گردش کرنے کے بعد اُس کی تحقیق و تدقیق کے حاصلات و نتائج وہی ہیں۔ اور اُس کے بعد الہام کی ضرورت کے زیر عنوان یہ ثابت کیا گیا کہ جب محدود منزل عقل کے ذریعے خُدا کی ہستی کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکا تو خُدا نے الہام کے ذریعے یہ مقصد حل کر دیا۔ اب یہاں پر ہم دلائل یقینیہ و براہین قطعیہ سے ثابت کریں گے کہ عقل محض اور الہام محض سے بھی خُدا کی ماہیت و حقیقت کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ آخری اور صحیح طریقہ پیش کریں گے جس سے یہ مطلب کلی طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔ اور سلسلہ وار تینوں مسائل پر مختصر پر بحث بھی کریں گے۔

## موجودات اور خُدا کا علم

جب ہم موجودات کی تمام اشیاء پر ایک تحقیقی اور ہمہ گیر نظر ڈالتے ہیں۔ تو اتنا معلوم ہوا ہے کہ اس قطر فطرت کا ضرور کوئی معمار ہے۔ اور ہم بطور استدلال انی معلول سے علت اور مصنوع سے صالح کا تصور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ خُدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔ اس لئے کہ خُدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ کیونکہ اُس کی آن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دُنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں۔ (رومیوں ۱: ۱۹-۲۰) لیکن مشاہدہ فطرۃ سے صرف اُس کی موجودگی ہی ثابت ہوتی ہے نہ کہ ماہیت اور حقیقت۔ مثلاً کسی جنگل میں ہاتھی کے نقش پادیکھ کر کوئی عقلمند یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس جنگل میں ہاتھی

ضرور موجود ہے۔ لیکن اُس ہاتھی کے قد و قیامت۔ قوت و ضعف اور رنگ اور تذکیر و تانیث اور دیگر کئی امور کے متعلق اُن آثارِ پاپ سے کچھ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ہاتھی کی موجودگی ہی ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی عالیشان عمارت کے دیکھنے سے اُس کے بنانے والے معمار کی محض ہستی ہی ثابت ہوگی مگر اُس کی شکل و شبابہت۔ خد و خال۔ عادات و خصائل اور طبعیت و مزاج کا علم عمارت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہونا ناممکن و بحال ہے۔ اسی طرح مشاہدہ دُنیا مافیہا سے من حیث الآثار صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ خُدا موجود ضرور ہے۔ پر یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسا ہے؟ مصنوعات کے مشاہدہ سے اگر خالق کا یقینی اور قطعی تصور حاصل ہو سکتا تو دُنیا میں خُدا کی ہستی و ماہیت کے متعلق مختلف و متضاد عقائد وجود میں نہ آتے۔ جہاں تک انسان نے اپنی عقل ناقصہ و فکر و فکر محدود پر بھروسہ کر کے خُدا کی ماہیت و حقیقت کی تحقیق کی وہاں تک وہ ضلالت و گمراہی میں پڑ گیا۔ یعنی اُن کے بے سمجھ دلوں پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے آپ کو داناجتا کر بے وقوف بن گے۔ (رومیوں: ۲۱-۲۲) مشہور یونانی حکیم سیزکا کا عندیہ اس عقلی گمراہی کے نتیجے کے طور پر یوں ہے۔ ایک طرح پر فلاسفر کا مرتبہ خُدا سے کم نہیں۔ پھر آریں کا عندیہ انسانی عقل کی گمراہی کا یوں آئینہ دار ہے۔ جہاں تک عقلی و اخلاقی زندگی کا تعلق ہے دانشمند شخص خُدا سے کم نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ عقل دور بین مشاہدہ فطرت سے اُس ذالتِ الہی اور وجودِ لاتناہی کو جو فوق الفہم و العقل ہے جان نہیں سکتی۔

## الہام اور خُدا کا علم

لیکن جب دُنیا نے اپنی حکمت سے خُدا کو نہ جانا (۱۔ کرنتھیوں: ۱: ۲۱) تو خُدا نے بذریعہ الہام اپنی ذات صفات کو انسان پر ظاہر فرمایا۔ اور جو حقدہ عقل مشاہدہ کائنات سے حل نہ کر سکی وہ الہام نے حل کر دیا۔ یعنی جس منزل پر پہنچ کر عقل دور بین و گمراہ اور فہم تیز رو لنگ ہو گئی اُس سے آگے مشعل الہام نے اُس کی رہبری و رہنمائی فرمائی۔ یعنی جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سُنیں نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خُدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن ہم پر خُدا نے اُن کو رُوح کے وسیلے (بذریعہ الہام) ظاہر کیا (۱۔ کرنتھیوں: ۹-۱۰) عقل کی روشنی میں تو انسان حقائقِ روحانیہ اور دقائقِ غیر مریہ کی تفہیم و تعقیل میں قاصر رہا۔ کیونکہ عقل کا دائرہ تحقیق محسوسات و مریات تک ہی محدود ہے۔ لیکن خُدا تعالیٰ نے نادیدنی روحانی حقیقتیں بذریعہ الہام انسان پر ظاہر فرمائیں۔ اب الہام چونکہ حقائقِ الہی کا محض لفظی بیان ہے۔ اور الفاظ انسان کے وضع کئے ہوئے اور محدود ہیں۔ اس لئے الہام سے بھی اُس کی ماہیت و کثرت ثبوتی تصور اور یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ لفظ خُدا سے خُدا کے متعلق کچھ علم اس کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا کہ لغت کے واضح نے یہ لفظ آفرینندہ کائنات کے لئے وضع کر دیا ہے۔ اگر کسی ایسے شخص کو جس نے کبھی شیر نہیں دیکھا ایک کاغذ پر لفظ شیر لکھ کر دکھائیں تو کیا اُس شہزور رندہ کا صحیح تصور اُس کو ہو جائے گا؟ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو کبھی کسی کو شیرہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی بلکہ ان تین حروف میں بشکلِ اصلی نظر آجایا کرتا۔ اور بچے جو جماعت اول میں پڑھتے ہیں وہ خِدا کے مر کب سے خُدا کو جان لیتے اور یوں بے علم لوگوں کے سوا کوئی بھی دُنیا میں خُدا کا منکر نہ ہوتا۔ جس طرح جغرافیہ کی کتاب میں امریکہ۔ جرمن۔ آسٹریلیا۔ انگلینڈ اور دیگر صد ہا ممالک کے نقشے اور حالات موجود ہیں۔ مگر باوجود اس کے جغرافیہ کے مطالعہ سے ہم اُن ممالک کی بابت کمالِ علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اور نہ کتاب کے ذریعے اُن کی سیر ہی ہو سکتی ہے۔ اور جیسے جغرافیہ کے علم کے باوجود انسان میں یہ زبردست خواہش پائی جاتی ہے کہ کسی صورت اُن ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لطف اٹھائے۔ اُن کی سیر و سیاحت سے بہرہ اندوز ہو اور اپنے جغرافیائی علم میں اپنے ستمبر باتی علم کا اضافہ کرے۔ اسی طرح الہام محض سے عالمِ لائوت اور خُدا کی ماہیت و کثرت کا تجربی علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کے دل میں دیدارِ الہی کی زبردست خواہش بے قرار ہو کر ویٹل لیا کرتی ہے۔ الہام سے صرف وہ فیوضِ غیبی

اور حقائق لار بی لفظی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ جن کے جاننے میں عقل مجرد معطل ثابت ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خُدا کا یقینی اور صحیح تصور دلانے میں الہام بھی قاصر رہتا ہے۔ انسانی فطرت ایک متشکل و متشخص وجود میں خُدا بینی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور نظریات سے آسودہ نہیں ہو سکتی۔

## ایک سعیدہ خواہش

خُداے حکیم و قدیر و قادر نے انسان کی ذات میں خواہش بھی پیدا کر دی ہے۔ اور جتنی خواہشات انسان رکھتا ہے اُن کے پورا کرنے کے لئے نیچر میں سامان بھی ویسے ہی پیدا کر دئے ہیں۔ اگر کسی کو علم کی خواہش ہے تو علم موجود ہے۔ اگر کوئی سیم و زر چاہئے تو وہ بھی موجود ہے۔ اگر کچھ سننا چاہے تو کان بھی ہیں راگ اور اصوات بھی ہیں۔ اگر اعلیٰ مراتب کی خواہش ہو تو وہ بھی موجود ہیں۔ غرضیکہ جیسی جیسی انسان کی خواہش ہیں ویسے ویسے اُن کے جواب بھی فطرت کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ ایسی کوئی بھی خواہش نہیں کہ جس کا جواب نہ ہو۔ خواہش کا وجود اشیاء خواہیدہ کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اب انسان فطری و جبلی طور پر یہ خواہش اپنے دل میں رکھتا ہے کہ وہ کسی صورت اپنے معبود حقیقی ابدی و ازلی کے دیدار فیض آثار سے اپنی تشنہ دید آنکھوں کی ضیافت کر سکے۔ الہامی صحائف خُدا کی چھٹیاں ہیں لیکن خطوط و مراسلات انسان کی خُدا بینی و یزداں پذیر ہی کی زبردست خواہش کی تسکین کو موجب نہیں ہو سکتے۔ یہ جذبہ سعیدہ انسانی نیچر کا وہ جبلی خاصہ ہے جس کے معصوم و کیف آگیاں اثرات سے مسحور ہو کر انسان اپنے پردہ نشین محبوب کے اشتیاق دیدار میں تڑپ جاتا۔ اور اُس کے تخیل و تصور کی معصوم و سحر آگیاں تجلی میں اپنے آپ کو کھودیتا ہے۔ اور اُس کے خیالی حسن و جمال کے کیف زائعات اُس کے لطیف جذبات پر کھیلنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کے روحانی و جسمانی قویٰ کو سیلا کر ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے۔ اور جب انسان کسی صورت اپنی اس عزیز ترین آرزو کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تو ناکام تمنا ہو کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا وہ پھٹ جائے گا۔ چنانچہ اسی پاکیزہ جذبہ کی ترجمانی موسیٰ چند الفاظ میں یوں کرتا ہے۔ میں تیری منت کرتا ہوں مجھے اپنا جلال دکھا دے۔ (خروج ۳۳: ۱۸) پھر داود نبی اپنی ہستی کو خُدا کی محبت کی قربان گاہ پر نثار کر کے یوں یوں اٹھتا ہے جیسے ہرنی پانی کے نالوں کو ترستی ہے۔ ویسے ہی اے خُدا! میری روح تیرے لئے ترستی ہے۔ میری روح خُدا کی۔ زندہ خُدا کی پیاسی ہے (زبور ۴۲: ۱-۲) صبح کا انتظار کرنے والوں سے زیادہ ہاں صبح کا انتظار کرنے والوں سے کہیں زیادہ میری جان خُداوند کی منتظر ہے (زبور ۱۳۰: ۶) پھر فلپس خُداوند مسیح سے یہی سوال کرتا ہے۔ اے خُداوند باپ کو ہمیں دکھائی ہی ہمیں کافی ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۸) جبکہ انسان کی تمام جسمانی اور روحانی خواہشات کا جواب اُس قادر و کریم نے اسی فطرت کے کارخانے میں دے دیا ہے تو نہایت مناسب اور ضروری ہے کہ وہ انسان کی اس نیک ترین اور واجبی خواہش کا بھی کوئی تسلی بخش جواب دے۔

## منظہر اور خُدا کا علم

قبل ازیں ہم اچھی طرح سے ثابت کر آئے ہیں کہ موجودات کے مشاہدہ سے صرف خُدا کے وجود باوجود ہی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی صرف ہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے۔ اور الہام سے صرف لفظی اور تمثیلی علم اُس کی حقیقت کا حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ان دونوں صورتوں میں وہ ایک نامظہر اور نامعلوم خُدا رہتا ہے۔ اس لئے جو لوگ موجودات کے مشاہدہ سے بطور استدلال انی یا الہام محض سے لفظی و تمثیلی طور پر خُدا کا ناکامل اور دھندلا سا تصور لے کر اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک نامعلوم خُدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اور نامعلوم کی پرستش کسی حقیقت کی نہیں بلکہ ایک وہم کی پرستش ہے۔ جیسے مقدس پولوس رسول اتھینے والوں کو فرماتا ہے۔ میں نے سیر کرتے اور تمہارے معبودوں پر غور

کرتے وقت ایک ایسی قربان گاہ بھی پائی۔ جس پر لکھا تھا کہ نامعلوم خدا کے لئے۔ پس جس کو تم بغیر معلوم کئے پوجتے ہو۔ میں تمہیں اسی کی خبر دیتا ہوں (اعمال ۱: ۲۳) اور خداوند مسیح نے سامری عورت کو فرمایا۔ تم جسے نہیں جانتے اُس کی پرستش کرتے ہو۔ ہم جسے جانتے ہیں اُس کی پرستش کرتے ہیں (۱- یوحنا ۴: ۲۲) پس لامحالہ انسان کی خدا طلبی اور خدا بینی کی فطری خواہش کا جواب دینے اور خدا کی ماہیت و حقیقت کے یقینی علم کے حصول کے لئے مظہر کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک تو انسان اُس کے دیدار فیض آثار سے لطف اندوز ہو کر اپنی خواہش کا جواب پائے۔ اور دوسرے اس لطف و ادق اور نادیدہ وجود کی خصائص ذاتیہ اور شمائل باطنیہ سے بجا امکان و اقیقت حاصل کر سکے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسان محدود العلم اور ناقص العقل تو اپنے محدود قوی سے اس بے حد و محیط کل وجود کو جان نہیں سکتا۔ اس لئے ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے آپ کو کسی دیدنی اور محدود مظہر میں ظاہر فرمائے۔ اور وہ مظہر انسان اور خدا کے درمیان برزخ کامل ہو کر رشتہ حادث بالقدیم قائم کرے۔ چنانچہ وہ مظہر الہی خداوند مسیح ہے۔ اُس نے فلپس کے جواب میں فرمایا۔ آے فلپس میں اتنی مدت سے تمہارے ساتھ ہوں کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا۔ تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھا؟ کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے؟ (یوحنا ۱۴: ۹-۱۰) یوحنا رسول فرماتا ہے کہ خدا کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا (یوحنا ۱: ۱۸) بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ تجسم مستلزم قباح عقلیہ ہے۔ یعنی کہ خدائے بے حد۔ محیط کل، ازلی، ابدی اور قدیم کیونکر حد و حدود میں آسکتا ہے۔ یعنی لا محدود خدا محدود کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق اس قدر عرض ہے کہ اگر خدائے بحد کسی حد میں آجانا ممنوع ہے، تو انسان محدود کا بے حد ہو جانا اُس سے زیادہ محال ہے۔ اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اور خدا کا ملاپ محال ہے۔ محدود انسان اُس لا محدود ہستی کے دیدار سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ کسی دیدنی مظہر میں ظاہر ہو کر حد و چیز کی قیود میں نہ آئے۔ ملاپ کی ان دو صورتوں میں سے ایک صورت ہی ممکن ہے۔ یعنی کہ یا تو محدود بے حد ہو جائے یا بے حد محدود ہو جائے۔ یہ تو عین قرین عقل ہے کہ محدود و متناہی وجود تو کبھی بے حد ہو نہیں سکتا۔ اور ذات نے حد کی قدرت و اختیار میں ہے کہ حد میں آجائے۔ دراصل حد اور بے حدی میں خصوص و عموم کی نسبت ہے۔ اور خصوصیت عمومیت کی ایک فرد ہے۔ خصوصیت ایک خاص کُلی ہے اور عمومیت عام کُلی ہے۔ حد میں خصوصیت ہے اور بے حدی میں عمومیت۔ ازیں جہت تمام حدود بے حدی کے حیثہ لا متناہی میں شامل ہیں۔ اُس سے باہر نہیں۔ پس بے حد کا کسی حد میں آجانا محال ن ٹھہرا۔

**دوم:** جب خدا کی ذات بے حد ہے تو ضرور اُس کی صفات بھی بے حد ہوں گی۔ اور اُس کی جملہ صفات کاملہ میں سے ایک صفت قدرت ہے۔ اور اُس کی اس بے حد ازیں صفت کا نتیجہ یہ محدود اور حادث کائنات ہے۔ جبکہ اُس کی بے حد صفات کے نتائج محدود و حادث ہو سکتے ہیں۔ تو اُس کی ذات کا حد و حدود میں آجانا کیسے محال ہو سکتا ہے؟ اور اُس کی حد میں آنا ان شرائط کے ماتحت ہو سکتا ہے جن سے اُس کی ذاتی خاصیت و طبیعت میں فرق نہ آئے۔ اور اگر بے حد کا حد میں آنا ممنوع ہے تو اس سے اُس کا نقص قدرت لازم آئیگا۔ جبکہ محذورات و ممکنات اُس کی بے حد قدرت کے آثار ہیں۔ تو مسیح خداوند اُس کے جلال کا پر تو اور اُس کی ذات کا نقش ہے (عبرانی ۱: ۳) جناب رفعت مآب خداوند مسیح کی رفیع القدر ذات کے ماسوا اور کوئی خدا تعالیٰ کا مظہر اکمل، افضل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو سکتا ہے تو ماہ نخشپ بھی ماہ حقیقی ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے شیر قالین بھی شیر نیستان ہو سکتا ہے۔ آفتاب کی شعاعیں پتھر لکڑی، مٹی اور دیگر تمام اجسام پر پڑتی ہیں۔ اور آئینہ پر بھی پڑتی ہیں۔ لیکن جس خوبی سے تو خورشید آئینہ میں ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے منعکس ہو کر مقابل کی اشیاء پر پڑتا اور اُنہیں محیط انوار اور بقہ تجلی بنا دیتا ہے۔ اُس حُسن و خوبی سے اُس کا ظہور اور کسی بھی شے میں نہیں ہوتا۔ لہذا آئینہ ہی اپنی انتہائی آبداری و صفائی کے لحاظ سے سورج کا مظہر کامل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خداوند مسیح کی عدم الہیم ہستی اور فقید المثال ذات اپنی انتہائی پاکیزگی اور خصوصیات

کاملہ الہیہ کے باعث تمام دیگر افراد عالم سابقہ و موجودہ سے ممتاز اور افضل و اکمل ہے اور انوار الوہیت کو قبول کر کے اس منصفہ شہود پر منعکس کرنے کی قابلیت و صلاحیت تام رکھتی ہے۔ لہذا خداوند مسیح ہی خدا کا مظہر جامع ہو سکتا ہے۔ اور اسی واسطے عقل سلیم اُس کے اس دعویٰ کی حقانیت و صداقت کو بلا عذر قبول کرتی ہے کہ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا۔ اور کوئی بیٹ کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اُس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کیا چاہئے (متی ۱۱: ۲۷) میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں پھر دُنیا سے رخصت ہو کر باپ کے پاس جاتا ہوں (یوحنا ۱۶: ۲۸؛ ۸: ۴۲)۔

## ایک بدیہی مثال

خُدائے تعالیٰ الطف و ادق اور غیر مرئی وجود ہے اور انسان کی طبعی کثیف آنکھیں اُس حقیقت لطیفہ مخفیہ اور وجود نامظہوری کو تجربہ بصارت میں نہیں لاسکتیں۔ لیکن انبیاء و مرسلین و مقربین نے اُس کی آواز جانفز کو از منہ سابقہ میں طرح بطرح سنا۔ اور اُس کے پاک پیغام کو صحائف مطہرہ میں قلمبند فرمایا۔ چنانچہ اُس نامظہور و نادیدہ مگر متکلم وجود کی مثال گراموفون ہے۔ اس میں متکلم کی صرف آواز سنائی دیتی ہے مگر صورت نظر نہیں آتی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے ایزد تعالیٰ نے فونو گراف کی عقل کی روشن کیا کہ وہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کی نادیدہ مگر متکلم حیثیت کی آئینہ داری کرے۔ چنانچہ وہ عارضی مظاہر میں کبھی کبھی ظاہر ہوتا رہا۔ پر وہ ظاہر جامع اور مستقل نہ ہونے کے باعث انسان کی خُدا بینی ویزداں پر وہی کی فطری خواہش کو آسودہ نہ کر سکتے تھے۔

ٹائیکز فلم میں اداکاروں کی آواز شکل اور حرکات و سکنات تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ خُدا کی حیثیت ظہوری (تجسم) کی مثال ٹائیکز فلم میں اداکاروں کی آواز شکل اور حرکات و سکنات تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ خُدا کی حیثیت ظہوری (تجسم) کی مثال ٹائیکز فلم ہے۔ وہی حقیقت نامظہوری ملبوس مجاز میں کثیر معانی کے ساتھ بشریت میں بس گئی۔ وہی لطیف ہستی مادی ظاہری جسم میں ساگئی۔ اسی غیر مرئی لطیف وجود نے انسانی شکل اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا (فلیپسوں ۲: ۸) چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے اُس خُدا نے فلم کے موجود کے ذہن و عقل کو منور کیا کہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کے تجسم اور ظہور کی ایک واضح مثال قائم کر دے۔ چنانچہ گراموفون اور ٹائیکز فلم کے ذریعے ہم خُدا کے بطون و ظہور کی حیثیات متناسبہ کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ بلکہ بہیات و مریات ہی کے ذریعے نادیدنی روحانی حقیقتوں کا ثبوتی تصور ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں (کلیسوں ۲: ۱۷) پس مظہر کے ذریعے خُدا کی ذات و صفات کا ثبوتی تصور اور ماہیت و حقیقت کا یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بذریعہ مظہر وہ ایک معلوم خُدا ثابت ہوا۔ اور اُس کی عبادت ایک معلوم خُدا کی عبادت ہے۔ اور ذات مظہر چونکہ مرآة الحق ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۹؛ کلیسوں ۱: ۱۵) اس لئے خُدا کی صفات کاملہ و بالغہ کا ظہور اُسی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم خُداوند مسیح کی الوہی صفات کو بھی مجملاً حیطہ تحریر میں لاتے ہیں تاکہ ناظرین بخوبی سمجھ سکیں کہ کلمتہ اللہ (مسیح) کن معانی میں خُدا کا مظہر جامع و کامل ہے۔

## قدرت و اختیار

خُداوند مسیح نے اپنے اختیار و قدرت کو خُدا کی قدرت و اختیار کے ساتھ ملایا اور یہ دعویٰ کیا۔ کیونکہ جس طرح باپ مردوں کو اٹھاتا اور زندہ کرتا ہے۔ اسی طرح بیٹا بھی جنہیں چاہتا ہے زندہ کرتا ہے (یوحنا ۵: ۲۱) اور اُس نے اپنے اس دعویٰ کو عملی طور پر ثابت بھی کیا۔ یعنی اُس نے بعد ازاں اپنی قدرت

اور اختیار سے زندہ کیا۔ اور یہ کلمہ اُس نے بلند آواز سے پکارا کہ اے لعزہ نکل آ (یوحنا ۱۱: ۴۳) اور وہ چاردن کا مردہ ایکدم قبر سے باہر نکل آیا۔ اور عبادت خانے کے سردار یائزکی مردہ لڑکی کو یہ الفاظ کہہ کر زندہ کیا۔ اے لڑکی میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ (مرقس ۵: ۴۱) پھر نائن شہر کی ایک بیوہ عورت کے مردہ بیٹے کو یہ کہہ کر زندہ کیا۔ اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ (لوقا ۷: ۱۴) اور وہ لڑکا فوراً زندہ ہو گیا اور سبت کے روز کفر نجوم کے عبادت خانے میں ایک شخص میں بدروح کو یہ کلمہ نکالا۔ چپ رہ اور اس میں سے نکل جا (مرقس ۱: ۲۵) اور جب بدروح اُس میں سے نکل گئی تو لوگ حیران ہو کر بحث کرنے لگے کہ یہ کیسے ہے؟ یہ تو نئی تعلیم ہے وہ ناپاک روحوں کو بھی اختیار کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ اور وہ اُس کا حکم مانتی ہیں (لوقا ۱: ۲۷) اور بھی دیکھو ، یہ کیسا کلام ہے؟ کیونکہ وہ اختیار اور قدرت سے ناپاک روحوں کو حکم دیتا اور وہ نکل جاتی ہیں (لوقا ۴: ۳۶) نہ صرف وہ آپ ہی ایسے اختیار رکھتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی وہ اختیار دے سکتا اور دیتا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ پھر اُس نے اپنے بارہ شاگردوں کو پاس بلا کر انہیں ناپاک روحوں پر اختیار بخشا کہ اُن کو نکالیں۔ اور ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کریں (متی ۱۰: ۲) اور انہوں نے مسیح کے دئے ہوئے اختیار کو ہمیشہ اُسی کی ذات قدرت سمجھ کر استعمال کیا۔ اور اُسی کے نام سے معجزات کئے۔ چنانچہ پطرس اور یوحنا ایک جنم کے لنگڑے کو تندرست کرتے وقت یہ کہتے ہیں۔ یسوع مسیح ناصری کے نام سے چل پھر (اعمال ۳: ۶) اور جب اس معجزہ کے باعث اُن کی مخالفت ہوئی۔ اور یہودی سردار فقہیہ اور کاہن اُن سے پوچھنے لگے کہ تم نے یہ کام کس قدرت اور کس نام سے کیا؟ اُس وقت پطرس نے رُوح القدس سے معمور ہو کر اُن سے کہا۔۔۔۔۔ تم سب اور اسرائیل کی ساری اُمت کو معلوم ہو کہ یسوع مسیح ناصری جس کو تم نے صلیب دی اور خُدا نے مردوں میں سے جلا یا۔ اُسی کے نام سے یہ شخص تمہارے سامنے تندرست کھڑا ہے (اعمال ۴: ۷-۱۰) اور اس معجزہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ مخالفین مسیح بھی اُس کا انکار نہیں کر سکے۔ اور اُن کو گواہی یہ ہے۔ کہ ہم ان آدمیوں کے ساتھ کیا کریں؟ کیونکہ یروشلیم کے سب رہنے والوں پر روشن ہے کہ اُن سے ایک صریح معجزہ ظاہر ہوا۔ اور ہم اُس کا انکار نہیں کر سکتے (اعمال ۴: ۱۷) خُداوند مسیح کے معجزات سے بھی کبھی کسی مخالف نے انکار نہ کیا تھا۔ جب اُس لعزہ نکل کو قبر سے زندہ کیا تو عوام الناس متعجب ہو کر اُسے دیکھنے آئے۔ لیکن سردار کاہنوں نے مشورہ کیا کہ لعزہ کو بھی مار ڈالیں۔ کیونکہ اُس کے باعث بہت سے یہودی چنے گئے اور یسوع پر ایمان لائے۔ (یوحنا ۱۲: ۱-۱۱) پس فریسیوں نے آپس میں کہا۔ سوچو تو کہ تم سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ دیکھو جہاں اُس کا پیر و ہو چلا۔ (آیت ۱۹) وہ اُس کے کلام کو انسانی طاقت سے بالا سمجھتے تھے۔ (یوحنا ۷: ۴۰) اگر عہدِ عتیق کے انبیاء نے معجزات کئے تو خُدا کے نام سے لیکن مسیح نے اپنے ذاتی اختیار و قدرت سے اور مسیح کے شاگردوں نے مسیح کے نام سے اور بھی بہت سی مثالیں اور نظریں مسیح کے خُداوند نہ اختیار و قدرت کے متعلق پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم اسی قدر بیان کو کافی سمجھ کرتے ہیں۔

## محبت

جو محبت نہیں رکھتا وہ خُدا کو نہیں جانتا۔ کیونکہ خُدا محبت ہے (۱- یوحنا ۴: ۱۹: ۸) اور الہی محبت کا مظہر خُداوند مسیح ہے۔ کسی راستباز کی خاطر مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا۔ مگر شاہد کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جرات کرے لیکن خُدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر ہوا (رومیوں ۵: ۷، یوحنا ۳: ۱۶) کلام کی گواہی یہی ہے کہ خُدا اپنی محبت کی خوبی کو ہم پر مسیح کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ اور محبت کی انتہا اور کمال قربانی ہے۔ چنانچہ خُداوند مسیح نے اپنی پاک قربانی کے ذریعے الہی محبت کے کمال کی آئینہ داری کی۔ ہم نے محبت کو اسی سے جانا ہے کہ اُس نے ہمارے واسطے اپنی جان دے دی۔ (۱- یوحنا ۳: ۱۶) خُداوند مسیح نے اپنی زبان حقائق ترجمان سے فرمایا۔ اچھا چرواہا

میں ہوں۔ اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔ اور میں بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں (یوحنا ۱۰: ۱۱-۱۰) کیونکہ ابن آدم بھی اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے۔ اور اپنی جان بہتروں کے بدلے فدیہ میں دے۔

۱۔۔۔ مرقس ۱۰ : ۴۵، متی ۲۰ : ۲۸ اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دیدے (یوحنا ۱۳ : ۱۳) اگر خداوند مسیح کی بے غرض پاک اور کامل قربانی خدا کی محبت کا ظہور ہے۔ تو تجسم محبت کے خدا کا ظہور ہے۔ اور قربانی کے لئے تجسم ضروری ہے۔ خدا کی محبت یہی کیا کم ہے کہ وہ انسان کی خاطر جسم اختیار کرتا ہے۔ قربانی دینے میں تو الہی ایثار کی حد ہے۔ مسیح کی محبت بے غرض تھی۔ پاک تھی بلاوے وال تھی۔ دوست و دشمن کے لئے مساوی تھی۔ راست و ناراست دونوں پر حاوی تھی۔ کامل تھی۔ اُس سے بہتر محبت کا نمونہ عظیم سے عظیم شخصیت نہ قدیم سے قدیم کتاب اور نہ کسی اور معبود میں پایا گیا۔ جس طرح تمام ستاروں کی مجموعی روشنی خورشید خاور کے بالمقابل بچ اور ماند ہے۔ اسی طرح تمام افراد عالم کی محبتوں کو مسیح کی لائٹانی وغیر فانی محبت کے سامنے کوئی قدر و وقعت نصیب نہیں۔

۲۔۔۔ مشہور کہاوٹ ہے کہ کندہ ہم جنس باہم جنس پرواز کبوتر یا کبوتر باز بیاز۔ یہ قدرت کا مسلمہ اصول ہے کہ محبوب اور محب کا ہم جنس و مساوی لہرتبت ہونا ضروری ہے۔ خدا کی ذات سراپا لطیف اور وار الوراء اور فہم و ادراک انسانی سے باہر ہے اور انسان خاکی ہے۔ یعنی ذات الہی اور ذات انسانی میں جنسی مغائرت ہے۔ اور یہی امر محبت و ملاپ کے مانع ہے۔ محبت کے لئے ہم جنسی ضروری و لازمی ہے۔ بغیر ہم جنسی کے میل ملاپ اور محبت کا وجود محال ہے۔ بلکہ ہم جنسی کے ساتھ ہی ہم مرتبہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک شہریار کا مگار کے ساتھ ایک دردیش بوریہ نشیں کی دلی محبت اور دوستی ہو سکے۔ دل ماننے کو تیار نہیں۔ خدا اور انسان کے درمیان رشتہ محبت و ملاپ قائم کرنے کے لئے خداوند مسیح اپنی شان الہی کو چھوڑ کر انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔

انسانوں کا ہم جنس بن گیا۔ ابن خدا ہوتے ہوئے ابن آدم بن گیا۔ اسی باعث وہ انہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا (عبرانیوں ۲ : ۱۱) پھر وہ انسانی شکل اختیار کر کے کسی شاہانہ تجمل اور دنیوی شان و شوکت کے ساتھ نہیں آیا۔ بلکہ نہایت مفلس گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کے سر پرست معاشرت و تمدن کے لحاظ سے مشہور نہ تھے۔ بلکہ لوگ حیرت سے کہتے تھے کہ کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟ اُس کے سردھرنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ اُس نے اپنی تمام زندگی فقیری حیثیت میں بسر کی۔ غربا و مسکین اور روحانی و جسمانی درد مندوں کی ہمدردی اور خدمت کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنایا۔ اور بالآخر تمام جہان کے گناہوں کے عوض میں اپنی قیمتی جان کو عدل کے مذبح پر قربان کر کے الہی محبت کے کمال کو بے نقاب کر دیا۔ محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ اُس نے ہم سے محبت کی۔ اور ہمارے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا (۱- یوحنا ۴: ۱۰)۔

## تدوینیت

یہ صفت خدا کی تمام صفات کاملہ بلیغہ کی درۃ التاج ہے۔ اور وہ پاکیزگی جو خدا ہی کی ذات سے خاص ہے خداوند مسیح میں جو خدا کی ذات کا نقش ہے کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ جبرائیل فرشتے کی گواہی۔ اور فرشتے نے جواب میں اُس (مریم) سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالنے گی۔ اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے۔ خدا کا بیٹا کہلائے گا (لوقا ۱: ۳۵) خداوند مسیح کا اپنا اقرار۔ تم میں کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے (یوحنا ۴: ۴۶) پطرس رسول کی گواہی۔ نہ اُس نے گناہ کیا۔ اور نہ اُس کے منہ سے کوئی مکر کی بات نکلی۔ (۱- پطرس ۲ : ۲۲) پولوس رسول کی گواہی۔ ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے۔ بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزما گیا۔ تاہم بے گناہ رہا۔ (عبرانیوں ۴: ۱۵) ژومیوں گورنر پیلاطوس کی گواہی۔ میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ (متی ۲۷ : ۲۴) پیلاطوس کی بیگم کی

شہادت۔ اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ۔ کیونکہ میں نے آج خواب میں اس کے سبب سے بہت ڈکھ اٹھایا ہے۔ (متی ۲۷: ۱۹) پہرہ داروں اور رومی صوبہ دار کی گواہی۔ بہت ہی ڈرے اور بولے کہ بے شک یہ خدا کا بیٹا تھا۔ (متی ۲۷: ۵۴) بدروح کی گواہی۔ میں تجھے جانتا ہوں کہ تو کون ہے۔ خدا کا قدوس ہے۔ (مرقس ۱: ۲۴) آے یسوع خدا تعالیٰ کے بیٹے مجھے تجھ سے کیا کام (مرقس ۵: ۷) نہ صرف آپ پاکیزگی اور تنزہ تام میں خدا تعالیٰ کے بیٹے مجھے تجھ سے کیا کام (مرقس ۵: ۷) نہ صرف آپ پاکیزگی اور تنزہ تام میں خدا کے ہمسر تھے۔ بلکہ گناہوں کی معافی کا بھی اختیار رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک گنہگار عورت حقیقی تائب دلی سے آپ کے پاک قدموں پر آکر گرہی تو آپ نے فرمایا۔ تیرے گناہ معاف ہوئے (لوقا ۷: ۴۸) پھر ایک دفعہ چند آدمی ایک مفلوج کو آپ کے پاس لائے۔ آپ نے اُن کا ایمان دیکھ کر اُس مفلوج سے کہا۔ اے آدمی تیرے گناہ معاف ہوئے۔ لیکن شرع کے علماء اور فقہاء نے اس حکم کو کفر سے تعبیر کیا۔ اور کہا کہ سوا خدا کے کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اس پر خداوند نے اُن سے سوال کیا کہ "آسان کیا ہے؟ یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے۔ یا یہ کہنا کہ اٹھ اور چل پھر؟ لیکن اس لئے کہ تم جانو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے (اص مفلوج سے کہا) میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ! اور اپنا کھٹولا اٹھا کر اپنے گھر جا (لوقا ۵: ۲۰ - ۲۴) جب آپ نے اپنے فوق العادت فعل کے ذریعے اپنے پہلے قول کو ثابت کر دیا۔ تو وہ سب بڑے حیران ہوئے۔ اور خدا کی بڑائی کرنے لگے۔ اور بہت ڈر گئے اور کہنے لگے کہ آج ہم نے عجیب باتیں دیکھیں (آیت ۲۶) ابتدائے آفرینش سے از آدم تا ایں دم کسی بھی ہستی نے سوائے خداوند مسیح کے یہ خداوندانہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس سے آپ کے الہی اختیار، قدرت اور قدوسیت کا بین ثبوت ملتا ہے۔ اسی واسطے آپ نے یہ فرمایا۔ میں راست بازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں (متی ۹: ۱۳؛ مرقس ۲: ۱۷) اور اسی واسطے مقدس یوحنا رسول کا قول آپ کی عدیم النظیر ذات کے متعلق کیا ہی موزوں تھا کہ "دیکھو یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے۔ (یوحنا ۱: ۲۹) پس ایزو تعالیٰ کی قدوسیت کے کمال کو بنی نوع انسان پر ظاہر کرنے کے لئے خداوند مسیح مظهر تھا اور ہے۔

## تمام انبیاء کرام پر فضیلت

بمقامیکہ رسیدی زسد تپچ نبی انجیل کی تعلیم کا سرمایہ غرائب و نادر دُنیا نے مذہب میں اس لئے ایک انوکھی شان اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی ہیر و وہ عدیم النظیر اور فقید المثل ہستی ہے۔ جس نے زینت افزائے کا شانہ گیتی ہو کر مذاق روحانیت کے لذت شناسوں اور خدائینی کے طالبوں کی سب سے عزیز خواہشات کو جواب دے کر اُن کے دلوں کو گہوارہ مسرت بنا دیا۔ اور خدا کے دُھندلے تصور کو اپنے ظہور پر نور سے ایسے روشن کر دیا جس طرح پرانے مہم مخطوطات پر قلم پھیر کر انہیں پھر سے روشن کیا جائے۔ حقائق و معارف روحانیہ اور شمائل و خصائل قدسیہ تامہ۔ حرکات و افعال پسندیدہ، خیالات و جذبات سعیدہ اور الوہیت کے تمام سر بستہ اسرار و انوار اور ذات حق تعالیٰ کا پاک ترین حُسن آپ کے نقاب انسانیت میں سے رہ کر چھتار بتا تھا۔ آپ کی پر محبت اور وقف ایثار زندگی الہی محبت کا ایک حسین و جمیل مرفع تھی۔ آپ کی مقدس و پاک ترین اور معصوم رفتار و گفتار الہی حُسن تقدس کی ایک عریاں تصویر تھی۔ اور حضرت انسان کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور معصومیت کا بے نقاب مجسمہ۔ آپ کے پیکر خاکی میں ملکوتی صفات کا عکس صاف نظر آتا تھا۔ اسی واسطے آپ کی جامع الصفات زندگی میں ایک ہمہ گیر جاذبیت تھی۔ وہ قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ جو صرف خدا ہی کی ذات سے خاص ہے آپ کی پُر حکمت و جلال جسمانی زندگی سے فوق العادت اظہارات کی صورت میں ایسے پھوٹ نکلا کرتی تھی جیسے سحاب مشکیں میں سے برق خاطر کے نورانی ڈورے۔ وہ نور کا ستون جو ابرسیاہ کے نقاب میں ہو کر شب کے وقت بنی اسرائیل کی رہبری فرمایا کرتا تھا اسی سرور کائنات اور سرچشمہ اکرام و حسنات کے جامہ انسانیت کو مشرف و مفتخر فرمانے کی ایک تشبیہ تھی۔ اور آپ نے اپنی زبان حقائق ترجمان سے بار بار فرمایا۔ میں دُنیا کا نور ہوں۔ جو میری پیروی کرے



کرے۔ چنانچہ تو نے اُسے ہر بشر پر اختیار دیا ہے۔ تاکہ جنہیں تو نے اُسے بخشا ہے اُن سب کو وہ ہمیشہ کی زندگی دے۔ اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔ (یوحنا ۱: ۱-۳) تاکہ سب لوگ بیٹے کی عزت کریں جس طرح باپ کی عزت کرتے ہیں۔ جو بیٹے کی عزت نہیں کرتا وہ باپ کی جس نے اُسے بھیجا عزت نہیں کرتا (یوحنا ۵: ۲۳) اور امثال ۸: ۲۲-۳۱ میں کلمۃ اللہ کی قدامت وازلیت کا بیان خوب واضح الفاظ میں موجود ہے۔ وہاں پر لفظ دانائی مستعمل ہے اور یونانی لفظ لوگاس (کلمہ) کے معنی دانائی اور کلام کے ہیں۔ اور یہ مسیح کا خطاب ہے ناظرین مذکورہ بالا بیان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خُداوند مسیح صرف نبی اور رسول ہی نہ تھے بلکہ نبیوں کو الہام دینے والے دُنیا کے خالق و مالک۔ نجات دہندہ اور قابل پرستش۔ جب اس قسم کے الہی القاب۔ الہی اقوال و افعال، الہی قدرت و اختیار۔ الہی صفات و حسنات اور پاکیزگی و قدوسیت تام اُس کی ذاتِ مقدس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُسے مظہرِ خُدا اور مرآۃ الحق تسلیم کر کے سر نیاز اُس کے پاک و مبارک قدموں پر نہ رکھ دیا جائے۔

عہد عتیق ایک کشفی سلسلہ ہے جس میں مکشوفاتِ قدسیہ الہیہ ملمین پر مختلف طرح ظاہر ہوئے۔ اور عہد جدید میں اُسی حقیقت کشفی مگر نا۔ مظلومی کا ظہوری تجسم ظاہری اور تجسم بحمدِ عنصری موجود ہے۔ اگرچہ خُدا تعالیٰ نے اُس وقت بھی مختلف عارضی مظاہرات میں ظاہر ہوتا رہا۔ لیکن وہ خُدا بنی کے خواہشمندوں کی چشم اشتیاق کا خاطر خواہ جواب نہ تھے۔ کوئی مستقل و جامع مظاہر نہ تھے۔ خُداوند مسیح وہ مستقل و جامع مظہر ہے جس میں حق تعالیٰ کی تمام صفاتِ قدسیہ اور رموز و حانیہ سجد امکان ظہور پذیر ہوئیں۔ گویا حقیقت برنگِ مجاز منصفہ شہود پر جلوہ فگن ہوئی۔ اور انسان کے اس جذبہ سعیدہ اور آرزوئے پسندیدہ کا جواب دیا۔ کہ

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

ہم کہاں تک اُس کے شائلِ حسنہ و خصائلِ قدسیہ کی آمینہ داری کریں۔ اُس سر اپانور کی لاثانی اور بے مثل زندگی کے چہرے کا ایک گوشہ بے نقاب کرنا بھی طاقتِ قلم سے باہر ہے۔ ہماری مندرجہ بالا تمام تحریر شاعرانہ حمد و سپاس نہیں ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انجیل مقدس کے بحر بے کنار کو کوزے میں بند کرنے کی ایک ناکام سی کوشش ہے۔ کلام ہماری تحریر سے بدرجہا زیادہ اُس کے لئے وقفِ محامدت ہے۔ بلکہ کلام بھی یہ اعتراف کرتا ہے۔ کہ خُداوند مسیح کی جامع الصفاتِ زندگی اور رفیع القدر ذات کا پورا بیان نہیں کر سکا (یوحنا ۲۰: ۳۰؛ ۲۱: ۲۵)

## ایک اعتراض کا جواب

اکثر مکرر الطبع اور محبوب الفہم لوگ مقلدانِ آنخداوند کے ایمان و یقان کی بنیاد کو جنبش دینے کی نیت سے آپ کی عصمتِ تامہ پر کہنے ہتھیاروں سے حملہ کرنا موجبِ حسناتِ کثیرہ سمجھتے ہیں۔ اور آفتاب کی طرف خاک دھول اڑالے یعنی مسیحیت کا مقابلہ کرنے کو اپنے عقائد کے استحکام کی وجہ تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ اور شیرِ قالین کو شیرِ نیتان کے بالمقابل کھڑا کر کے اصل کو نقل اور نقل کو اصل ثابت کرنے کی ناکام کوششوں پر فتمندانہ نعرے لگاتے ہیں۔ ہم یہاں پر اُن کو جواب دینے میں اختصار سے کام لیں گے۔ کیونکہ اس کتاب کا اختصار جو ہمیں منظور ہے اجازت نہیں دیتا کہ مخالفین کے تمام اعتراضات کو رفع کریں۔ اور طولِ بیانی و تصنیج اوقات کے علاوہ سردرد مول لیں۔ مسیحی مصنفین نے اس امر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مخالفین خُداوند مسیح کے اس بیان کی بنا پر اعتراض اٹھایا کرتے ہیں کہ یسوع نے اُس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا (مرقس ۱۰: ۱۸؛ لوقا ۱۸: ۱۹؛ متی ۱۹: ۱۶)

## اول۔

اس مقام میں خُداوند مسیح نے اپنی نیکی کا نہ تو اقرار کیا اور نہ انکار۔ کیونکہ خُدا کے نیک ہونے اور انسان کے نیک ہونے میں بڑا فرق ہے۔ خُدا اس معنی میں نیک نہیں کہ وہ بے گناہ ہے۔ بلکہ وہ قدوس اور بالذات پال ہے اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ پس الہی نیکی کا اقرار انسانی نیکی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خُدا کی نیکی اور مسیح کی نیکی کوئی دو باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ مسیح خُدا کی راست بازی ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱: ۳۰) لہذا مسیح نے اپنے نیک ہونے کا انکار نہیں کیا۔

## دوم۔

وہ سائل مسیح کو دیگر مذہبی اُستادوں اور عالموں کی طرف محض ایک استاد ہی مانتا تھا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے۔ اے نیک اُستاد۔ اور جیسے بعض استادوں کے متعلق لوگ کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑا شریف النفس ہے۔ وہ بہت نیک ہے لیکن اُس نیکی سے مراد معصومیت تام نہیں ہوتی بلکہ اُن میں بعض اوصاف عامتہ الناس کی بہ نسبت اچھے ہوتے ہیں۔ جب کسی استاد یا ہادی کو نیک کہا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ نیکی میں خُدا کا ہمسرہ ہے۔ اور جب کسی استاد کو عالم فاضل کہا جاتا ہے تو اُس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ خُدا کی مانند علیم کل یا ہم دان ہے۔ پس اسی طرح اُس سائل نے عام استادوں کی طرح نیک استاد کہا۔ اور آپ نے اس ظاہری ناکامل اور عام نیکی کو اپنی کو اپنی ذات کے متعلق قبول نہ کیا۔ کیونکہ آپ کی بے نقص اور کامل نیکی کو انسان کی سی ناکامل اور ناقص نیکی کے زاویہ نگاہ سے دیکھنا بے انصافی ہے۔ کیونکہ انسان کی ادھوری نیکی کے متعلق تو کلام یہ گواہی دیتا ہے۔ کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز انسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے۔ (واعظ ۷: ۲۰) اس لئے مسیح نے اُسے گویا یوں کہا۔ کہ اگر تو مجھے دیگر مذہبی استادوں کی طرح محض انسان سمجھ کر ہی نیک استاد کہتا ہے۔ تو کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا تاکہ سائل یہ غلط خیال اپنے دل سے نکال دے کہ مذہبی اُستاد بھی نیک ہو سکتے ہیں۔ اور اُس کا اس عام لقب سے مسیح کو خطاب کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی حضور وائسرائے کو کہے۔ سلام تھا بیدارجی۔

## سوم۔

متی ۱۹: ۱۶ کو پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خُداوند نے نہ تو اپنی نیکی کا اقرار کیا اور نہ انکار۔ بلکہ صرف ایک طرح سے نیکی کے معنی بتائے۔ اور فرمایا کہ "تو مجھے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ یعنی کہ اعمالِ حسنہ چن کو تم نجات اور ہمیشہ کی زندگی کی شرط سمجھے ہوئے ہو خُدا کی نظر میں پورے نہیں۔ اور ایسی ادھوری نیکیوں سے ہمیشہ کی زندگی کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ حقیقی نیکی تو گناہ آلودہ طبیعت سے ہو ہی نہیں سکتی بلکہ سراپانیک و پاک طبیعت سے صادر ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ "کیا انجیر کے درخت میں زیتون اور انگور میں انجیر پیدا ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح کھاری چشمے سے میٹھا پانی نہیں نکل سکتا (لقوب ۳: ۱۲) اور اگر نیک بن جانا اپنی ذاتی کوشش سے ممکن ہے تو "کامل بنو جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے (متی ۵: ۴۸؛ افسیوں ۵: ۱) ایسی کمالیت ہی ہمیشہ کی زندگی کے لائق انسان کو بنا سکتی ہے۔ لیکن انسانی کوشش کا یہ حال ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے (رومیوں ۷: ۱۸) اعلیٰ درجہ کی بے نقص نیکی کا تو کیا ذکر اُس سائل سے تو معمولی درجہ کی نیکی بھی نہ ہو سکی۔ یعنی جب مسیح نے فرمایا کہ "جاپنا سارا مال غرُبا کو بانٹ دے۔ اور میرے پیچھے ہولے۔ تو وہ جواب یہ بات سُن کر غمگین ہو کے چلا گیا۔ کیونکہ بڑا مالدار تھا (آیت ۲۱؛ ۲۲) اُس کی اس روش سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بتائی ہوئی معمولی اور ممکن العمل نیکی کو ناممکن العمل

سمجھا۔ اور نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ وہ معمولی کاموں کو جن پر سینگ لگے نہ پھٹکڑی نیکیاں سمجھتا تھا۔ اسی زاویہ نگاہ سے اُس نے آپ کو "اے نیک اُستاد" کہا۔ اور اُس خُداوند نے اس قسم کی ظاہری اور رسمی ورواجی نیکی کو اپنے اُپر عائد ہونے نہ دیا۔ اور اس لئے مسنیک اُستاد کے الفاظ کو اپنے حق میں قبول نہ فرمایا۔

## چہارم۔

اگر آپ اس قسم کی ادنیٰ کا اطلاق اپنی ذات پر جائز ٹھہرا لیتے تو یہودی گندم نما جو فروش اُستادوں اور ربیوں کو ملامت و تنبیہ نہ کر سکتے۔ بقول خود کو فضیحت اوروں کو نصیحت اول درجہ کی حماقت ہے۔ کیونکہ خستہ راختہ کے کند بیدار۔ اور اسی واسطے آپ ایسے درس دے سکے۔ کہ کیا اندھے کو اندھا راہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دونوں گڑھے میں نہ گریں گے؟ (لوقا ۶: ۳۹) اور جس کی آنکھ میں شہتیر ہے وہ اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو نہیں نکال سکتا (متی ۷: ۱-۵) یہ باتیں آپ کی عصمت تامہ کی گارنٹی ہیں۔

## پنجم۔

اگر آپ کا دامن عصمت گناہ کے گرد غبار سے ذرا بھی آلودہ ہوتا تو آپ دوسروں کے گناہ معاف کرنے کا اختیار نہ رکھتے۔ آپ نے گنہگاروں کے گناہ بخشے (لوقا ۵: ۲۰ - ۲۴: ۷ : ۴۸) اور گناہ سے حاجت تو بہ کی لازم آتی ہے۔ لہذا مخالفین اپنے اس ردی دعویٰ کے ثبوت میں آپ کی تو بہ و استغفار کے متعلق کوئی مقام انجیل جلیل سے پیش کریں۔ ورنہ سورج پر تھوکنے سے باز رہیں۔ وہ اپنے ہی منہ پر پڑے گا

## ششم۔

قرآن شریف اور احادیث معتبرہ خُداوند کی عصمت تامہ پر زبردست گواہی دیتے ہیں۔ جو تحقیقات کا شائق ہو اسلامی لٹریچر کی درق گردانی کر دیکھئے۔ اور مسیحی صحائف مطہرہ کو بھی اچھی طرح مطالعہ کرے۔ اگرچہ مسیح کی الوہیت و قدوسیت کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کی آراء ضروری نہیں۔ کیونکہ انجیل مقدس کی تائید و تصدیق ہی کافی سے زائد ہے۔ اور محتاج نہیں کہ غیر مسیحی علماء کی تائید ہمارے دعویٰ کو تقویت دے۔ تو بھی ہم مصلحتاً اسلام کے ایک جید عالم کی رائے مسیح کے متعلق یہاں قلمبند کرتے ہیں۔ مولوی سید وحید الدین خان آزاد اپنی کتاب "حد تحقیق بہ مشرب سنی" کی فصل ۳ صفحہ ۴ میں اپنا شخصی اعتقاد خُداوند مسیح کے متعلق یوں قلمبند فرماتے ہیں۔ مختصر اپنا اعتقاد ہم یہ لکھتے ہیں۔ کہ کتاب بائبل یعنی مجموعہ توریت و انجیل وغیرہ کا بہت حق ہے۔ اور سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصاً ذات حضرت مسیح علیہ السلام کی ایسی ملکی صفات ہیں۔ کہ اگر ہم اُن کو خُدا نہ کہیں تو اُن کو مجرّد آدمی بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ اُن کی صفات عام ظاہر اقوت بشری سے بہت زائد ہیں۔ اور سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اُن کو ہم ایک آدمی مع اللہ تسلیم کر لیں۔ اور قرآن شریف میں جو ذکر اُن کا بلفظ کلمۃ اللہ روح اللہ کے ہے۔ سو اس سے زیادہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور توریت و زبور وغیرہ میں پیشین گوئیاں نسبت اُن کی اس کثرت سے ہیں کہ قوم یہود کو خود انتظار ایک مسیح کا ہے۔

## کیا مجسم خُدا کی کسرِ شان ہے

اُس نے اگرچہ خُدا کی صورت پر تھا خُدا کے برابر ہونے کو قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا۔ بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا۔ اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا (فلپیوں ۲: ۶-۱۸)

مسیحیت کے عظیم الشان اور مایہ ناز مسئلہ تجسم کو غیر معقول ثابت کرنے کی غرض سے غیر مسیحی لوگ اس پر بہت سے لچر پوچ اعتراضات اٹھایا کرنے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ "تجسم خدا کی کبر شان ہے۔ یہ اعتراض بہت دفعہ ہمارے سُننے میں آتا ہے۔ لیکن ہم مخالفین کی اس اچھی ذہنیت پر حیران میں کہ انہوں نے۔۔

۱۔ طبقہ جمادات میں پتھر کو خدا کا مظہر تسلیم کیا۔ اور پتھر کی موتوں کو مظہر خدا سمجھ کر اُن کی پرستش پر ضمیر فروشی کی۔ اہل اسلام حجرِ اسود کو جو خانہ کعبہ میں ہے چومتے ہیں۔ اور ہندوں کا توجہ کر ہی کیا۔ اُن کے سر بفلک سنگین صنم خانے کروڑ ہا پتھر کے بُت اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ یہاں تک کہ عابدوں کی تعداد سے معبودوں کی تعداد بڑھی ہوئی ہے۔ بھلا پتھروں سے خدا کی ذات و صفات کا ظہور کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اصنام سنگین کو انسان کی نجات سے کیا واسطہ۔

۲۔ طبقہ نباتات میں خدا کے مظاہر ماننے۔ اور خاص خاص درختوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ کو ر اعتقادی تاحال زوروں پر ہے۔ حالانکہ درخت خدا کی صفات کاملہ کے مظہر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی وہ انسان کا خدا کے ساتھ ملاپ کروا سکتے ہیں۔ کہاں مظہر اور نجات انسانی اور کہاں نباتات!

۳۔ طبقہ حیوانات میں خدا کے مظاہر ماننے۔ گئو، بیل اور سانپ وغیرہ کی پرستش ہو رہی ہے۔ اور مصری میفس کے متبرک سانڈ کو پوجتے تھے۔ ہند میں بھی متبرک سانڈ پوجے جاتے ہیں۔ کیا کوئی عقلمند آدمی مان سکتا ہے کہ حیوان خدا کی ذات کاملہ اور صفاتِ قدسیہ اللہ کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ پھر اُن کو تعظیم الہی کی جگہ دینا کفر و شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

۴۔ طبقہ انسانی میں سینکڑوں مظاہر ماننے۔ راجاؤں، سوربیروں، بزرگوں، رشیوں، مینوں کو اوتار (مظہر خدا) تسلیم کیا۔ اور اُن کی پرستش ممانوں سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ اُن کے سنگین مجسمے قریب قریب ہر شہر اور اور مندر میں موجود ہیں۔ اور کروڑوں کی تعداد میں خلق خدا اندھا دھند شہانہ روزان کی عبادت میں مصروف ہو کر موردِ عتاب الہی ہو رہی ہے۔ جس طرح ہر ایک ہرن کی ناف میں کستوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک سپی میں موتی نہیں ہوتا۔ ہر دھات سونا نہیں ہوتی ہر شفاف شے آمینہ نہیں ہوتی۔ اُسی طرح ہر انسان خدا کا مظہر نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہی جس میں الہی صفات اور الہی طبعیت موجود ہو۔ دُنیا دار عیش پرست اور جنگجو لوگ خدا کے مظہر نہیں ہو سکتے۔ ذاتِ مظہر میں انسانی والہی ہر دو طرح کی صفات کا وجود ضروری ہے۔ اُس کی ایک حیثیت خدا سے اور دوسری حیثیت انسان سے مقرون ہو۔ تاکہ ربطِ حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ مظہر خدا میں ان دو حیثیات کا اجتماع لابدی ہے۔ اُس کا انسان کامل اور خدا کامل ہونا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ تجسم اختیار کرنا خدا کی کبر شان تب ہو اگر وہ جمادی، نباتاتی اور حیوانی طبقات میں مجسم ہو۔ انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور مظہر خدا سے استفادہ بھی وہی کر سکتا ہے۔ نجات کا انتظام بھی اُسی کے لئے کیا گیا ہے۔ خدا کا ملاپ بھی صرف طبقہ انسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے تو اندریں صورت اگر خدا مجسم ہر کر انسانی جامہ پہنے تو اس میں خدا کی شان نہیں گھٹی۔ بلکہ برعکس اس کے انسانیت کی شان بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ اگر اشرف وجود ادنیٰ وجود کے ساتھ متحد و مقرون ہو جائے تو ادنیٰ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً روح کے ساتھ اتحاد رکھنے کے باعث ہمارے جسم کی اس قدر قدر و قیمت ہے۔ اگر روح جسم کو چھوڑ جائے تو اس کی ساری قدر و منزلت یکسر جاتی رہے۔

۱۔ اگر لعل یا جواہر کا ایک ننھا سا ذرہ پیتل کی انگوٹھی پر بطور رنگینہ لگا یا جائے تو اُس انگوٹھی کی قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ ایک درہم کی وجہ سے ایک صدف کی قدر و قیمت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ درہے بہا اُس میں سے نکال لیا جاتا ہے تو خالی پسی کام کی نہیں رہتی۔ اسی طرح خداوند مسیح جب مجسم ہو کر انسانیت سے مقرون ہو گئے تو انسانیت کا مرتبہ بڑھ گیا۔

۲۔ پرانے زمانے میں بعض بادشاہ فقیرانہ بھیس بدل کر رات کے وقت اپنی رعیت کے پست و مظلوم طبقہ کے دکھ درد جاننے کی خاطر ادھر ادھر اُن کی جھونپڑیوں میں گشت لگایا کرتے تھے۔ اور اُن کی مظلومیت و مصیبت کے موجبات کا سراغ لگا کر اگلے روز تختِ عدالت پر بیٹھ کر اُن کا انصاف کر دیتے تھے۔ اگر بادشاہ شاہی شان و تجل میں اُن کے پاس جاتا تو وہ حواسِ بانختہ ہی ہو جاتے۔ اُن میں کب یہ حوصلہ رہتا کہ بادشاہ کو بلا خوف اُن مظالم و مصائب سے آگاہ کرتے جو زبردستوں کی طرف سے اُن پر روا رکھے جاتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ فقیرانہ بھیس بدلنے سے بادشاہ کے اختیار و مرتبہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بے کس و مظلوم لوگوں کے حق میں اُس کا یہ ایثار کثیر المنفعت اور مصائب سے نجات دلانے کا موجب ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مسیح کے جسمِ انسانی میں اس عالمِ آب و گل پر ظہور فرمانے سے ایزدِ تعالیٰ کا حد درجہ ایثار ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے دُنیا کے ٹھکے ماندے اور بوجھ سے دے ہوئے لوگوں کے لئے آرام و مسرت اور حقیقی آزادی کا دروازہ کھل گیا۔

۳۔ ایک لعل و جواہر کے سوداگر (جوہری) کے پاس ایک نہایت خوبصورت ہنس تھا جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ بہت لوگوں نے اُسے خریدنے کی کوشش کی مگر اُس سوداگر نے ہمیشہ اُس کے بیچنے سے انکار کیا۔ اُس کے کئی دوست ناراض ہر کر چلے گئے۔ ایک روزہ اُس نے سوچا کہ اس ہنس کی وجہ سے میرے کئی دوست مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ میں نے اس کو اُن کے ہاتھ بیچنے سے انکار کیا۔ مناسب ہے کہ میں اس کی قیمت دو ہزار روپیہ ٹھہراؤں۔ نہ کوئی اتنے دام دے گا اور نہ ہنس لے جائے گا۔ بھلا دو ہزار روپیہ دے کر اس مشمت پر کا کوئی کیا بنائے گا؟ ایک روز ایک ایک جواہرات کا گاہک کوئی قیمتی جواہر خریدنے کے لئے اُس کی دوکان پر آیا۔ سوداگر اُس وقت دوکان کے اندرونی حصے میں کوئی کام کر رہا تھا۔ گاہک کے دیکھتے دیکھتے اُس ہنس نے ایک لاکھ روپیہ کا ایک قیمتی لعل نگل لیا۔ جب سوداگر باہر آیا تو اُس نے گاہک سے پوچھا کہ آپ کیا خریدیں گے؟ اُس نے کہا کہ "یہ ہنس" سوداگر نے جو اصل حقیقت سے ناواقف تھا کہ اس کی قیمت دو ہزار روپیہ ہے۔ گاہک نے فوراً دو ہزار روپیہ ڈھیری کر دیا۔ اور ہنس اُٹھالیا۔ سوداگر بہت خوش تھا کہ اچھا بے وقوف ملا ہے۔ جو پانچ دس روپے کی چیز کے دو ہزار روپے دے کر چلا گیا ہے۔ چلو کیا خسار ہے۔ سراسر نفع ہی ہے۔ دیکھئے اُس لاکھ روپے کے لعل نے اس ہنس کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا۔ اگر اُس کے پیٹ کے اندر وہ قیمتی لعل نہ ہوتا تو کون اُس کو اتنی گراں قیمت پر خریدنا؟ اور ہنس کے پیٹ میں پڑنے سے لعل کی قیمت گھٹی نہیں بلکہ قائم رہے۔ کلمۃ اللہ (مسیح) وہ لعلِ بہشتی تھا۔ (امثال ۸: ۱۱، ۱۹: ۱۱، متی ۱۳: ۴۶، ۴۵) جو مقدسہ مریم کے بطن میں پڑا تو اُس کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ آج اُس نادار عورت کو کروڑوں نفوسِ مسیح کی ماں سمجھ کر نہایت عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ مریم کا اپنا اقرار ملاحظہ ہو۔ "میری جان خُداوند کی بڑائی کرتی ہے۔ اور میری روح میرے منجی خُدا سے خوش ہوئی۔ کیونکہ اُس نے اپنی بندی کی پست حالی پر نظر کی۔ اور دیکھ اب سے ہر زمانے کے لوگ مجھ کو مبارک کہیں گے (لوقا: ۴۶-۴۸) وہ جب اس عالمِ سفلی میں انسانوں کے مشابہ ہو کر آیا تو اُس وقت جنتوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا (یوحنا: ۱۲) وہ ابنِ آدم بن گیا تاکہ انسانوں کو خُدا کے بیٹے بنائے۔ وہ خاکی بن گیا تاکہ ہم خاکیوں کو افلاک بنا لے۔ وہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے۔ ہماری پست حالی کے بد کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائے گا۔ (فلپیوں ۳: ۲۱) وہ صلیب پر چڑھا تو اُس لعنت کے نشان کو برکت کا نشان بنا کر اُس کی شان کو بڑھا گیا۔ اُس کو پیمانہ لوگ قبول کریں تو اُن کی شان بڑھ جاتی ہے۔ وہ اگرچہ دولت مند تھا مگر تمہاری خاطر غریب بن گیا۔ تاکہ تم اُس کی غریبی کے سبب سے دو لہند ہو جاؤ (۲۔ کرنتھیوں ۸: ۹) وہ مر گیا تاکہ گناہ وہ موت ہمیشہ کے لئے نیست ہو جائیں وہ زندہ ہو گیا تاکہ ہم حیاتِ ابدی کو حاصل کریں۔

پس آے ناظرین! تجسمِ خدا کی کسرِ شان نہیں ہے بلکہ ہم عالمِ خاکی کے باشندوں کی قدر و قیمت کو بڑھانے اور ہمیں خاکِ مذلت سے اٹھا کر عرشِ بریں پر پہنچانے کے لئے خُدا تعالیٰ کی حکمت پر دلالت کرتا ہے خُداوند مسیح عرشِ بریں کو چھوڑ کر اس عالمِ سفلی میں آیا تاکہ ہم الوہیت (خُدا) سے متحد ہو کر حیاتِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کریں۔ آمین!

## مسیح کا مسل انسان

انجیل کی رُو سے انسانِ کامل وہ ہے جس کی ذاتِ ارثی، متعدی، کسبی، عملی اور خیالی ہر قسم کے گناہ سے بگلی آزاد ہو۔ اور عمد و سہو کے گناہ سے قطعی مبرا و منزہ ہو۔ گنہگاروں کی صحبت میں رہے پر گناہ اُس کی پاک طبیعت پر مطلق اثر انداز نہ ہو۔ اور خُداوند مسیح اس معیار کے مطابق انسانِ کامل ہے۔ کیونکہ ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے۔ بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔ تاہم بے گناہ رہا (عبرانیوں ۴: ۱۵) اور اُس کی ذات میں گناہ نہیں (۱ یوحنا ۳: ۵) اُس بیٹے کو مقرر کرتا ہے جو ہمیشہ کے لئے کامل کیا گیا۔ (عبرانیوں ۷: ۲۸) اسی واسطے ہر مسیحی ایماندار کو اُس کے قد کے اندازے تک پہنچنے کا حکم ہے۔ جب تک ہم سب کے سب خُدا کے بیٹے کے ایمان اور اُس کی پہچان میں ایک نہ ہو جائیں۔ اور کامل انسان نہ بنیں۔ یعنی مسیح کے پورے قد کے اندازے تک نہ پہنچ جائیں (افیسوں ۴: ۱۳)۔

خُدا نے انسان کو اپنی صورت پر پاک و راست پیدا کیا تھا۔ لیکن حضرت انسان نے گناہ کی کالک سے اپنی وہ فطری جلالی صورت بگاڑ لی۔ اور الہی صورت کے وہ نورانی خدو خال اور نقش و نگار گناہ نے اُس کے حافظ سے مٹا دیئے۔ اب دوبارہ وہ خُدا کی صورت کے ساتھ مشابہت پیدا کرے تو کیونکر کرے؟ اور مشکل یہ ہے کہ جس کی صورت پر (مشابہ) وہ بنا تھا وہ ناپید ہے۔ وہ اُس نور میں رہتا ہے جس تک کسی کی گذر نہیں ہو سکتی نہ اُسے کسی انسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے (۱۔ نمونہ تھیس ۶: ۱۶) پس جس جال کہ اُس شبیبہ اللہ کا کوئی مرئی نمونہ ہی انسان کے سامنے نہیں تو ناپیدہ کی صورت پر کیسے اپنی صورت کو بنائے؟ انسان کی اس بھاری مشکل کو حال کرنے کے لئے کلمتہ اللہ نے ملبوس انسانی اختیار کیا۔ اور اُس کی کامل انسانیت میں اُس کھوئی ہوئی الہی صورت کا پورا پورا سراغ ملتا ہے۔ کیونکہ الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے (کلیسیوں ۲: ۹) وہ اندیکھے خُدا کی صورت ہے (کلیسیوں ۱: ۱۵) اَلْمَدَاذِہ نَادِیدِی خُدا دیدنی نمونہ ہے۔ اور اُس کی صورت پر بحال ہونا ہی خُدا کی صورت پر بننا ہے۔ لازم ہے کہ ہم اُس کے بیٹے کے ہم شکل ہوں (رومیوں ۸: ۲۹) وہ اُس گمشدہ الہی صورت کا نمونہ ہے جس کے مطابق انسان بنایا گیا تھا۔ اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے۔ اُسی طرح اُس آسمانی کی صورت پر بھی ہوں گے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۴۹)۔

علامہ جامی شرحِ خصوصی الحکم میں ایک بہت ہی جامع معیار انسانِ کامل کا پیش کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ انسانِ کامل میں تین نشانیات ہیں۔ اول نشاۃِ روحانی۔ دوم نشاۃِ عنصری، سوم نشاۃِ مرآتی (ماخوذ از انسانِ کامل یا مظہرِ خُدا) چنانچہ اس بیان کردہ معیار کے مطابق بھی خُداوند مسیح کے سوا اور کوئی انسانِ کامل نہیں ہو سکتا۔ اور انجیل مقدس سے خُداوند کے متعلق یہ دعویٰ پورے طور پر ثابت ہے۔ ملاحظہ فرمائے۔

**اول۔ نشاۃِ روحیہ:** میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا ۱۰: ۳۰) میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں (یوحنا ۱۶: ۲۸: ۸: ۴۲)

ردہ حق اور زندگی میں ہوں (یوحنا ۱۴: ۶) الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے (کلیسیوں ۲: ۹)۔

دوم۔ نشاۃِ عنصریہ۔ اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی داہنی طرف بیٹا رہے گا۔ (لوقا ۲۲: ۶۹، ۱۷: ۲۲)

(۳۰:۲۶، ۲۳:۳۰)

سوم۔ نشاۃِ مسرانیہ: جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا۔ (یوحنا ۱۴: ۹ وہ اندیکھے خدا کی صورت ہے (کلیسوں: ۱: ۱۵))  
 خداوند مسیح کی نشاۃِ روحیہ و نشاۃِ عنصریہ کا قرآن شریف بھی مصدق ہے۔ اور اُسے روح اللہ اور انسان بھی کہتا ہے۔ پس خداوند مسیح کے سوا اور کوئی نبی رسول۔ آوتار۔ بھگت۔ گرورشی مُنی اور مہاتما وغیرہ انسان کامل نہیں ہوا۔ اگر کوئی دعویٰ کرے بھی تو بے ثبوت ہوگا۔ لوگ اپنی مذہبی کتابوں کے دعویٰ سے بڑھ کر دعویٰ کر کے حق کو چھپاتے۔ خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور یونہی لفظی کھینچ پھانسی سے بانیاں مذاہب کو اُن کے شخصی دعویٰ سے بڑھ کر کھانے کی فضول کوشش کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ اس بیسویں صدی کے مسیحی خداوند مسیح کی زمینی زندگی کے ایام میں موجود نہ تھے۔ اس لئے وہ اپنے نجات دہندہ کے چشم دید گواہ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اس زمانہ کے تمام حامیان مذہب اور مقدان اویان بھی اپنے اپنے بانیاں مذاہب کے ایام زندگی میں موجود نہ تھے۔ وہ بھی اُن کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم سب کے دعویٰ کی بنیاد مذہبی کتب ہی ہو سکتی ہیں۔ لہذا صدق دلی اور انصاف پروری سے برائے انفصال اور تحقیق صداقت اپنی اپنی کتب کی ورق گردانی کریں تو ثابت ہو جائے گا کہ آپ کے اپنے مذہبی بانیوں کے متعلق دعویٰ خوش فہمی و ہٹ دھرمی کے مبالغ اور شاعرانہ محامد سے زائد نہیں ہیں۔ ہم نے تو خداوند مسیح کا انسان کامل ہونا اپنے صحائفِ مطہر ہے سے ثابت کر دیا ہے۔ اور آئندہ کو جو کچھ ثابت کریں گے اپنے معتقدات سے سند دے کر کریں گے۔

## مسیح کن معانی میں خدا کا بیٹا ہے:

وہ پاکیزگی کی روح کا اعتبار سے مردوں میں سے جی اٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا (رومیوں: ۱: ۴) بیٹے کے بغیر باپ باپ نہیں کہلا سکتا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے بغیر باپ کا لفظ بے معنی ہے۔ اس لفظ میں معنی ڈالنے کے لئے بیٹے کا وجود لازمی ہے۔ اس صورت میں بیٹا گویا باپ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ بغیر بیٹے کے باپ کا تعارف لوگوں سے کروانا محال ہے۔ پس خدا کا ڈیٹا پر باپ کی حیثیت میں ظاہر کرنے کے معنی میں بھی مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا۔ (یوحنا: ۱۸) وہ فرمانبرداری کے اعتبار سے خدا کا بیٹا ہے۔ میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجے والے کی مرضی چاہتا ہوں (یوحنا: ۵: ۳) انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا۔ اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی (فلیپیوں: ۲: ۸) اسی واسطے باپ نے فرمایا کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں (متی: ۳: ۱۷) وہ الہی ذات ہونے کے سبب سے خدا کا بیٹا ہے ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ (یوحنا: ۱: ۱-۲) وہ اندیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔ (کلیسوں: ۱: ۱۵) وہ اُس کے جلال کا پر تو اور اُس کی ذات کا نقش ہے۔ (عبرانیوں: ۱: ۳) خدا سرچشمہ کلام ہونے کی حیثیت سے باپ کہلاتا ہے۔ اور کلام (مسیح) اُس سے صادر ہونے کی حیثیت سے بیٹا کہلاتا ہے۔ یہ روحانی اصطلاح ہے۔ اس لئے باپ اور بیٹے کے اس رشتہ کو روحانی طور پر کھنا چاہئے۔ اور کلام جب تک متکلم کی ذات میں مخفی رہے حکمت (لوگاس) کہلاتا ہے اور جب ظاہر ہو تو کلام۔ وہ کلام نفسی (حکمت) ہو کر خدا کی واحد ذات میں خفی رہتا اور کلام لفظی ہو کر مظہر خدا اور مخلوقات کی پیدائش کی علت ٹھہرتا ہے۔ باپ ازلی وابدی حقیقتِ مخفیہ ہے۔ اور بیٹا اُسی کی حیثیتِ ظہوری۔

بہت سے کوتاہ نظر لوگ مسیح کو خدا کا بیٹا کہنے میں خدا کی جوڑو کو وجود لازمی سمجھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ان کے اس خیال کی غیر معقولیت کو مبرہن کر کے مسیحی مسلمات کے مطابق ابن اللہ کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ سب سے پہلے ہم یہ پوچھ لینے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ اگر جوڑو کے بغیر بیٹا ہونا ممنوع ہے۔ تو حضرت ابوالبشر (آدم) کی ماں کون تھی۔ باپ کون تھا؟ جیسے آدم کی ماں اور باپ نہ تھے۔ ویسے ہی مسیح کا باپ جسمانی طور پر کوئی نہ تھا کیونکہ وہ مریم باکرہ سے پیدا ہوئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابن اللہ کہنے میں خدا کی جوڑو کا وجود لازمی ہے۔ تو عربی محاورہ میں ابن اللیل (سٹرک کا بیٹا) کہنے سے سٹرک کی جوڑو کا وجود بھی ضروری ہے۔ چونکہ مسافر کو سٹرک کے ساتھ خاص تعلق اور مناسبت ہوتی ہے۔ اس لئے عربی محاورہ میں مجازی طور پر اُس کو ابن السبیل کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ سٹرک کی بھی کوئی جوڑو ہے۔ جس سے مسافر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مسیح کو خدا کا بیٹا کہنے میں خدا کی جوڑو کا وجود ضروری نہیں۔ پھر یہ مسلمات سے ہے کہ خدا اور انسان کی صفات میں بجز مشارکت لفظی کے اور کوئی حقیقی اشتراک نہیں ہے۔ مثلاً خدا سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ عقیل ہے مرید ہے۔ اور انسان بھی سامع، باصر، عاقل، صاحب ارادہ اور بادشاہ ہے۔ انسان کانوں سے سنتا۔ آنکھوں سے دیکھتا۔ دماغ سے سوچتا۔ دل میں ارادہ کرتا اور تخت پر بیٹھ کر عدالت کرتا ہے۔ تو کیا خدا بھی انسان کے سے کان۔ آنکھ، دماغ، دل اور جسم رکھتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا سنتا دیکھتا سوچتا اور ارادہ کرتا اور عدالت کرتا انسان سے بالکل مختلف ہے۔ اور انسان کے ساتھ وہ ان امور میں محض مشارکت لفظی رکھتا ہے۔ اسی طرح خدا کا بیٹا ہونے اور انسان کا بیٹا ہونے میں بہت فرق ہے۔ انسان کا بیٹا بغیر جوڑو کے نہیں ہو سکتا جس طرح بغیر آنکھوں کے انسان نہیں دیکھ سکتا خدا کا بیٹا بغیر جوڑو کے ہو سکتا ہے۔ جیسے وہ بغیر اعضاء کے یہ سارے کام کرتا ہے۔

در اصل خدا مصدر ہونے کے لحاظ سے باپ ہے۔ اور بیٹا صادر ہونے کے لحاظ سے بیٹا ہے۔ خداوند مسیح کا قول ملاحظہ ہو۔ میں باپ میں سے نکلا اور دنیا میں آیا ہوں (یوحنا ۱: ۱۶: ۲۸: ۸: ۴۲) اور ابن اللہ مخلوق نہیں بلکہ مولود ہے۔ وہ اندیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے (کلسیوں ۱: ۱۵) اگر وہ محض ابن آدم ہی ہوتا تو لازم تھا کہ قانون ارثی کے مطابق اُس میں دنیوی والدین کی سی عادات و خصائل پائی جاتیں۔ لیکن ہم خوب دکھا چکے کہ اُس کی زندگی بھر کے تمام افعال و اقوال اور عادات و خصائل الہی زندگی۔ الہی خصلت اور الہی صفات کے عین مشابہ تھے۔ اسی لئے وہ جبرائیل کی گواہی کے مطابق خدا کا بیٹا تھا۔ اس سب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائے گا (لوقا ۱: ۳۵)

❖ یوحنا اصطباغی کی گواہی۔ چنانچہ میں نے دیکھا اور گواہی دی ہے۔ کہ یہ خدا کا بیٹا ہے (یوحنا ۱: ۳۴)

❖ یوحنا رسول کی گواہی۔ یسوع ہی خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ (یوحنا ۲۰: ۳۱) متن ایل کی گواہی۔ آے ربی تو خدا کا بیٹا۔ تو اسرائیل کا بادشاہ ہے

(یوحنا ۱: ۴۹) شاگردوں کی گواہی انہوں نے اُسے سجدہ کر کے کہا۔ یقیناً تو خدا کا بیٹا ہے (متی ۱۴: ۳۳)۔

❖ پطرس کی گواہی۔ تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے (متی ۱۶: ۱۶)

❖ رومی صوبہ دار کی گواہی۔ یہ آدمی بے شک خدا کا بیٹا تھا۔ (مرقس ۱۵: ۳۹)

❖ پولوس رسول کی گواہی۔ اور فوراً عبادت خانوں میں یسوع کی منادی کرنے لگا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے (اعمال ۹: ۲۰)

❖ شیاطین کی گواہی۔ آے یسوع خدا تعالیٰ کے بیٹے (مرقس ۵: ۷؛ متی ۸: ۲۹؛ لوقا ۸: ۲۸)

❖ مسیح کا اپنا اقرار۔ میں خدا کا بیٹا ہوں (یوحنا ۱۰: ۳۶)

❖ خُدا کی گواہی۔ یہ میرا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں (متی: ۱۷: ۵)

پس خُداوند مسیح ابن اللہ کی اہمیت کو جسمانی و انسانی طور پر قیاس کرنا کفر اور جہالت ہے۔ اگرچہ مسیحی ایماندار لوگ جنہوں نے نئی پیدائش حاصل کی ہو خُدا کی بیٹے کہلاتے ہیں۔ مگر مجازی معنی ہیں۔ اور مجاز حقیقت کی فرع ہے۔ ازیں جہت اگر خُدا کا کوئی حقیقی بیٹا نہ ہو تو مجازی کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقی بیٹا مسیح ہے جس کو اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔ اور الفاظ اکلوتا بیٹا ہی سے بخوبی ثابت ہے کہ جس معنی میں مسیح خُدا کا بیٹا ہے اُس معنی میں اور کوئی شریک نہیں۔ (یوحنا: ۱۴: ۱۸؛ ۱۶: ۳) اور ایماندار لوگ تو مسیح پر ایمان لا کر اُس کی معرفت خُدا کے بیٹے کہلا سکتے ہیں۔ لیکن جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا (یوحنا: ۱۲) اور مسیح کی معرفت ایماندار خُدا کے ناپالک (لے کر پالے ہوئے) فرزند بن جاتے ہیں نہ کہ حقیقی (گلمستوں ۴: ۵) اب جو کوئی بیٹے کا انکار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی نہیں۔ اور جو بیٹے کا اقرار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی ہے (۱- یوحنا: ۲۳) جو بیٹے پر ایمان لاتا ہے ہمیشہ کی زندگی اُس کی ہے۔ لیکن جو بیٹے کی نہیں مانتا زندگی کو نہ دیکھے گا۔ بلکہ اُس پر خُدا کا غضب رہتا ہے۔ (یوحنا: ۳۶) یہ ہیں ابن اللہ کے صحیح معنی جو مسیحی لوگ مانتے ہیں۔ اور چغند طینت لوگ خواہ مخواہ کی بھونڈی اور کُفر آمیز تاویلیں اس مبارک مسئلہ ک کر کے اپنی اوچی ذہنیت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ دراصل وہ نور کے مخالف ہونے کے باعث ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ نور دنیا میں آیا ہے اور آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا۔ اس لئے کہ اُن کے کام بُرے تھے۔ کیونکہ جو کوئی بدی کرتا ہے وہ نور دشمنی رکھتا ہے۔ اور نور کے پاس نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو کہ اُس کے کاموں پر ملامت کی جائے (یوحنا: ۲: ۱۹)۔

## مسیح انسان اور خُدا کا برزخ کامل

خُداے واجب الوجود اور الامحدود و محیط کلہ کا ممکنات و محدثات اور محدودات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا جب تک ایک واسطہ فی مابین الواجب و ممکن نہ ہو۔ اور واسطہ بھی وہی ہو سکتا ہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہو کر ربط حادث بالقدیم قائم کرنے کی صلاحیت رکھے۔ اس مسئلہ کے متعلق کہ آیا واجب و ممکن میں واسطہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تین فریق ہیں۔ اور سب کے خیالات میں اختلاف ہے۔

❖ واحده الوجود کے قائلین کے نزدیک تو واسطہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ وہ دوئی کے مطلق قائل نہیں۔ چنانچہ جب دوئی نہ ہوئی تو واسطہ کی ضرورت نہ رہی۔

❖ وہ لوگ ہیں جو واسطہ کو تو ضروری مانتے ہیں۔ مگر اُن کا ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔ جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا۔ اور وہ واسطہ کی تین صورتیں مانتے ہیں۔

### اول۔ واسطہ فی العروض۔ کسی صفت کے ساتھ حقیقتاً و بالذات واسطہ ہی متصف ہو۔ اور ذی واسطہ میں وہ

صفت مطلقاً نہ ہو۔ مگر چونکہ واسطہ و ذی واسطہ میں ایک طرح کا تعلق و ملبس ہے اس بنا پر ذی واسطہ کی طرف بھی اُس صفت کی نسبت کر سکتے ہیں۔ مثلاً

<sup>2</sup> اس عقلی فلسفہ کے لئے ہم علامہ اہلس۔ ایم پال صاحب کی تصنیف "انسان کامل یا مظہر خدا" کے قرضدار ہیں۔ اور اُس کو نقل کرنے میں بعض جگہ معمولی سی لفظی تبدیلی اختصار کے لئے۔ پورا تذکرہ اُن کی تصنیف میں ملے گا" (مصنف)

ریل گاڑی کے بیٹھنے والے حقیقت میں متحرک نہیں ہیں۔ بلکہ ریل گاڑی متحرک ہے۔ لیکن ایک خاص مناسبت کے لحاظ سے ہم ریل گاڑی کے بیٹھنے والوں کو بھی متحرک کہہ سکتے ہیں۔

**دوم۔ واسطہ فی الاثبات۔** کوئی صفت ذی واسطہ میں موجود ہو اور واسطہ میں اصلاً موجود نہ ہو اور واسطہ میں اصلاً موجود نہ ہو اور واسطہ میں اصلاً موجود نہ ہو۔ مثلاً رگنریز واسطہ ہے۔ لیکن صفت رگنریز ذی واسطہ یعنی کپڑے میں پائی جاتی ہے۔ لیکن خود رگنریز میں یہ صفت موجود نہیں ہوتی۔ ہاں یہی ممکن ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو کلا یا جزا رگنریز کر دے۔ مطلب یہ کہ جو صفت مستقل طور سے ذی واسطہ یعنی کپڑے میں موجود ہے وہ بعینہ واسطہ یعنی رگنریز میں موجود نہیں ہے۔

**سوم۔ واسطہ فی الثبوت۔** وہ صفت واسطہ و ذی واسطہ دونوں میں حقیقیہ موجود ہو۔ لیکن واسطہ میں بطور علت اور ذی واسطہ میں بطور معلول ہو۔ مثلاً لکھتے وقت قلم کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ پس ہاتھ حرکت میں واسطہ اور قلم ذی واسطہ ہے۔ حرکت دونوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن ہاتھ کی حرکت اور قلم کی حرکت معلول ہے۔ وسائط ثلاثہ کی تشریح و تفصیل سے خوب روشن کہ خدا کا واسطہ ہوتا عالم کی ذات و صفات میں بمعنی فی العروض الثبوت ممکن نہیں۔ اس لئے کہ واسطہ فی العروض سے لازم آتا ہے کہ جتنی صفات مخلوقات میں ہیں حقیقہ خدا ہی کی صفات ہیں۔ اور مخلوقات کی طرف ان کی نسبت محض مجازی ہے۔ اس کے ماننے میں یہ قباحت ہے کہ مخلوقات میں اکثر صفات ذمیمہ اور اوصاف ذنیہ ایسی ہیں جن کی نسبت خدا کی ذات کی طرف کرنا سراسر کفر و گستاخی ہے۔ واسطہ فی الثبوت ہونا اس لئے غلط ہے کہ اول تو اس میں وہی قباحت پائی جاتی ہے جس کی تردید ابھی کی جا چکی ہے۔ دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے، کہ چونکہ معلول تخلف علت سے محال ہے، اس لئے مخلوقات کی صفات قدیم اتنی پڑیں گی، اور یہ عقلی و نقلی طور پر باطل ہے۔ پس واسطہ فی الاثبات میں کسی قدر گنجائش ہے، یعنی کی باری تعالیٰ جو صفات اپنی مخلوقات کو دیتا ہے خود ان صفات سے مبرہ ہے۔ اور خالق و مخلوق کی صفات میں بحجز مشارکت لفظی کے اور کوئی مناسب و مشابہت نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا واسطہ صرف خالق کے وجود کی ثابت کرتا ہے۔ جیسے مصنوع اپنے صانع اور مکتوب اپنے کاتب پر دلالت کرتا ہے، اس قسم کے واسطہ کو مظہر ناقص کہتے ہیں۔ اور یہ اسلئے مفید مطلب نہیں کہ یہ ہم پہلے ہی مانتے ہیں۔ واسطہ تو ایسا چاہیے جو حادث و قدیم اور ممکن و واجب دونوں کو ملائے۔

✚ وہ فریق ہے۔ جو واجب اور ممکن کے درمیان ایک ایسے واسطہ کے قائل ہیں جس میں وجوب اور امکان دونوں صفتیں موجود ہوں۔ تاکہ ربط حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ اور اس واسطہ کو وہ انسان کامل اور مظہر جامع اور برزخ کبریٰ کہتے ہیں۔

لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ "انسان کامل: مخلوق اور حادث ہے۔ اور واجب و ممکن کے درمیان برزخ وہ ہو سکتا ہے جو وجوب و امکان ہر دو طرح کی صفات سے منصف ہو۔ چنانچہ حکما متفسفین اور ماہرین طبعیات دور حاضرہ نے تجربات کی بنا پر موجودات کے ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے ساتھ ربط دینے کے لئے برزخ کے وجود کو لابدی مانا ہے۔ مثلاً

✚ البتہ جمادات و نباتات کا برزخ مرجان (مونگا) کو مانا ہے۔ مونگا پتھر ہونے کے لحاظ جہازی خاصیت رکھتا ہے۔ اور قوت نامیہ رکھنے کے باعث نباتی خاصیت بھی رکھتا ہے۔ لہذا جمادی و نباتی خصوصاً اس میں اجتماع ہے۔ اس لئے وہی ان برزخ و طبقات کا برزخ ہے۔

✚ زمانہ حاضرہ میں بعض مغربی ممالک میں ایک گوشت خور درخت دریافت ہوا ہے جو حیوانوں اور پرندوں کا گوشت ایسے ہی کھاتا ہے، جیسے شکاری درندے گوشت کھاندارندوں کی خاصیت ہے۔ پس یہ درخت طبقات نباتات و حیوانات ہر دو کی خصائص رکھتا ہے۔ اس لئے یہی ان ہر دو طبقات کا برزخ ہے۔

✚ طبقہ حیوانات طبقہ انسانی کا برزخ بندرمانا گیا ہے۔ اس جانور میں بعض ایسی صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کو خواہ مخواہ خصائص فوق الحیوانات کہنا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی معمولی حیوانی خاصیات دیگر تمام حیوانات سے ملتی ہیں۔ اور دوسری طرف اس کی خاص اعلیٰ صفات ہیں۔ انسانی طبقہ کی دائمی خاصیتوں کے مشابہت کو دیکھ کر ہی ڈارون صاحب نے بندر سے انسان کا ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

✚ اب طبقات انسانی والہی کے درمیان "انسان کامل" کو برزخ مانا جاتا ہے لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ انسان کامل کا وجود و قدامت سے کوئی تعلق نہیں وہ محض ممکن اور حادث ہے۔ وہ اگرچہ بدرجہ انتہا کمالیت کو حاصل کر لے تو بھی وہ مخلوق اور حادث ہی رہے گا۔ اس صورت وہ گڑھا جو حدوث و قدامت اور وجود و امکان کے درمیان حائل ہے کس طرح بھرا جا سکتا ہے؟ چنانچہ انسان و خدا کا برزخ وہی ہو سکتا ہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہو کر ربط حادث بالقدیم قائم کرنے کی کامل و اکمل صلاحیت رکھے۔ یعنی وہ کامل انسان اور کامل خدا ہو۔ پس کلمۃ اللہ جو تکوین کائنات کی علت ہے۔ اور بحیثیت تخلیق خدا اور کائنات کا درمیانی ہے وہی جسم دھار کر انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ تاکہ وہ خدا کا کامل ہونے کے ساتھ انسان کامل بھی ہو سکے اور برزخیت کے فرض کو بطریق احسن انجام دے سکے۔ چنانچہ خداوند مسیح کے سوا اور کوئی انسان و خدا کا برزخ نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ خدا ایک ہے اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع جو انسان ہے (۱۔ تمثیلتھیس ۲: ۵)۔

بالفرض محال اگر انسان کامل بھی برزخ ہو سکتا ہے تو پھر بھی خداوند مسیح کے سوا کسی انسان کامل کا وجود ناپود ہے۔ جیسا ہم پیشتر نشاۃ ثلاثہ میں علامہ جامی کا نظریہ بارہ بارہ انسان کامل پیش کر کے ثابت کر چکے ہیں۔ اُس معیار کے مطابق سوائے مسیح کے کسی اور کو انسان کامل ثابت کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ پس انجیل کا دعویٰ ہے کہ خداوند مسیح کامل انسان اور کامل خدا ہیں اور خدا اور دنیا کے حقیقی درمیانی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ راہ حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا (یوحنا ۱۴: ۶)۔ یہ ایک کھلی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب تک کسی شخص کے ساتھ واقفیت نہ ہو۔ اُس سے محبت کرنا ممکن ہے۔ واقفیت اور محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسری کا وجود محال ہے۔ جہاں واقفیت ہوگی وہاں محبت ہو سکے گی اور جہاں محبت ہوگی وہاں ضرور پہلے ہی سے واقفیت ہوگی۔ دنیا میں سینکڑوں ایسے شہر ہیں جن کے میں نام سے بھی واقف ہوگی۔ دنیا میں سینکڑوں ایسے شہر ہیں جن کے میں نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔ اور نہ اُن کے باشندوں کو جانتا ہوں۔ اس لئے میں اُن سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب تک کوئی شخص میرا جان پہچان نہ ہو۔ روشناس نہ ہو میری اور اُس کی کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔ تو بھلا کس صورت میں اُس سے محبت کر سکتا ہوں؟ پس اسی طرح اگر ہم خدا سے واقف نہیں اور اُس کو جاننے نہیں۔ تو اُس کی عبادت جو محبت پر مبنی ہے کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو ایک نامعلوم خدا کی اور ایسی عبادت کسی حقیقت کی نہ ہوگی بلکہ وہم کی۔ ناواقف ہستی کی نامعلوم خیالی خدا کی پس خدا سے محبت کرنے اور اُس کی عبادت کرنے کے لئے اُس سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور اُس سے واقفیت نہ تو محض مشاہدہ فطرۃ سے ہو سکتی ہے۔ نہ عقلی دلائل اُس نا دیدہ پردہ نشین ہستی سے ہمارا تعارف کروا سکتی ہیں اور نہ ہی الہام کے لفظی و تمثیلی بیانات اُس کا یقینی علم ہمیں حاصل کروا سکتے ہیں اُس سے واقفیت حاصل کرنے۔ اُس کی ماہیت اور صفات کا صحیح تصور کرنے کے لئے مظہر خدا کی ضرورت ہے۔ اور بغیر مظہر کے خدا کا صحیح اور یقینی تصور ہی محال ہے۔ اور وہ مظہر جیسا ہم پہلے یقینی دلائل سے ثابت

کر چکے خُداوند مسیح ہے جس نے فرمایا جس نے مجھے دیکھا اُس نے باب کو دیکھا۔ پس جو کوئی خُداوند مسیح (مظہر خُدا) میں ہو کر خُدا کی عبادت کرتا ہے۔ وہ یقیناً ایک معلوم ایک واقف خُدا کی عبادت کرتا ہے۔

اب شاہد کوئی یہ سوال کرے کہ خُداوند مسیح اگر نادریدہ خُدا کی ظاہری صورت ہے۔ جس کو دیکھ کر ہم خُدا سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ اور ہماری خُدا بینی کی خواہش کا جواب مل سکتا ہے۔ تو اب صدیوں سے مسیح بھی زایدہ ہے۔ وہ ظاہری مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ دو ہزار برس قبل جب وہ مجسم صورت میں موجود تھا اسی وقت لوگ اُس میں خُدا کو دیکھ سکتے تھے۔ اب اس زمانے کے لوگوں کے لئے خُدا پھر نامعلوم ہے۔ اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل! مور قابلِ غور ہیں۔

❖ فوق العادت امور میں استمرار و دوام جائز نہیں۔ ورنہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد میں ناکام رہیں گے۔ اور فطرت کے عام معمولی واقعات میں شامل ہو کر فوق الفطرت نہ رہیں گے۔ اور لوگوں کو اُن سے حیرت و استعجاب بھی ہوگا۔ مثلاً سورج کا وجود اگرچہ سرمایہ غرائب وہ نادر ہے۔ لیکن چونکہ ہم اُسے روز دیکھتے ہیں اس لئے نہ تو اُس کے طلوع و غروب سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی اُس سے حیران ہوتے ہیں۔ مظہر خُدا (مسیح) کا زینت افزائے کا شانہ گیتی ہونا سب سے بڑا نادر اور فوق العادت واقعہ تھا۔ اگر وہ ہمیشہ ظاہری و دیدنی صورت میں قائم رہتا تو لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہ ہوتا۔ دُنیا نے آگے ہی اُس کی کیا قدر کی کہ وہ اور اس دنیا میں رہتا۔ خُدا اپنے بیٹے کو ہمیشہ جسمانی صورت میں اس خرابستان میں رکھ کر اپنی بے قدری اور تحقیر گوارا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ غیور خُدا ہے۔

❖ خلقت اور خُدا کے درمیان بہت سے واقعات کا ظہور اُس کے صعود فرمانے کے ساتھ وابستہ اور مشروط ہے۔ اس لئے اگر وہ اس دیدنی عالم کو چھوڑ کر صعود نہ فرماتا تو وہ واقعات ظہور میں نہ آتے۔ علاوہ ازیں عہد عتیق و جدیدی میں اُس کے دوبارہ اس دنیا میں آنے کے متعلق پیشین گوئیاں موجود ہیں اُن کا پورا ہونا بھی ضروری تھا۔

❖ انجیل مقدس اُس کا مکمل فوٹو ہے۔ اُس کے مطالعہ سے اُس کا دیدار حاصل کیا جاسکتا ہے۔

❖ خُدا کا مظہر مسیح اور مسیح کا مظہر اُس کی کلیسیا ہے۔ نادریدہ مسیح کی دیدنی صورت کلیسیا ہے۔

لیکن موجودہ کلیسیا مسیح کی ناقص حیثیت ہے۔ اس لئے وہ اُس کے نورانی خدو خال کو زیادہ صفائی کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتی یعنی پورے طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ جس نے مجھے دیکھا اُس نے مسیح کو دیکھا۔ دُھندلے آئینے کی طرح مسیح کی کامل مظہر نہیں ہے۔ اب ہم کو آئینے میں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ اور جب کلیسیا اُس جلالی صورت پر درجہ بدرجہ بدلتی اور ترقی کرتی جائے گی۔ تو ایک دن اُس کے چہرے سے مسیح کا جلال ایسے منعکس ہوگا جیسے صاف آئینے میں (۲۔ کرنٹیوں ۳: ۱۸) ایک مصور ایک تصویر کو جو فنی نکتہ نگاہ سے نہایت اعلیٰ ہے سامنے رکھ کر اُس کی نقل ایک دوسرے کاغذ پر بناتا ہے۔ اُس کا خاکہ کھینچتا ہے۔ گاہے مٹاتا اور گاہے پھر بناتا ہے۔ اگر اُس کی اُس نامکمل تصویر کو دیکھ کر کوئی کہے کہ یہ تصویر اچھی نہیں بہت بھدی ہے تو اس سے اصل تصویر کا نقص ثابت نہ ہوگا۔ اور عقلمند آدمی فوراً سوچ لے گا کہ یہ نقل ابھی نامکمل ہے۔ کسی وقت یہ ہو بہو اصل کے مطابق بن جائے گی۔ اسی طرح کلیسیا کا اصل نمونہ مسیح ہے جس کے سانچے میں وہ ابھی دھل رہی ہے۔ اور تاحال ناقص حالت میں ہے۔ لیکن جب کامل آئیگا تو ناقص اتار ہیگا (۱۔ کرنٹیوں ۱۳: ۱۰) پس کلیسیا مسیح کا مظہر ہے اور درجہ بدرجہ اُس کی ہم شکل بن رہی ہے۔

خُداوند مسیح کی آمد نے خُدا کے وجود باجود کے متعلق پیدائش شدہ ہتمام توہماتِ فاسدہ اور اظہانین باطلہ کو خرقہ پارنیہ کی طرح تار تار کر کے رکھ دیا۔ اگر کوئی گوشہ تنہائی میں یکسوئی قلب کے ساتھ بیٹھ کر اپنی فرصت کی قیمتی گھڑیوں میں اس تعلیم سعادت تنظیم پر صفا باطنی اور منصف مزاجی سے غور

و غرض کرے تو وہ بغیر ضمیر سے جنگ کئے خُداوند مسیح کو مظہرِ خُدا اور برزخِ کبریٰ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس طریق پر ثواب اور مسئلہ لا جواب کو سمجھنے کے لئے دیدہ بینا اور ذہن رسا چاہئے۔ چونکہ تعصب اور مسئلہ تجسم باہم ضدین ہیں۔ اس لئے ایک ہی وقت میں یہ دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ پس غرض ہے کہ تعصب کو چھوڑ کر اس پر غور فرمائیے اور یونہی کسی نا اہل شخصیت کو کُرسی برزخیت پر زبردستی بٹھانے کی سعی نہ فرمائیے۔

## کلام مجسم کی تین صورتیں

کلام مجسم کی تین صورتیں ہیں۔ اور انہیں کو ہم ان کتاب کے گویا اعضاءِ ریسہ ٹھہرا کر اب تک بحث کی ہے۔ اب ان کی اجمالی طور پر معرضِ تحریر میں لانا مناسب اور گویا کتاب کے منتہائے مقصود کو خلاصہ بیان کرنا ہوگا۔ وہ تین صورتیں یہ ہیں۔

✚ کائنات کلام مجسم ہے خُدا نے کہا اور وہ موجود ہو گئی۔ یعنی جو کلام اُس کے منہ سے صادر ہوا اُس نے کائنات کی صورت میں جسم اختیار کر لیا۔ اس کا مفصل بیان عقل اور مذہب کے زیر عنوان کیا جا چکا ہے۔ اور تجسم الہی کے بیان میں چھوٹی سرخی موجودات اور کد کا علم کے ماتحت اجمالی طور پر اس پر بحث کی جا چکی ہے۔

✚ بائبل مقدس کلام مجسم ہے۔ کلام نفسی جو ذاتِ الہی میں خفی تھا کلام لفظی کی صورت میں ظاہر ہو کر کتابی شکل میں مرتب ہوا۔ اس کو الہام کہتے ہیں۔ الہام کی ضرورت کے زیر عنوان اس کو بالتفصیل بیان کیا گیا۔ اور تجسم الہی کے بیان میں چھوٹی سرخی الہام اور خُدا کا علم کے ماتحت اجمالی طور پر اس پر بحث ہو چکی ہے۔

✚ کلام مجسم کے تیسرے معنی ہیں کہ ذاتِ الہی کے اقنوم ثانی نے جسم اختیار کیا جس کا مظہرِ خُدا کہا جاتا ہے۔ یہ کلام مجسم کی انتہائی کمالیت ہے جس سے خُدا کی ذات و صفات کا ثبوتی تصور اور یقین علم حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ تجسم الہی کے زیر عنوان اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

## تجسم کے فوائد

✚ خُدا کی ذات و صفات کا یقینی اور صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ ایک معلوم خُدا ثابت ہوتا ہے۔

✚ انسان فطرتی طور پر پنکڑ محسوس کا خوگر ہے۔ اس لئے اُس کی خُدا بینی کا جواب مظہر دیتا ہے۔

✚ جنسی مغائرت محبت کی مانع ہے۔ خُدا اور انسان میں جنسی مغائرت مسلم ہے۔ تجسم کے ذریعے یہ وقت دور ہوتی اور انسان صحیح معنوں میں خُدا سے محبت کر سکتا ہے۔

✚ تجسم کے ذریعے ذاتِ الہی کے اتقانیم ثلاثہ کا سرستہ راز رکھتا ہے جو بصورت دیگر محال ہوتا ہے۔

✚ تجسم کے ذریعے انسان کی نجات کا انتظام ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تقاضا ہے عدل الہی انسان کی جان کے عوض میں ایک عوضی قربانی کی ضرورت تھی۔ تاکہ انسان کی جان موت سے رہائی پائے۔ اور قربانی کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ پس اقنوم ثانی جسم میں ظاہر ہوا تاکہ انسان کی جان کا مبادلہ ٹھہرے۔

✚ خدا نے انسان کو اپنی صورت بگاڑ لی اور ضرور ہے کہ وہ دوبارہ خدا کی صورت پر بنے۔ مگر جس کی صورت پر اُس کو بننا چاہئے وہ نادیدہ ہے۔ اس لئے نادیدہ کی صورت پر کیسے ہے؟ ضرور ہے کہ الہی صورت کا کوئی ظاہری و دیدنی نمونہ اُس کے سامنے ہو۔ پس وہ نمونہ مظہرِ خدا (مسح) میں ملتا ہے۔ اُس کی صورت پر بننا ہی خدا کی صورت پر بحال ہونا ہے۔

✚ خدائے واجب الوجود اور انسان ممکن الوجود محدود کے درمیان حد فاصل ہے۔ جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھتی ہے۔ ان دونوں کے ملاپ کے لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ اور واسطہ وہی ہو سکتا ہے جو جو جسے حادث اور جو جسے قدیم ہو۔ تاکہ ربطِ حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ پس یہ مشکل بھی تجسم کے ذریعے دور ہوتی ہے۔ اور انسان کا اُس کے ذریعے سے خدا سے ملاپ ہو جاتا ہے۔

✚ تجسم کے ذریعے انسان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ مظہر کے ایک معنی ہیں "انسانیت نما الوہیت" جس نے ایمانداروں کو الوہیت نما انسان بنا دیا۔ وہ انسانوں کے مشابہ ہو گیا جس سے ایماندار انسان خدا کا مشابہ ہو گئے۔

اب دُنیا کی عقلیں گناہ کی شدت سے اس قدر فاسد اور تاریک ہو گئی ہیں کہ وہ کسی صورت اس تعلیم سعادت تنظیم کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اگر خدا نادیدہ و پوشیدہ اور فوق الفہم و ادراک رہے تو لوگ اُس کو کسی دیدنی وہ ظاہری اور ممکن الفہم صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی صورت ظاہری میں ظاہر نہ ہو تو اُس کی ہستی کے متعلق شکوک میں پڑ کر آخر اُس سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی دیدنی صورت میں تجسم اختیار کر کے مرئی و مجسم اور ممکن الفہم ہو جائے اور اُن کی خدا بینی کی فطری خواہش کا جواب دے تو لوگ اُس کو محض ایک خدا سیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کر اُس کی الوہیت و خدائی کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ اب بتائیے ان دو صورتوں کے علاوہ اور کون سی تیسری صورت ممکن ہے جس سے خدا انسان کی خدا بینی کی خواہش کو پورا کرے؟ میں نے تیری خبر کان سے سنی تھی۔ پر اب میری آنکھ تجھے دیکھتی ہے۔ (ایوب ۴۲ : ۵)۔

## گناہ

ہر گناہ زنگیست بر مزاتِ دل      دل شود زین زنگ باخوار و نخل  
چوں زیادت گشت دل را تیرگی      نفس دوں را پیش گرد و خیرگی

## آغازِ گناہ

تمام مذاہبِ عالم اور ادیانِ دہر کسی نہ کسی صورت میں گناہ کے وجود کے قائل ہیں۔ اگرچہ گناہ کے آغاز کے متعلق سب کے خیالات اور آراء میں اتفاق کلی نہیں۔ بلکہ بعض خیالات اور فلسفے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ تاہم یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ گناہ دُنیا میں ضرور موجود ہے۔ بعض اُس کو اگیان اودیا اور بھرمانتے ہیں۔ بعض اُس کو طبع انسانی کا خاصہ ذاتی ماننے ہیں اور خدا کو نیکی و بدی ہر دو کا موجد تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ گناہ کا وجود مسلم الثبوت ہے۔ اور کوئی صاحبِ بصیرت اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور بدی و نیکی ایسی دو متضاد اشیاء ہیں جن میں تا حشر کبھی اتحاد و مطابقت نہیں ہو سکتی۔ کا فہ انام پر کوئی ایسی زبان اور لُغت یا کتاب نہیں جس میں گناہ کے وجود کے ثبوت میں الفاظ چاہئے "انہ چاہئے" واجب "نا واجب" "جائز" "نا جائز" "اروا" "ناروا" مناسب "نا مناسب" "اچھا" اور بُرا "وغیرہ نہ پائے جاتے ہیں۔ اور آج تک کوئی ایسی سوسائٹی معرضِ ظہور میں نہیں آئی جس نے ان الفاظ کے مفہوم کو

وہم سے تعبیر کر کے ان کے زور کو کھود یا ہو۔ ہر فرد بشر اپنے وجدانیات میں اس حقیقت نفس الامری کو بزور محسوس کرتا اور ان ٹیوٹیشنل گواہی رکھتا ہے۔ ضعیف سے ضعیف ضمیر بھی جائز و ناجائز اور واجب و ناجائز کی کیفیت سے آگاہ ہے۔ گناہ ایک ایسی حقیقت ہے جو گویا جبری طور پر انسان کو اپنے وجود کا قائل بناتی ہے۔ زبان سے کوئی اس کا انکار کرے تو کرے لیکن دل سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اب جس طرح یہ صحیح ہے کہ گناہ کے آغاز کے متعلق تمام مروجہ عقائد اور فلسفے باہم متضاد متباہن ہیں۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ایک ہی وقت میں ہم ان سب کو صحیح و درست نہیں سمجھ سکتے۔ اب اس جگہ ہم تمام دیگر خیالات و نظریات کو چھوڑ کر صرف بائبل مقدس کی روشنی میں آغازِ گناہ کے خیال کو بدلائل عقلیہ اور براہین نقلیہ پیش کریں گے۔ جس سے گناہ کی پوری حقیقت ناظرین پر کھل جائے گی۔

بائبل مقدس کا بیان ہے کہ خُدا تعالیٰ پاک و قدوس ہے۔ بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو۔ کیونکہ میں جو خُداوند تمہارا خُدا ہوں پاک ہوں (احبار ۱۹: ۲) اور ایک (فرشتے) نے دوسرے کو پکارا اور کہا۔ قدوس۔ قدوس۔ قدوس رب الافواج ہے۔ ساری زمین اُس کے جلال سے معمور ہے (یسعیاہ ۶: ۳؛ مکاشفہ ۴: ۱۵؛ ۸: ۴؛ خُداوند کا شکر کرو اس لئے کہ وہ نیک ہے (۱۔ توارخ ۱۶: ۳۴) خُداے قدوس و برحق جو تمام مصنوعاتِ مریئہ و غیر مریئہ اور مخلوقاتِ سفلیہ و علویہ کی علتِ فاعلی ہے وہ اپنی طبیعت و فطرت کے خلاف کسی شے کو ناپاک نہیں پیدا کر سکتا۔ کیونکہ پاک طبیعت کی علت سے ناپاک طبیعت کے معلول کا صدور عقلاً اور نقلاً محال ہے۔ جب وہ خود پاک ہے تو اُس نے مخلوقات کو بھی پاک ہی پیدا کیا۔ چنانچہ بائبل مقدس کا بیان ہے کہ جب خُدا نے سب کچھ پیدا کیا تو کہا کہ "اچھا ہے" (پیدائش ۱: ۱۰؛ ۱۲؛ ۱۸) اور انسان کی پیدائش کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ پھر خُدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبہ کی مانند بنائیں (پیدائش ۱: ۲۶) اور خُدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (آیت ۲۷) خُدا نے انسان کو راست بنایا۔ (واعظ ۷: ۲۹) یعنی خُدا نے انسان کو پاک و راست صاحب ارادہ اور فاعل مختار بنایا۔ خُدا کی صورت پر پیدا کئے جانے سے ہی مراد ہے۔ اور خُدا نے انسان کو تمام مخلوقات پر خلیفہ اور سردار مقرر کیا (پیدائش ۱: ۲۶؛ زبور ۸: ۵-۸) اور خُدا کی حکومت دیگرانی مخلوقات کے علاوہ انسان فرشتگان پر بھی تھی اور ہے۔ اور انسان بطور نائب خُدا کے تمام دُنیا پر حکمران ٹھہرایا گیا۔ اور خُدا نے خالق و حاکم ہونے کی حیثیت سے آدم کو چندا امر نوا ہی بھی دئے کیونکہ اُس میں اخلاقی وجود و فاعل مختار ہونے کے باعث خُدا کی مرضی کے مطابق یا مخالف عمل کرنے کی قوت فطرتاً موجود تھی۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل اُس نے کھایا اور خُدا کے فرمان کی نافرمانی کی۔ شجرِ ممنوعہ کے بیان کو تمثیلی سمجھئے یا اور کوئی اُس کی تاویل کیجئے۔ تاہم یہ ضرورت ثابت ہے کہ خُدا کا حکم آدم و حوا نے عدول کیا۔ اور وہ خُدا کی حضوری سے خارج کئے گئے۔ پس گناہ مخلوق کا مخلوق ہے۔ خُدا کا مخلوق آدم اور آدم کا مخلوق گناہ۔ جس طرح پوتا اپنے دادا کا مولود نہیں ہوتا بلکہ اُس کے مولود کا مولود ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ کی ابتدا انسان سے ہوئی نہ کہ خُدا سے جب انسان کی طبیعت گناہ کے باعث بگڑ کر ناپاک و فاسد ہو گئی تو خُدا کی پاکیزہ طبیعت کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہی۔ اس واسطے تضاد و تقادس طابع کے باعث خُدا انسان میں جُدائی ہو گئی۔ کیونکہ دو متضاد طابع کا اجتماع و اتحاد ناممکن ہے۔ یعنی اجتماعِ ضدین محال ہے۔ یہ ہے آغازِ گناہ کے متعلق بائبل کی معقول فلاسفی۔

## ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ ناہمی سے یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ جبکہ خُدا نے علام الغیب اور ہمہ دار ہے تو ضرور اُس کو آدم کے گنہگار ہونے کا اُسکی تخلیق سے پہلے ہی علم ہوگا۔ اور جب یہ علم تھا تو اُس نے دیدہ و دانستہ اُس کو گناہ میں گرنے ہی کیوں دیا؟ اگر آدم گناہ میں نہ گرتا تو آج دُنیا کو گناہ اور اُس کے نتائج دُکھ و موت کے تلخ تجربے اٹھانے نہ پڑتے۔ اس سوال کے جواب میں اس قدر عرض ہے کہ خُدا عالم الغیب ہے اور ساتھ ہی اُس کا علم لا تبدیل بھی ہے۔ خُدا کی صفتِ عالم

الغیب ہے اور ساتھ ہی اُس کا علم لا تبدیل بھی ہے۔ خُدا کی صفتِ عالم الغیب کے متعلق بائبل کا بیان ملاحظہ ہو۔ میں خُدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں۔ جو ابتدا ہی سے انجام کی خبر دیتا ہوں۔ اور ایامِ قدیم سے وہ باتیں جو اب تک وقوع میں نہیں آئیں بتاتا ہوں (یسعیاہ ۴۶: ۹-۱۰؛ زبور ۱۳۹: ۱۵-۱۶) خُدا کو پورا علم تھا کہ آدم گناہ میں گرے گا۔ اب اگر وہ گناہ میں نہ گرتا تو خُدا کا علم تبدیل پذیر پر ثابت ہوتا۔ یعنی اُس کے علم کے مطابق واقع نہ ہوتا۔ خُدا قدیم سے جانتا تھا کہ آدم پیدا ہوگا۔ میری نافرمانی کریگا اور دُکھ اور موت کی سزا اٹھائے گا۔ چونکہ خُدا کا علم لا تبدیل ہے اس لئے عین اسی طرح تمام واقعات معرضِ ظہور میں آئے نہ کہ اُس کے علمِ قدیم کے خلاف اور ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ خُدا کی علم تو تھا کہ آدم گناہ میں گرے گا لیکن اُس کی مرضی یہ نہ تھی کہ آدم گنہگار ہو جائے۔ علم اور مرضی میں بہت فرق ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کو علم ہے کہ یہ مریض نصف گھنٹے کے بعد مر جائے گا۔ لیکن تو بھی اُس کی مرضی نہیں کہ وہ مر جائے۔ اگر اس پر یہ سوال بڑھایا جائے کہ خُدا کی مرضی کیوں پوری نہ ہوئی؟ تو اس کا جواب ہر ایک کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دُنیا خُدا کی مرضی کو پورا نہیں کر رہی۔ گناہ کا وجود خُدا کی مرضی کی مخالفت کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات انسان کی کامل فعلِ مختاری پر دلالت کرتی ہے۔ مرضی خُدا کی ہے کہ گناہ نہ ہو۔ اور اس الہی مرضی کو پورا کرنا یا نہ کرنا انسانِ فاعلِ مختار کے ہاتھ میں ہے۔ خواہ پورا کرے یا نہ کرے۔ اور اسی تناسب سے سزا و جزا بھی اُس کے لئے موجود ہے۔ اگر خُدا جبری طور پر اپنی مرضی منوائے تو انسان کی فعلِ مختاری کہاں رہے گی؟ اور نیکی و بدی اور جزا و سزا وغیرہ مہمل و بے معنی الفاظ ہونگے اور نیکی و بدی ایسے مفہوم ہوں گے جن کا کوئی مصداق نہ ہو۔ قسری افعال نیک یا بد نہیں ہوا کرتے بلکہ اختیاری افعال نیک یا بد کہلا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کتابت میں نقائس ہیں تو یہ قلم کا قصور نہیں۔ اور خوش خطی میں قلم کی نیکی نہیں۔ کیونکہ قلم فاعلِ مضطر ہے۔ کتابت کی اچھائی یا برائی کا ذمہ دار ہاتھ ہے جو کہ متحرک بالارادہ اور فاعلِ مختار ہے۔ ہم ایک مثال سے واضح کریں گے کہ حضرت ابوالبشر نے اپنی آزاد مرضی و اختیار سے خُدا کے حکم کو ٹھکرا دیا۔ فرض کرو کہ ایک مالک اپنے نوکر کو کچھ دام دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ باغ میں جا کر میرے لئے آم خرید لاؤ۔ اور ساتھ ہی یہ تاکید کرتا ہے کہ اگر تم خرید کر لاؤ گے تو ہم خوش ہوں گے۔ اور اگر چوری کر کے لاؤ گے تو ہم ناراض ہونگے۔ اور تمہیں اپنے گھر سے نکال دیں گے۔ اب حکم اُس کو مل چکا اور وہ خوب جان گیا کہ تعمیل میں میری خیر اور عدول حکمی میں میرا نقصان ہے۔ وہ ایک باغ میں جاتا ہے اور باغبان سے آنکھ بچا کر چوری سے آدم توڑتا اور مالک کے حضور لاتا ہے۔ اب مالک اُس کی بدیانتی کے باعث اگر اُسے اپنے گھر سے نکال دے تو مالک کس صورت قابلِ الزام ہے؟ اور نوکر کس صورت بے قصور ہے؟ اگر اُس کو دام نہ دئے جاتے اور پھر اُس سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ آم لائے تو البتہ مالک کا قصور ہوتا۔ مگر اُس کو آم خریدنے کی قابلیت مالک کی طرف سے دی گئی تھی۔ لیکن وہ اُس قابلیت (دام) کو کام میں نہ لایا۔ اسی طرح خُدا نے آدم میں قابلیت نیکی اور فرمانبرداری کی پیدا کر کے پھر اُس سے حکم کی تعمیل طلب کی۔ لیکن آدم نے اُسی نیک قابلیت کو غلط راہ پر استعمال کر کے خُدا کی مرضی کو ٹھکرا دیا۔ جب حکم مل چکا اور وہ توڑا گیا تو عدل پیدا ہو گیا۔ اور وہی عدل قانونِ نیکن کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ اس واسطے ابوالبشر و ام البشر کو عدل الہی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور گناہ کی سزا دُکھ و موت اُن کے حصے میں آئی۔ اگر حکم نہ دیا گیا ہوتا تو عدول حکمی بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ جہاں شریعت (حکم) نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں (رومیوں ۴: ۱۵) اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو نیکی و پاکیزگی کی قدر قیمت انسان نہ جان سکتا۔ ضد کی حقیقت ضد ہی سے کھلتی ہے۔

اگر اب بھی معتراض کے پاس کوئی اعتراض ہے تو عرض ہے کہ اُس کو دُنیا میں کوئی امر ایسا نہ ملے گا جس پر نکتہ چینی نہ ہو سکے۔ مثلاً اگر کوئی مسیح کے اس قول پر غور کرے کہ "جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔ وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔ تو وہ یہ اعتراض کو سکتا ہے کہ اگر آنکھ کے ذریعے بد نظری کا گناہ صادر ہوتا ہے تو خُدا نے آنکھ کو بنایا ہی کس لئے؟ اور اگر ہاتھ سے تلوار پکڑ کر کسی کا خون کر دیا تو کہہ دیا کہ ہاتھ خُدا نے کیوں بنا دیا جس سے خون ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے یہ سوال ہیں کہ خُدا نے شجر ممنوعہ کو لگایا ہی کیوں۔ یا اگر آدم نے گناہی تھا تو اسے پیدا ہی کیوں کیا؟

اگر ایک مکان کو جلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے ملین یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ اس آتشزدگی کے اسباب و وجوہات کیا ہیں؟ کیوں آگ لگی۔ کس نے لگائی۔ کس غرض سے لگائی۔ کب لگائی۔ کبھی پہلے کیوں نہ لگائی؟ تو کون ہے جو اُن کی نادانی پر نہ ہنسے۔ سب سے پہلے آگ کو بجھانے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ورنہ اسباب و وجوہات کی تلاش کرتے کرتے مکان جل کر خاک ہو جائے گا۔ ہم ناظرین سے گزارش کرتے ہیں کہ ایسے توہمات باطلہ میں پڑ کر حق سے روگردانی نہ کریں۔ اس کا نتیجہ پہلے گمراہی اور پھر ہلاکت ہے۔

## گناہ کیا ہے؟

آدمی کا ضمیر خُداوند کا چراغ ہے۔ جو اُس کے تمام اندرونی حال کو دریافت کرتا ہے (امثال ۲۰ : ۲۷)

ایک تعریف گناہ کی یوں ہو سکتی ہے کہ جو کچھ انسان اپنے ضمیر کی روشنی میں بُرا سمجھا ہے اُس پر عمل کرنا گناہ ہے۔ ضمیر خُدا نے انسان کو ایک عجیب حسِ بخشی ہے جو اُس کو فطرتاً جائز و ناجائز افعال میں امتیاز دکھاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ناجائز افعال کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ پھر بھی بعض کام ایسے ہیں جو بذاتہ بُرے نہیں اور جن کو انسان محض سوسائٹی کے زیر اثر بُرے سمجھنے لگتا ہے اُن پر بھی ضمیر ناجائز ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اکثر اوقات انسان بچپن سے ایک ہی قسم کی سوسائٹی کے زیر اثر تربیت پاتے پاتے ایک ہی قسم کی باتوں کو سنتے سنتے ایک ہی طریق پر چلتے چلتے اور سوسائٹی کے پوشیدہ مگر قوی اثرات کے ماتحت ایک ایسے مصنوعی طریق کا عادی ہو جاتا ہے کہ اُس کو وہ تمام باتیں جو اُس طریق کے برخلاف ہوں گناہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک بُت برست اگر بت پرستی کر ترک کرنا چاہے تو اُس کا ضمیر اُس کے اس خیال کا ناجائز ٹھہراتا ہے۔ ایک سکھ اگر اپنے کیس (بال) کٹوانے کا ارادہ کرے تو اُس کا ضمیر اُس کے اس ارادہ پر ناجائز ہونے کا فتویٰ لگائے گا۔ تاہم درحقیقت یہ دونوں باتیں گناہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہر وہ فعل جس کو ضمیر ناجائز ٹھہراتا ہے گناہ نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ضمیر اپنے فرض منصبی کو درست طریق پر انجام نہیں دیتا؟ وجہ یہ ہے کہ گناہ نے اپنے زبردست عمل تخریبیہ سے جہاں عقل، دل اور دماغ کو بگاڑ دیا ہے۔ وہاں ضمیر پر بھی اثر انداز ہو کر اُس کی مقررہ رفتار میں فرق ڈال دیا ہے۔ عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہیں (طس ۱ : ۱۵) عقل بگڑی ہوئی ہے (۲۔ تمتھیس ۳ : ۸ : ۱۸۔ تمتھیس ۶ : ۵) تو بھی ضمیر کو قطعی معطل اور انکار رفتہ سمجھنا درست نہیں۔ اُس کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پر ہمیشہ نہیں۔ گو ضمیر نقصان سے خالی نہیں تو بھی وہ اپنے فرض منصبی کو بہت حد تک درستی سے انجام دیتا ہے۔ اصل مضمون کو چھوڑ کر ضمیر کی ماہیت پر بحث کرنا اس وقت مناسب نہیں۔ ورنہ ہم اس کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے۔ پھر دوسری تعریف گناہ کی یہ ہے کہ جو کوئی گناہ کرتا ہے وہ شرع کی مخالفت کرتا ہے۔ اور گناہ شرع کی مخالفت ہی ہے (۱۔ یوحنا ۳ : ۴) جس طرح گناہ حضرت ابوالبشر سے وراثتاً تمام نسل انسانی میں چلا آیا (رومیوں ۵ : ۱۲) اسی طرح وہ اخلاقی شرع جو خُدا نے اُس کی پیدائش کے وقت بخشی تھی کسی نہ کسی صورت میں وراثتاً تمام بنی نوع انسان میں منتقل ہوتی آئی ہے۔ اور وہ شریعت کسی تحریری صورت میں نہ تھی بلکہ آدم کے دل پر مرسم کی گئی تھی۔ چنانچہ اُس کا کچھ نہ کچھ بقیہ تمام اقوام عالم کے دل میں فطرتی طور پر موجود ہے۔ اور اس ابتدائی باطنی شریعت کا بیان کلامِ مقدس میں یوں ہے۔ اس لئے کہ جب وہ قومیں جو شریعت (ظاہری الہامی شریعت) نہ رکھنے کے وہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وہ شریعت (باطنی شریعت) کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں (رومیوں ۲ : ۱۴ - ۱۵) الہامی شریعت اُس ابتدائی باطنی شریعت کا اعادہ ہے۔ پس شرع خواہ باطنی ہو یا ظاہری اُس کا ہر تجاویز گناہ ہے۔ اور گناہ کے چار اقسام ہیں۔

✚ سیاسی گناہ یعنی جو حکومت وقت کے خلاف عمل میں آئے۔ جیسے کوئی شخص جعلی سکے بنائے۔ اشیائے ممنوعہ کی چھپ کر تجارت کرے۔ ان صورتوں میں وہ حکومت کا مجرم ہے۔ اور سیاسی مکزم کا جب تک سراغ نہ ملے وہ سزا سے بچا رہتا ہے۔ مجرم ثابت ہونے پر اُس کو سزا دی جاتی ہے۔

✚ سوسائٹی کا گناہ یعنی جو کسی سوسائٹی کے مقررہ قوانین و ضوابط کے خلاف کیا جائے۔ جیسے کیس (لبے بال) رکھنا سکھ سوسائٹی کا قانون ہے اگر کوئی سکھ ہوتے ہوئے بال کٹوادے تو وہ سوسائٹی کا مجرم ہوگا۔ اور سوسائٹی سے خارج کیا جائے گا۔ مگر توبہ کر کے بحال ہو سکتا ہے۔

✚ فطرۃ کا گناہ یعنی قوانین طبعیہ کی خلاف ورزی۔ جیسے کوئی شخص قانون کشش زمین کے خلاف عمل کرنے سے بلندی سے گر کر مر جائے۔ یا آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جل جائے۔ یہ قوانین اپنے تجاوز کے ساتھ ہی سزا دیتے ہیں۔ توبہ کرنے یا معافی مانگنے کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔

✚ خُدا کا گناہ یعنی خُدا کی طبیعت کے خلاف عمل کرنا۔ جیسے اُس کی ہستی سے منکر ہونا۔ بُت پرستی۔ کفر و الحاد کا ارتکاب۔ الٰہی گناہ باقی سب گناہوں پر حاوی ہے۔ اور اُس کی سزا سب سے زیادہ ہولناک ہے۔ لیکن شرع الٰہی کے تجاوز کے نتائج نے الفور ظہور میں نہیں آتے۔ کیونکہ خُدا رحیم و مہربان ہے۔ اور ہر گنہگار کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی بد کرداری سے تائب ہو۔ اس لئے واعظ کہتا ہے کہ "چونکہ برے کام پر سزا کا حکم فوراً نہیں دیا جاتا۔ اس لئے بنی آدم کا دل اُن میں بدی پر بہ شدت مائل ہے۔ (واعظ ۸: ۱۱) لیکن انسان اپنی کوتاہ اندیشی سے خُدا کے صبر و تحمل سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موردِ عتابِ الٰہی ٹھہرتا ہے۔ مندرجہ بالا تین قسم کے گناہوں کی سزائیں جسمانی اور ایس جہانی ہوتی ہیں۔ مگر خُدا کے خلاف گناہ کرنے کی سزا ایک تو جسمانی و روحانی دونوں طرح کی ہوگی دوسرے اُس نے عدالت کا ایک خاص دن ٹھہرایا ہے اگرچہ وہ جسمانی طور پر بدکاروں کو اس جہان میں بھی عارضی سزائیں دیتا ہے۔

مسیحیت محض عدم نیکی و عدم پاکیزگی کو گناہ نہیں کہتی۔ جیسا کہ غیر اقوام سمجھتی ہیں۔ بلکہ از روئے انجیل گناہ ایک امر و وجودی اور نفس الامری حقیقت ہے۔ نہ کہ اعتباری محض و عدمی شے۔ محض نیکی کی نفی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ نیکی کی نفی اور گناہ کا اثبات دونوں باتیں مل کر گناہ ہیں۔ گناہ منفی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اثباتی غیر مسیحی لوگ بھاری غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ محض عدم نیکی کو گناہ سمجھتے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ چند ظاہری نیکیاں کر کے سمجھتے ہیں کہ اب ہم نیک ہیں۔ لیکن مسیحیت کا خیال یہ ہے کہ ممکن کہ ایک آدمی نیکی کرے مگر خود نیک نہ ہو۔ نیکی کا فقدان گناہ کے وجود کی دلیل نہیں۔ بلکہ گناہ کا وجود سبب اور عدم نیکی اُس کا نتیجہ ہے۔ گناہ نے انسان کی فطرت پر قبضہ جما کر نیکی کو اُس سے خارج کر دیا ہے۔ اب نیکی و پاکیزگی کا تسلط اس صورت میں ممکن ہے کہ پہلے گناہ فطرت انسانی سے قطعاً خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک ایک بھرے ہوئے برتن میں سے پہلی چیز نکال نہ دی جائے تب تک دوسری اُس میں سما نہیں سکتی۔

انسان کی اصل فطرت کے بگڑ جانے کا نام گناہ ہے۔ خُدا نے انسان کو اس لئے پیدا نہ کیا تھا کہ وہ اُس سے برگشتہ ہو کر اُس کی مرضی کے خلاف کام کیا کرے بلکہ اس لئے کہ وہ خُدا کے ساتھ پوری مطابقت و یگانگت رکھے اور اُس کی مرضی کے مطابق چلے۔ چونکہ اس وقت انسان سر اسر خُدا کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔ لہذا وہ اپنی اصلی فطرت پر قائم نہیں ہے بس یہی گناہ ہے گناہ وہ ہے جو انسان کے تمام افعال و اقوال کو مٹوٹ کر دینا ہے۔ اور بد افعال کا صدور ارتکاب انسان کے اعماقِ طبع میں ایک ایسے مکروہ چشمے کا آئینہ دار ہے جس میں ڈوب ڈوب کر وہ افعال صادر ہوتے ہیں۔ وہ افعال اگر ظاہر نہ بھی ہوں تو بھی اُس گندے چشمے کے وجود کا انکار محال ہے۔ صرف ظاہری افعال جیسے خون کرنا چوری کرنا اور گالی بکنا وغیرہ ہی گناہ نہیں ہیں بلکہ یہ تو گناہ کا عملی ظہور میں نہ بھی آئیں (گو محال) تو بھی ہم کسی انسان کو پاک مطلق نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر سانپ کسی کوندے سے تو بھی اُس کے زہریلا ہونے سے انکار نہیں

کیا جاسکتا۔ خواہ ڈسے خواہ نہ ڈسے بہر حال زہر اُس کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح انسان سے خواہ کسی فعل بد کا ارتکاب نہ بھی ہو تو بھی گناہ اُس کی طبیعت میں موجود ہوتا ہے۔ پس شرع الہی کا ہر چھوٹے سے چھوٹا تجاوز گناہ ہے۔ اور شریعت انسان کو گناہ سے آزاد نہیں کر سکتی۔ بلکہ وہ تو صرف گناہ کی پہچان ہی بخشتی ہے۔ شریعت کے وسیلے تو گناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے (رومیوں ۳: ۳۰) جس طرح تھرما میٹر صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ بخار کتنے درجے کا ہے اور اُس بخار کو دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شریعت گناہ کے وجود کا علم بخشتی ہے۔ اُس سے آزاد نہیں کر سکتی۔

بہت سے لوگ جن کی فطرت بالکل مسخ اور ضمیر مردہ ہو چکا ہے گناہ کے وجود کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ گناہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو کہ لوگ مکانوں اور صندوقوں کو قفل کیوں لگاتے ہیں؟ سرکاری خزانے پر دن رات پہرے کیوں لگے رہتے ہیں؟ روپیہ بنکوں میں کس لئے جمع کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ دنیا میں چور موجود ہیں۔ کیا چوری کرنا نیکی ہے؟ کیا پولیس کا انتظام۔ عدالتیں، ہتھکڑیاں، جیلیں، پھانسیاں اور شکنجے راست بازوں کو سزائیں دینے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ بلکہ صرف مجرموں کے لئے تمام ممالک و اقوام عالم میں حکومتوں اور تعزیری قوانین کا وجود زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ گناہ دنیا میں ہمہ گیر طور پر موجود ہے۔ اور حکومت اُس کی روک تھام کا ایک جبری و ظاہری انتظام ہے۔ تاکہ دنیا میں اندھیرنہ مچ جائے اور دنیا میں کوئی زبان کتاب اور کوئی لغت ایسی نہ ملے گی کہ جس میں گناہ کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ پس گناہ ضمیر کی مخالفت ہے۔ شرع الہی کی مخالفت ہے۔ انسان کی خودی براظہور ہے۔ ایک نفس الامری حقیقت ہے۔ انسان کی اصلی فطرت کے بگاڑ کا نام ہے۔ انسان کی طبیعت کو عارض ہے۔ اور ایک روحانی مرض ہے۔ پس اب اگر ہم کہیں کہ ہم بیگناہ ہیں واپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ اور ہم میں سچائی نہیں (یوحنا: ۸)۔

## گناہ کی علت

جیسے پیشتر اس کے پانی بیا جائے پیاس ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ مٹھائی کھائی جائے کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح پیشتر اس کے کہ خون کیا جائے قتل کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ چوری کی جائے چوری کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ زنا کیا جائے زنا کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ ہر فعل کے ارتکاب سے پیشتر ہی اُس فعل کی خواہش انسان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ اور خواہش ہر فعل پر مقدم ٹھہرتی ہے۔ لہذا خواہش علت اور فعل یعنی خواہش کا عملی ظہور معلول ہے۔ پس گناہ کی علت بری خواہش ہے۔ تاکہ اُن کے وسیلے سے تم اُس خرابی سے چھوٹ کر جو دنیا میں بُری خواہش کے سبب سے ہے۔۔۔ وغیرہ۔ (۲- پطرس ۱: ۴) ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھینچ کر اور پھنس کر آزما جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جتنی ہے۔ (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵) اور یہی بُری خواہش ہے جو حضرت ابوالبشر سے وراثتاً اُس کی تمام نسل کو ملی ہے۔ اسی واسطے خداوند مسیح نے گناہ کی علت (بُری خواہش) کو روکنے پر زور دیا اور صرف نیت کی بُرائی کو ہی گناہ ٹھہرایا۔ آپ نے فرمایا۔ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا (متی ۵: ۲۷) اور یہ بُری خواہش انسان کی فطرۃ اولہ نہیں بلکہ فطرۃ ثانیہ ہے۔ اور اس کے اعماقِ قلب میں ایک گناہ کا منبع ہے جس میں سے افعال بد پھوٹ پھوٹ کر صادر ہوتے اور فضائے عالم کو متعفن کرتے ہیں۔ بد افعال کا ظہور گویا اعماقِ قلب کا اعلان ہے۔ اور خواہش بد کوئی اکتسابی شے نہیں بلکہ موروثی ہے۔ اسی واسطے انسانی تدابیر سے اس کا ازالہ محال ہے۔ مذہبی تعلیم۔ وعظ و نصیحت اور حکومت کی تعزیری تجاویز و عوامل صرف بری خواہش کے معلولات (بد افعال) یعنی چوری، زنا، حق تلفی، ظلم، لڑائی فساد اور خون ریزی وغیرہ کو عارضی طور پر روک سکتے ہیں، لیکن ان کی علت (بری خواہش) اندفاع و ازلہ میں قطعی قاصر ہیں۔ جب تک انسان کی نیت بدنہ تب تک ارادہ بُرا نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک ارادہ بُرا نہ ہو فعل بد کا صدور محال ہے۔ اگر بدرون ارادہ بد کے افعال بد کا صدور ممکن مانا جائے تو وہ افعال اضطراری ٹھہریں

گے نہ کہ اختیاری اور یہ باطل ہے۔ پس فعل بد کے صدور کی علت بُرا ارادہ اور برے اردے کی علت بُری خواہش ہے۔ انسان کی خواہش و ارادہ گناہ سے اس قدر مانوس ہو چکے اور طبیعت گناہ کی طرف اس درجہ مائل ہو چکی ہے کہ جب تک اُس کی خواہش، میلان طبع اور ارادہ کو کسی فوق العادت طریق سے تبدیل نہ کر دیا جائے حقیقی نیکی اُس سے صادر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی نیکی صادر بھی ہوگی تو وہ گندی دھجی کی مانند ہوگی (یسعیاہ ۶۴: ۶) گناہ انسان کی فطرت میں اس قدر رچ گیا ہے کہ یرمیاہ نبی اُسے انسان کی ایک فطرتی ناقابلیت سے تشبیہ دیتا ہے (یرمیاہ ۱۳: ۲۳) فخر بانہ میلانات و مذموم رجحانات گناہ آلودہ طبیعت کے لازمی نتائج ہیں۔ اکثر لوگ گناہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ گناہ صرف اُس کو سمجھتے ہیں جو ظہور میں آئے میں آئے لیکن نیت کی سفلیت کو گناہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ نیت و خواہش کی بدی تمام جرائم و ذمائم کو مرکزہ۔ ذرا سوچئے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی کی نیت کی بُرائی سے کسی صورت آگاہ ہو جاتا ہے۔ تو باوجود اُس سے کوئی فعل بد سرزد ہونے کے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نیت کی بُرائی واقعی نفرت کا موجب ہے۔ اور اگر انسان ایک دوسرے کے باطنی خیالات کے جان لینے پر قادر ہوتا تو ضرور ایک دوسرے سے نفرت کرتا۔ اب دیکھئے کہ خدا ہمارے باطن سے اس قدر آگاہ ہے جس قدر ہمارے ظاہر سے۔ میں تمہارے دل کے خیالات کو جانتا ہوں (حزقی ایل ۱۱: ۵: ۱۔ کرنتھیوں ۴: ۵) تو بتائے کہ ہماری بُری نیت اور بُری خواہش سے وہ کیوں نفرت نہ کرے گا؟ اور بُری خواہش (علت گناہ) کا مرکز دل ہے۔ اس لئے کلام میں آیا ہے کہ دل بھی شرارت سے بھرا ہے (واعظ ۹: ۳: ۸: ۱۱) اور خداوند مسیح نے فرمایا۔ جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ وہ دل سے نکلتی ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے خیال، خون ریزیاں، زنا کاریاں، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ (متی ۱۵: ۱۸ - ۲۰) انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے (پیدائش ۸: ۲۱) اس لئے انسان کے لئے ہدایت الہی یہ ہے کہ اپنے دل کی خوب حفاظت کر۔ کیونکہ زندگی کا سرچشمہ وہی ہے (امثال ۴: ۲۳) اور داؤد نبی اس گناہ آلود دل کی تبدیلی کے لئے خدا سے یوں التجا کرتا ہے۔ اے خدا میرے اندر پاک دل پیدا کر۔ اور میرے باطن میں از سر نو مستقیم رُوح ڈال (زبور ۵۱: ۱۰) دیگر مزاہب صرف عملی گناہ پر زور دیتے اور بد خیالی و بد اندیشی کو گناہ نہیں سمجھتے۔ لیکن مسیحیت کی فضیلت و امتیاز اسی سے ظاہر ہے کہ وہ انسان کی نیت کی بُرائی اور خواہش و ارادہ کی نجاست و خباثت پر گناہ ہونے کا فتویٰ دیتی اور بد خیالی و بد اندیشی کو شرع الہی کا عدول ٹھہرا کر فعل سے زیادہ ارادہ فعل کو معیوب ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ خدا باطن کی صفائی پسند کرتا ہے نہ کہ ظاہری کی۔ نادان لوگ عملی گناہوں کے محض دوسروں کی نظر سے بچکر پوشیدہ طور پر مرتکب ہوتے اور چند ظاہری داری کی نیکیاں کر کے خود کو پاک و نیک سمجھنے لگتے ہیں اور دل کو یونہی تسلی دے لیتے ہیں کہ ہم گنہگار نہیں ہیں۔ کلام مقدس ایسوں کے متعلق یوں فرماتا ہے۔ ایک پشت ایسی ہے جو اپنی نگاہ میں پاک ہے۔ لیکن اُس کی گندگی اُس سے دھوئی نہیں گئی (امثال ۳۰: ۱۲) انسان کی ہر ایک روش اُس کی نظر میں راست ہے۔ پر خداوند دلوں کو جانچتا ہے (امثال ۲۱: ۲: ۲۰: ۹: ۷: ۲۰) جب مصدر ہی ناپاک ہو تو اُس سے نیکی و پاکی کا صدور کیسے ممکن ہے؟ (یعقوب ۳: ۱۲) پس گناہ کی علت بُری خواہش ہے اور بغیر علت کی تبدیلی کے معلول کی تبدیلی محال ہے۔ جب تک انسان کی بُری خواہش و بری طبیعت نئے سرے سے نیک اور پاک نہ ہو جائے تب تک حقیقی نیکی اُس سے صادر ہی نہیں ہو سکتی (متی ۷: ۱۸)۔

# گناہ ہمہ گیر ہے

گناہ کی ہمہ گیر کے متعلق عقلی دلائل:-

۱۔ دُنیا میں کوئی ایسی کتاب، لغت یا زبان نہیں ہے۔ جس میں گناہ کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ ہم اس مضمون کے آغاز ہی میں اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ بکثرت موجود ہیں جن سے گناہ کا ہمہ گیر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی لفظ تب تک ایجاد نہیں ہوتا جب تک خارج میں اُس کا کوئی مدلل نہ پایا جائے۔ واقعات پیش آمدہ کے مطابق اُن کے اظہار کے لئے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ عداوت کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر دُنیا میں عداوت و دشمنی نہ ہوتی۔ لفظ غم کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر غم کوئی شے یا کیفیت نہ ہوتی۔ اگر دُنیا میں کبھی کوئی بیماری ہی نہ ہوتی تو الفاظ ہماری۔ مرض، علالت اور حکیم و طبیب اور نسخہ و دوا وغیرہ ہرگز ایجاد نہ ہوتے۔ اور سرسام، بُرص، طاعون، ہیضہ۔ تمونہ اور بخار وغیرہ الفاظ کا وجود نا بود ہوتا۔ اسی طرح گناہ کے مترادف یا اُس کی مختلف فروعات کے اظہار کے لئے دُنیا کی ہر زبان میں بکثرت الفاظ موجود ہیں۔ اگر گناہ کوئی ہمہ گیر شے نہ ہوتا تو اُس کے مفہوم کے اظہار کے لئے ہر ملک کی زبان میں کثیر التعداد الفاظ ہرگز نہ ہوتے۔ لہذا گناہ ایک نفس الامری حقیقت ہے اور ہمہ گیر ہے۔

۲۔ ہر ملک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی صورت میں حکومت اور تعزیری انتظام کا وجود گناہ کی ہمہ گیری کا زبردست ثبوت ہے۔ عدالتیں۔ حکومتیں اور تعزیرات گناہ کو قوت بازو سے روکنے کے لئے معرض وجود میں آئیں۔ چونکہ یہ انتظام ہمہ گیر ہے لہذا گناہ بھی ہمہ گیر ہے۔

۳۔ گناہ ایک متوارث شے ہے۔ یعنی جس طرح صحت و سقم، ضعف و قوت، شکل و شباہت اور عادات و خصائل اور مزاج و طبائع قانون ارثی کے مطابق والدین سے بچوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ اسی طرح گناہ کی علت (بری خواہش) بھی ارثی طور پر اولاد میں منتقل ہوتی ہے۔ اور طبیعتِ موروثی کا ہمہ گیری ہونا مسلم ہے۔ لہذا گناہ ہمہ گیر ہے۔

۴۔ تجربہ نوعی نے گناہ کی ہمہ گیری کو خوب ثابت کر دیا ہے۔ گناہ کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اور کوئی ملک کوئی شے کوئی قوم۔ کوئی جماعت۔ کوئی خاندان اور کوئی فرد واحد بھی اس سے ثابت ہے۔ ہندو مذہب میں عقیدہ تناخ مسلم ہے اور از روئے تناخ تمام جیو بندہ میں آتے ہیں۔ اور اُن کا بندہ میں آنا کسی گذشتہ جرم کے بغیر ممکن نہیں۔ لہذا اُن کے مسلمات کی رو سے تمام جیو گنہگار ہیں۔ پھر اسلامی مسلمات کی رو سے بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلم الثبوت ہے۔ قرآن کی سورہ نحل میں مرقوم ہے۔ کہ اگر اللہ انسانوں سے اُن ظلم کی باز پرس کرے تو زمین پر ایک متحرک کو بھی نہ چھوڑے۔ پھر حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بھی اسی مطلب کا مضمون ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم میں سے کسی کا عمل اُس کو ہرگز جنت میں داخل نہ کرے گا۔ تو آپ کے ساتھیوں نے پوچھا کہ اے رسول اللہ کیا آپ کو بھی آپ کو عمل جنت میں داخل نہ کرے گا؟ حضرت نے فرمایا۔ کہ مجھ کو بھی میرا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا۔ خدا کی رحمت و فضل کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پس اسلامی متعقدات سے بھی گناہ کی ہمہ گیری ثابت ہے۔

گناہ کی ہمہ گیری کے متعلق بائبل مقدس کی منقولی دلائل۔

۶۔ بائبل سے گناہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ کلام میں آیا ہے کہ گناہ کی مزدوری موت ہے (رومیوں ۶: ۲۳) چونکہ تمام انسان مرتے ہیں۔ لہذا سب گنہگار ہیں گناہ سبب ہے اور موت اُس کا نتیجہ ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو موت بھی نہ ہوتی۔ جبکہ گناہ کا نتیجہ (موت) ہمہ گیری ہے۔ تو خود سب گناہ کیوں ہمہ گیری نہ ہو گا؟ اور کوئی نتیجہ بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔ گناہ کی ہمہ گیری کے ثبوت میں چند مقامات بائبل مقدس سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جس طرح پانی میں چہرہ چہرے سے مشابہ ہے۔ اسی طرح آدمی کا دل آدمی سے (امثال ۲۷: ۱۹)۔

- ۲- انسان ہے کیا کہ وہ پاک ہو؟ اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے کہ صادق ہو۔ (ایوب ۱۵: ۱۴)۔
- ۳- خُداوند نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی تاکہ دیکھے کہ کوئی دانشمند کوئی خُدا کا طالب ہے یا نہیں۔ وہ سب کے سب گمراہ ہوئے وہ باہم نخس ہو گئے۔ کوئی نیکو کار نہیں۔ ایک بھی نہیں (زبور ۱۵: ۲-۳ : ۵۳: ۳-۲)۔
- ۴- اور اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا۔ کیونکہ تیری نظر میں کوئی آدمی راستباز نہیں ٹھہر سکتا (زبور ۱۴۳: ۲)۔
- ۵- کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنے دل کو صاف کر لیا ہے۔ اور میں اپنے گناہ سے پاک ہو گیا ہوں (امثال ۲۰: ۹)۔
- ۶- کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز انسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطانہ کرے (واعظ ۷: ۲۰)
- ۷- قول المسیح۔ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا (لوقا ۱۸: ۱۹)
- ۸- اس لئے کہ سب نے گناہ کی اور خُدا کے جلال سے محروم ہیں۔ (رومیوں ۳: ۲۳: ۵: ۱۲)
- ۹- اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو قریب دیتے ہیں۔ اور ہم میں سچائی نہیں (۱- یوحنا: ۸)
- ہم نے گناہ کی ہمہ گیری کو معقولات و منقولات سے پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی باطنی حالت کا امتحان کرے۔ اور اپنے آپ کو خوب جانچ لے کہ واقعی و گنہگار ہے یا نہیں۔ اگر کوئی اب بھی اپنے آپ کو بکلی پاک و راستباز سمجھے تو وہ جان لے کہ گناہ کی شدید تیرگی نے اُس کے ضمیر کو جو اُس کے باطن کے لئے بمنزلہ ایک چراغ کے ہے (امثال ۲۰: ۲۷) یہاں تک مدہم کر دیا ہے کہ وہ اپنے باطن کی گناہ آلودہ تاریک حالت کو جان نہیں سکتا۔ اور ایسا شخص قابلِ رحم ہے۔

## کیا گناہ انسان کی اصلی فطرت ہے؟

اگرچہ پیچھے کئی جگہ ثابت کر آئے کہ گناہ انسان کی نیچر کا خاصہ ذاتی نہیں ہے۔ پر شاید کوئی اور زیادہ وضاحت سے اس امر کا ثبوت چاہئے۔ لہذا ہم چند دلائل سے اس خیال کی کہ گناہ جزو انسانیت ہے تردید کریں گے۔

۱- جو بات کسی ذی حیات جنس کی ذات کا خاصہ نہیں وہ اُس کے لئے نقصان دہ اور مضرت رسا ثابت ہوگی۔ اب دیکھئے کہ صحبت جسمانی انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس سے اُس کا کوئی تکلیف یا نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن مرض جزو انسانیت نہیں بلکہ ایک ہے۔ اس لئے اُس سے سے دُکھ اور نقصان ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر سانپ کے لئے مضرت رسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اُس کے خاصہ ذاتی ہے۔ سانپ کسی کو ڈس کر خوش ہوتا ہے ہم کانوں سے کچھ سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بہرہ ہو جائے تو وہ بہت ناخوش اور رنجیدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بہرہ بن فطری خاصہ نہیں ہے۔ اسی طرح گناہ سے انسان کو دُکھ اور رنج محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فطرت انسانی کا خاصہ ذاتی نہیں ہے۔

۲- چونکہ گناہ کرنے کے بعد انسان کو ایک تورنج ہوتا ہے۔ اور دوسرے اُس فعل ناکردنی پر پچھتا پڑتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ انسانی فطرت کا خاصہ نہیں ہے۔ پطرس نے مسیح کا انکار کیا اور پچھتا کر زاری زار رویا۔ یہوداہ اسکر یولی نے مسیح کے ساتھ غداری کی اور اُس کا غم اور پچھتاوا خود کشی پر منتج ہوا۔ پس اگر گناہ ذاتی خاصہ ہوتا تو اُس سے خوشی ہی حاصل ہوتی نہ کہ رنج اور پچھتاوا۔ اگر کوئی خوشی ہوتی بھی ہے تو بہت تھوڑے عرصہ کی جیسے شراب پینے سے ایک آدھ گھنٹے کے لئے سُور ہوتا ہے۔ لیکن بڑے سے بڑا گنہگار بھی کسی نہ کسی وقت اپنے گناہ پر ضرور نادم ہوتا اور پچھتاوا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ چور کو چوری کرنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے اور پچھتاوا کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوری سے جو مال و دولت ہاتھ آتا ہے وہ اُس کی طبیعت پر رنج و پچھتاوا لے کر غالب

آنے نہیں دیتا تو اس کے جواب میں اس قدر عرض ہے کہ اگر خود چور کے گھر میں چوری ہو جائے تو کیا پھر بھی اُسے خوشی حاصل ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ اُس کو ضرور رنج اور افسوس ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ اور گناہ فطرتِ انسانی کا خاصہ نہیں بلکہ غیر شے ہے۔ لہذا اس سے آزاد ہونا اصلی فطرت کا تقاضا ہے۔

۳۔ گناہ تمام افرادِ عالم میں یکساں نہیں ہے۔ اس لئے طبیعتِ اولہ نہیں بلکہ ثانیہ ہے۔ کسی میں ایک گناہ ہے اور دوسرے میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ ایک شخصِ خوبی تو ہے مگر غرباء کے ساتھ بہت ہمدردی کرتا ہے۔ ایک آدمی زانی تو ہے مگر خوبی نہیں ہے۔ ایک آدمی لالچی تو ہے مگر سچ بولنے میں مشہور ہے۔ ایک آدمی بُت پرست تو ہے مگر جھوٹ۔ فریب۔ خون ریزی اور ظلم وغیرہ سے نفرت کرتا ہے۔ جس طرح سانس لینا، سنا، سو گھننا، سونا، جاگنا اور کھانا پینا وغیرہ ذاتی خصائص تمام افرادِ عالم میں یکساں ہیں اسی طرح اگر گناہ انسان کی ذاتیات کا جز ہوتا تو تمام نوعِ انسانی میں یکساں ہوتا۔ یعنی اگر ایک شخص چوری کرنا تو تمام دنیا چوری کرتی۔ اگر ایک شخص جھوٹ بولتا تو ضرور تھا کہ دنیا کے تمام لوگ جھوٹ بولا کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہذا گناہ جزو انسانیت نہیں ہے۔

۴۔ خدائے قدوس سے ناپاک طبیعت کے معلول کا صادر ہونا قطعی ممنوع و محال ہے۔ کیونکہ قدوسیت اور ناپاکی باہد گر نقیضین ہیں۔ اور ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا۔ جیسے آفتاب میں سے تاریکی کبھی صادر نہیں ہو سکتی۔ لہذا گناہ انسان کی فطرتِ اولہ نہیں۔

۵۔ گناہ کو جزو فطرتِ انسانی ماننے سے احکام و شرائع اور اوامر و نواہی الہیہ کا بطلان لازم آئے گا۔ خد خود گناہ کو انسان کی طبیعت میں پیدا کر کے اُس کے خلاف احکام صادر نہیں کر سکتا۔

۶۔ اگر گناہ عرضِ ذاتی ہے تو خد تعالیٰ کسی کو سزا و جزا نہیں دے سکتا۔ اور عدالت وابدی زندگی سے انکار لازم آئے گا۔

۷۔ خد کے تمام انتظامات دربارہ ازالہ گناہ اور نجاتِ بنی نوعِ انسان باطل ٹھہریں گے۔ کیونکہ خاصہ ذاتی کا انفکاک اپنی ذات سے محال ہے۔

۸۔ گناہ بدی کے حامل ہونا خد کی عین فرماں برداری ہوگی۔ اور نیکی کے حامل ہونا خد سے سرکشی و مخالفت کرنا ہوگا۔

جبکہ گناہ کو انسان کی اصلی فطرت ماننے سے مندرجہ بالا قباحتیں لازم آتی ہیں۔ تو یہ خیال کو خود باطل ہو کر محال ٹھہرا۔ اور ثابت ہوا کہ گناہ انسان کی طبیعت کا خاصہ ذاتی نہیں۔ طبیعتِ اولہ نہیں بلکہ طبیعتِ ثانیہ یا عرضِ انضمام ہے۔ یعنی خد نے تو ابوالبشر کو پاک و راست پیدا کیا تھا۔ لیکن وہ خود الہی نافرمانی کر کے گنہگار ہو گیا۔ تو میں نے صرف اتنا پایا کہ خد نے انسان کو راست بنایا۔ پر انہوں نے بہت سی بندشیں تجویز کیں۔ (واعظ ۷: ۲۹) اور اُس گناہ سے انسان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اور وہ طبعی بگاڑ وراثتاً آدم سے تمام نسلِ انسانی میں منتقل ہو گیا (رومیوں ۵: ۱۲)۔

اس دنیا میں بے شمار جسمانی امراض پائے جاتے ہیں۔ اور وہ امراض یا تو موروثی ہوتے ہیں۔ یعنی آبا و اجداد سے اولاد کو وراثتاً ملتے ہیں۔ جیسے تب دق کے مریض والدین کے بچے بھی تب دق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یا متعدی ہوتے ہیں۔ یعنی مریضوں کی صحبت و سنگت سے لاحق ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی تندرست آدمی کسی کوڑھی یا تپ دق کے مریض کی صحبت میں رہنے سے خود بھی اس مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یا کسی ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی غفلت و نادانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی گرم گرم چاہے پی کر اوپر سے فوراً برف کا ٹھنڈا پانی پی لے اور گرم سرد ہو کر بیمار ہو جائے۔ جس طرح یہ جسمانی بیماریاں جسم کے لئے مضرت رساں ہیں نہ اسی طرح گناہ ایک روحانی مرض ہے اور روح کی تخریب و تنزل کا موجب ہے۔ اور یہ روحانی مرض (گناہ) بھی تین ہی طرح پر ہے۔

## طبعی موروثی گناہ

آدم اور حوا کے گناہ میں گرنے سے اُن کی طبیعت ناپاک اور گناہ آلود ہو گئی۔ اور اُس بُری طبیعت کا اثر وراثتاً اُن کی نسل میں منتقل ہوتا آیا۔ دیکھ میں نے بدی میں صورت پکڑی۔ اور میں گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا (زبور ۵۱: ۵) شریر پیدا نش ہی سے کجروی اختیار کرتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی جھوٹ بول کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ (زبور ۵۸: ۳) میں جانتا تھا کہ تو بالکل بے وفا ہے۔ اور رحم ہی سے خطا کار کہلاتا ہے (یسعیاہ ۸: ۸) انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے (پیدائش ۸: ۲۱) پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا۔ اور گناہ کے سبب موت آئی۔ اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا (رومیوں ۵: ۱۲) گناہ کو موروثی کہنے سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ اولاد اپنے والدین کے گناہوں کی سزا میں بھی مبتلا ہوتی ہے۔ ہر گز نہیں بلکہ بدی کا میلان وراثتاً والدین سے اولاد میں منتقل ہوتا ہے نہ کہ سزا بھی۔ گناہ تو کردی و بدت بہ قتل گاہ رسید والا معاملہ نہیں۔ اس کے متعلق کلام الہی کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔ اُن ایام میں پھر یوں نہ کہیں گے کہ باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت کھٹے ہو گئے۔ کیونکہ ہر ایک اپنی ہی بد کرداری کے سبب سے مرے گا۔ ہر ایک جو کچے انگور کھاتا ہے۔ اُسی کے دانت کھٹے ہوں گے (یرمیاہ ۳۱: ۲۹-۳۰) گلیتوں ۶: ۵) اگر کوئی ہمارے اس دعویٰ کی تردید میں خروج ۲۰: ۵ کو پیش کرے کہ یہ ثابت کرنا چاہے کہ اولاد اپنے آباؤ اجداد کی سزا میں مبتلا ہوتی ہے تو اُس کے متعلق عرض ہے۔ کہ سزائے قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی سزائے نظامت اور سزائے عدالت۔ خُدا اس دنیا میں کبھی کسی کو عدالتی سزا نہیں دیتا۔ بلکہ اُس کے لئے ایک خاص دن مقرر ہے۔ لیکن سزائے نظامت جسمانی اور اس جہانی ہوتی ہے۔ اُس میں بے شک بچے بھی والدین کے ساتھ سزا پاتے ہیں۔ جیسے طوفان نوح میں بد کرداروں کے ساتھ اُن کی اولاد بھی ہلاک ہوئی۔ لیکن اس سے اُن کا کوئی روحانی نقصان نہیں ہوا۔ وہ سزائے عدالت کے لئے باقی رکھے گئے ہیں۔ جب بدی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو خُدا بدکاروں کو اُن کی نسل سمیت مٹا دیتا ہے۔ جیسے ایک مصور اپنی تصویر کو جس میں نقص پیدا ہو جائیں رُبڑ سے مٹا دیتا ہے۔ جو سزائیں حاکموں کی طرف سے بدکاروں کی اصلاح کے لئے دی جاتی ہیں وہ بھی خُدا کی انتظامی سزا میں شامل ہیں۔ سزائے نظامت تو بہ کرنے سے ٹل بھی جاتی ہے۔ جیسے نینو کے لوگوں نے جب اپنی بد کرداری سے توبہ کی اور خُدا کی کے حضور خاکساری اختیار کی تو اُن کی سزا ٹل گئی (یوناہ ۳: ۵-۱۰) لیکن سزائے عدالت روحانی سزا ہے اور اٹل ہے۔ اُس سے کوئی بدکار بچ نہیں سکتا۔

## متعدی گناہ

یعنی بد کرداری کی قرابت و صحبت سے بھی انسان کی طبیعت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے کلام میں آیا ہے کہ "فریب نہ کھاو بُری صحبتیں اچھی عادتوں کو بگاڑ دیتی ہیں (۱- کرنتھیوں ۵: ۳۳) اور زبور ۱: ۱ میں اُس آدمی کو مبارک کہا گیا ہے جو شریروں کو صحبت سے پرہیز کرتا ہے (امثال ۱۳: ۲۰: ۲۲: ۱)۔"

## کسی گناہ

ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزما یا جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵: ۲- پطرس ۱: ۴) گناہ نے فطرتِ انسانی پر اثر انداز ہو کر زندگی کے شیریں چشمہ کو زہر یلا بنا دیا ہے۔ کے سبب اس دُنیا میں انسان ہر قسم کے مصائب جسمانی و آلام روحانی

میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اور زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہوتی ہے۔ ریاضتِ بدنی اور تزکیہ نفس وغیرہ کے ہمہ گیر خیالات گناہ کے وجود اور اس کے باعث انسان کی روحانی بے چینی اور قلبی اضطراب کے مظہر ہیں۔ بلکہ ان جسمانی و روحانی آلام و مصائب سے تنگ آکر انسان نے خودکشی کو ذریعہ نجات سمجھا۔ یونانی حکماء کا یہ خیال ہے کہ طبعی موت خودکشی کو ذریعہ نجات سمجھا۔ یونانی حکماء کا یہ خیال ہے کہ طبعی موت خود انسان کے پاس آتی ہے۔ اور خودکشی انسان کو موت کے پاس لے جاتی ہے۔ فیثاغورث افلاطون اور ارسطو خودکشی کے بظاہر مخالف ہیں۔ اور افلاطون خودکشی کی مخالفت کے باوجود دبی زبان سے یہ کہتا ہے کہ "شدتِ افلاس و مصائب سے جب زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو خودکشی جائز ہے۔ مارکس اریلیئیس کہیں خودکشی کا مخالف اور کہیں حامی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی جان پر کامل اختیار حاصل ہے۔ حکمِ اپنی کیورس کا یہ عندیہ ہے کہ۔ "خوب غور کر لو موت کا تمہارے پاس آنا بہتر ہے یا تمہارا موت کے پاس جانا۔ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ اُس کے پانچ شاگرد خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ پلیسنی بڑے فخر سے کہتا ہے کہ موت کے بارے میں عبد کو معبود پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنی حسب مرضی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اور یہ فطرت کی فیاضی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ دنیا میں ایسی جڑی بوٹیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ جن کی مدد سے انسان اپنے مصائب کا آسانی سے خاتمہ کر سکتا ہے، پیچی ایک مشہور فاضل گذارا ہے جسے خطیب مرگ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ شخص ایک طرف تو حصول لذت کو انسانی حیات کی غرض و غایت ٹھراتا ہے۔ اور دوسری طرف موت کی بہترین نعمت قرار دیتا ہے۔ یہ بڑا سحر بیان خطیب اور عظیم آتش نوا مقرر تھا۔ اسکی خطابت کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمیوں نے خودکشی کرنا شروع کر دی۔ روزانہ خودکشی کے واقعات ظہور پذیر ہونے لگے۔ ان اموات کا ملک کی آبادی پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اس لئے حکومت نے، بچی کو سکندر یہ سے جلا وطن کر دیا۔ روم کے شعراء خرین میں سیلیس اٹالیکیس کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ وہ بھی خودکشی سے مرا۔ روم کا مشہور جزل لایگنس زہر کھا کر ہلاک ہو گیا۔ اُس کے اس فعل کو ایثار اور وطن دوستی سے تعبیر کیا گیا۔ کلی پرمی گرنس جب زندگی سے اکتا گیا۔ تو اُس نے خودکشی کے وقت بہت سے دوستوں کو دعوت دی۔ اور اُن کی موجودگی میں آگ میں کود کر ہلاک ہو گیا۔

اے پلٹس کہتا ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے بچوں سے زیادہ تر بزدل نہ بنو۔ جس طرح جب بچے کھیل کود سے اکتا جاتے ہیں تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب نہ کھیلیں گے۔ اسی طرح جب تو زندگی سے عاجز آ جاؤ تو فوراً زندگی ترک کر دو۔ حکیم سنیکا کے خطبہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

اگر موت نہ ہوتی تو یہ زندگی کیسا ناقابل برداشت عذاب ہوتی۔ موت پر میرے موذی سے موذی دشمن کا بھی دسترس نہیں۔ درحقیقت موت ایسی شے ہے جو تمام مصائب کے لئے سپر ہے۔ تم تکالیف سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو اس کے لئے جس طرف نظر اٹھاؤ تمہیں وسائل و ذرائع یہ افراط ملیں گے۔ پہاڑ اور چٹان کی بلندی۔ دریا۔ کوئیں اور سمندر کی تہ جہاں چاہو ذریعہ نجات موجود ہے۔ (یعنی جس طریقہ سے چاہو خودکشی کر سکتے ہو۔ جب مجھے طریقہ موت میں انتخاب کرنا ہے۔ تو کیوں نہ میں آسان موت کو تکلیف دہ موت پر ترجیح دے کر اختیار کریوں؟ جس طرح مجھے اپنے رہنے کے لئے مکان کے انتخاب کا اور سفر کے لئے جہاز کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح طریقہ موت کے انتخاب کا بھی حق حاصل ہے۔ جس طریقہ پر تمہیں اچھا معلوم ہو زندگی کو خیر باد کہو۔ خواہ تلوار کی کاٹ سے خواہ رسی کے پھندے سے خواہ زہر کے گھونٹ سے۔ بہر حال اپنی مشکل آسان کرو۔

طریق زندگی میں تم دوسروں کی خوشی و مرضی کی پرواہ کرتے ہو۔ لیکن طریق موت بالکل تمہاری ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔ جب تک تمہاری خوشی ہے زندہ رہو۔ جب دیکھو کہ زندگی ناقابل برداشت ہوگئی ہے تو پھر بھی اُسے جھیلے رہنا خود تمہارا قصور ہے۔ جہاں سے تم آئے ہو وہاں واپس چلے جانا بالکل تمہارے قدرت و اختیار میں ہے۔ اور اس حق سے فائدہ اٹھانے سے تمہیں کون روک سکتا ہے؟

خود کشی کے متعلق اس قدر لمبے چوڑے اقتباسات پیش کرنے سے غرض صرف یہ ہے کہ ناظرین کو گناہ کے ہولناک نتائج کی تصور کھینچ کر دکھائی جاتے۔

کلام میں آیا ہے کہ گناہ کی مزدوری موت ہے۔ اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے پس موت خواہ طبعی ہو خواہ غیر طبعی اور چاہے جسمانی ہو یا روحانی وہ ضرور گناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب مرض گناہ عام ہو گیا تو مریضان گناہ نیم حکمیوں (دنیو فلاسروں) کی ستم ظریفیوں کا تختہ مشق ہے۔ اور بصدق نیم حکمی خطرہ جان اُن کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ یعنی فلاسروں نے جہاں اس زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے کئی غلط طریقے بتائے وہاں خود کشی کو بھی ذریعہ نجات قرار دیا۔ اور بنی آدم کو تعز ضلالت میں گرا دیا۔

خارجی عالم کی طبعی اشیاء اور جاندار مخلوق جن پر خُدا نے انسان کو حکمرانوں ٹھہرایا تھا اب حضرت انسان کے مخالف نظر آتی ہیں۔ اور اس مخالفت کی اصل وجہ بھی گناہ ہے۔ اور انسان اور نیچر کی اشیاء کے مابین ناموافقیت کی دو وجوہات ہیں۔

## ۱۔ انسان کا طبعی بگاڑ

ایک شخص جب بخار میں مبتلا ہوتا ہے تو بخار نہیں ہوتا۔ وہ اصلی حالت میں ہوتے ہیں۔ صرف علالتِ طبع کے باعث مریض کو وہ چیزیں بدمزہ اور خلافِ طبع معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی طبیعت گناہ کے مرض سے بگڑ گئی ہے۔ اور وہ روحانی طور پر مریض ہے۔ اس لئے فطرت کی وہ عام چیزیں جو کسی وقت اُس سے موافقت رکھتی تھیں اب خلافِ طبع معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سانپ اُس کی ڈسنا چاہتا ہے۔ شیر اُس کے خون کا پیا سا ہے۔ اسی طرح چیتا، بھیڑیا، بچھو، کھیاں وغیرہ سب اُس کو اپنے مخالف نظر آتے ہیں۔ پرور اصل یہ تمام چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ بگاڑ صرف انسان کی اپنی طبیعت میں ہے۔ اگر گناہ کام ض اُس کی طبیعت سے خارج ہو جائے تو کوئی شے اُس کی مخالف نہ رہے۔ اور ایک وقت آنے والا ہے جس میں ایسا ہی ہوگا۔ یعنی انسان مرض گناہ سے آزاد ہو کر اپنی اصلی ابتدائی پاکیزہ فطرت بر بحال کیا جائے گا۔ اور اُس وقت بھیڑیا برے کے ساتھ رہے گا اور چیتا بکری کے بچے کے ساتھ بیٹھے گا۔ اور نیچر اور شیر بچہ اور پلا ہوا بیل مل جُل کر رہیں گے۔ اور ننھا بچہ اُن کی پیش روی کرے گا۔ گائے اور رگھینی مل کر چریں گی۔ اُن کے بچے اکٹھے بیٹھیں گے۔ اور شیر بیل کی طرح بھومہ کھائے گا۔ اور دو دوہ پیتا بچہ سانپ کے بل کے پاس کھیلے گا۔ اور وہ لڑکا جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو انجی کے بل میں ہاتھ ڈالے گا۔ وہ میرے کوہِ مقدس پر نہ ضرور پہنچائیں گے نہ ہلاک کریں گے (یسعیاہ ۱۱: ۶-۹)

## ۲۔ انسان کی اصل مرتبہ سے تنزل

انسان اور اشیائے نیچر کے مابین ناموافقیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان نے خُدا کا گناہ کر کے اپنا اصل مرتبہ کھو دیا۔ خُدا نے اُسے پاک و راست پیدا کر کے تمام موجودات پر حکمران ٹھہرایا تھا۔ (زبور ۸: ۵-۸) لیکن اُس نے گناہ کر کے اپنی طبیعت کو خُدا کی طبیعت کا مخالف بنا لیا۔ اور حکم عدولی سے اپنا وہ تمام اختیار و اقتدار رکھو دیا اور اپنے عہدہ سے معزول ہو گیا۔ اس لئے اب نیچر کی اشیاء اُس متزلزل و معزول شدہ حاکم کے اختیار کو تسلیم نہیں

کرتیں کیونکہ اگر کوئی گورنر شہنشاہ کے برخلاف سر اٹھانے کے باعث اپنے عہدہ سے معزول کر دیا جائے تو رعیت اُس کے رعب و اختیار کو خاطر میں نہ لائے گی اور نہ ڈرے گی۔ یہی حال خلیفہ خدا حضرت انسان کا ہوا۔ اُس نے خدا سے بغاوت کی اس لئے نیچر کی ادنیٰ مخلوق پورے طور پر اُس کے تابع نہیں رہی۔ درندے اُس کو پھاڑنا چاہتے ہیں۔ سانپ اُس کو ڈسنا چاہتے ہیں۔ دریا اُس کو ڈبو دینا چاہتا ہے۔ جراثیم اُس کے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر یہ مخلوق کبھی اُس سے خوف بھی کھاتی ہے تو یہ اُس کی شوکتِ گذشتہ اور جلالتِ رفتہ کا اثر ہے۔ اب اگر وہ کسی طرح پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر سابقہ منصب پر بھال نہ کیا جائے تو اُس کی اختیار پورے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

## گناہ کے نتائج

اب تک ہم نے گناہ کے جسمانی نتائج کا جائزہ کر لیا ہے۔ منجہ ان تمام جسمانی نتائج کے گناہ کے تین نہایت ہولناک روحانی نتائج ہیں۔ جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ طبعی بگاڑ۔ خدا نے انسان کو پاک و راست پیدا کیا تھا۔ یہ انسان کی اصلی فطرت تھی۔ لیکن گناہ نے اُس کی پاکیزہ فطرت پر اثر انداز ہو کر اُسے پاک سے ناپاک بنا دیا۔ لہذا وہ اصل فطرت پر قائم نہ رہا۔ پاکیزگی کے کھنڈرات پر گناہ نے اپنی عمارتیں اٹھائیں۔ اور زندگی کے شیریں چشمہ کو زہریلا بنا دیا۔ پس گناہ کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے انسان کی طبعیت کو بگاڑ دیا۔

۲۔ خدا تعالیٰ پاک و قدوس ہے (استغنا ۳۲: ۴) اور انسان ناپاک اور گنہگار ہو گیا۔ اور خدا اور انسان کی طبائع باہم درمخلاف ہو گئیں۔ اور ضدین کا اجتماع محال ہے لہذا خدا و انسان میں جدائی واقع ہو گئی۔ کیونکہ راست بازی اور بے دینی میں کیا میل جول؟ یا روشنی اور تاریکی میں کیا شراکت؟ (۲۔ کرنتھیوں ۶: ۱۴) اور اس جدائی سے مراد بعد مکافی نہیں۔ کیوں کہ ہر چند کہ وہ ہم میں کسی سے دور نہیں۔ کیونکہ اسی میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں (اعمال ۲۷: ۲۸) بلکہ یہاں جدائی سے مراد طبعی ناموافقیت ہے (زبور ۵: ۴؛ یسعیاہ ۵۹: ۲) اور خدا سے جدائی کا نتیجہ انسان کے لئے سب سے زیادہ ہولناک ہے۔

۳۔ سزائے عدالت۔ خدا عادل ہے اور انسان اُس کی عدول حکمی کر کے اُس کا مجرم ٹھہرا خدا کی شریعت کا عدول کرنا ہی گناہ ہے۔ (۱۔ یوحنا ۳: ۴) اب وہی شریعت الہی جس کو حضرت انسان نے توڑا اُس کو مجرم ٹھہرا کر اُس پر سزا کا حکم لگاتی ہے۔ اس لئے کلام فرماتا ہے کہ "شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے (رومیوں ۴: ۱۵) اس لئے گنہگار ابدی ہلاک کا سزاوار ہے۔ اور گناہ کی مزدوری موت ہے (رومیوں ۶: ۲۳) اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے (یعقوب ۱: ۱۵) اور وہ موت جو گناہ کی مزدوری ہے صرف جسمانی اور طبعی موت نہیں کیونکہ؛

۱۔ اس صورت میں جسمانی موت گناہ کی مزدوری یا سزا نہیں بلکہ حزا ٹھہرے گی۔ کیونکہ سزا تو موتِ طبعی پر ہی ختم ہو جائے گی۔ اور موت کے بعد ایک راست و ناراست جنت کا وارث ٹھہرے گا اور جسمانی موت بہشت میں داخل ہونے کا دروازہ ٹھہرے گی۔

۲۔ بہشت میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ گناہ کریں۔ تاکہ طبعی موت آئے۔ اور بہشت میں پہنچا دے اور نیک کردار لوگ بد نصیب ٹھہریں گے۔ کیونکہ نیکی کرنے سے موت نہ آئے گی اور انہیں جنت کی بجائے اس دنیا کے آلام و مصائب میں رہنا پڑے گا۔

۳۔ خدا کی بخشش کوئی چیز نہ ٹھہرائے گی۔ اور راست و ناراست ہر دو کو ایک دفعہ موت کے منہ میں جانا پڑے گا۔ اور ساری دنیا کے لئے مرنا ضروری ہے۔ تو اس حالت میں خدا کی بخشش کیا فائدہ رکھے گی۔ ہر ایک کے لئے ضرور ہے کہ مرے۔ خدا کی رحمت کسی کا بھلا نہ کرے گی۔

۴۔ بچوں کا خورد و سالی میں مرنا یہ ثابت کرے گا کہ وہ بالغوں کی بہ نسبت زیادہ گنہگار ہیں۔ کیونکہ اُن کی موت جلد اور قبل از وقت واقع ہوتی ہے۔ جیسے قاتل جو سب سے بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے وہ چور کی بہ نسبت جو چھوٹا مجرم سے جلد مارا جاتا ہے۔ یعنی اُسے قبل از مرگ پھانسی دی جاتی ہے۔

۵۔ پھر بڑے بڑے گنہگاروں کا عرصہ دراز تک زندہ رہنا یہ ثابت کریگا کہ گناہ کی زیادتی عمر کی درازی کا موجب ٹھہری۔ اور بچوں کا صغر سنی میں مرنا یہ ثابت کرے گا (گناہ) کی کمی عمر کی کوتاہی کا باعث ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ گناہ کی مزدور (مزا) یہ جسمانی اور طبعی موت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ روحانی جس کو انجیل مقدس میں دوسری موت کہا گیا ہے۔ یہ دوسری موت ہے (مکاشفہ ۲۱: ۲۰، ۸: ۱۴) خُداوند مسیح نے بھی اس رُوحانی موت (مزد گناہ) کا بیان صفائی سے کیا ہے۔ جو بدن کو قتل کرتے ہیں۔ اور رُوح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو۔ بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح و بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ (متی ۱۰: ۲۸) جس طرح فطرت کے اسبابِ خارجہ کے ساتھ جسم کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہنے سے جسمانی اور طبعی موت آتی ہے۔ اور قوانینِ طبعیہ کی مخالفت سے جسمانی موت بطور نتیجہ کے لازمی ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح قوانینِ روحانیہ (احکام و شرائعِ الہیہ) کی عدولی اور خلاف ورزی رُوحانی موت کا موجب ٹھہرتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اشرف وجود کے فساد سے ادنیٰ وجود کا فساد لازم آتا ہے۔ اس لئے رُوح کے فساد سے جسم کا فساد بطور لازم و ملزوم کے ضروری ٹھہرا۔ پس جسمانی موت نتیجہ ہے رُوحانی موت کا۔ رُوحانی موت کی علت گناہ اور جسمانی موت کی علت رُوحانی موت ہے۔<sup>۳</sup> اور یہ رُوحانی اصطلاح ہے۔ خُدا کی زندگی سے خارج ہو کر انسان میں بقا کی تاثیر قائم نہ رہی۔ جیسے ایک برقی تار کا تعلق پاور ہاوس سے منقطع ہو جانے پر اُس میں برقی قوت مفقود ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہو گئی ہے۔ اور وہ اُس نادانی کے سبب جو اُن ہے اور اپنے دلوں کی سختی کے باعث خُدا کی زندگی سے خارج ہیں (فیسیوں ۴: ۱۸) ایک مچھلی سمندر سے جُدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ گو اُس کے مرنے میں کچھ عرصہ بھی لگ جائے۔ تو بھی موت کے قبضہ میں وہ اُسی وقت سے آجاتی ہے جب سمندر سے جُدا ہو جاتی ہے۔ موت اُس پر آہستی آہستی اثر کر کے آخر اُسے فنا کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان جب خُدا سے گناہ کے باعث جُدا ہو گیا تو اُس کی رُوحانی موت اُسی وقت سے شروع ہو گئی۔ اور اگر کسی صورت اُس کا خُدا سے ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے جوڑا نہ جائے وہ موت کے یقینی راستہ پر ہے۔ اور ایک وقت ضرور فنا ہو جائے گا۔ ادنیٰ وجود ہمیشہ اشرف وجود کے ساتھ متعلق رہ کر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس سے جُدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے اُسی طرح رُوح خُدا کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ رُوح سے جُدا ہو کر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اور خُدا سے ہو کر رُوح کا فنا ہونا ضروری ہے۔ پس رُوحانی موت کے یہی معنی ہیں۔ اب ہم رُوحانی مردگی کے متعلق کلامِ مقدس کی سند بھی پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین ہمارے اس بیان کو محض ذہنی فلسفہ ہی نہ سمجھیں۔ بلکہ جان لیں کہ اس حقیقت کی بنیاد کلامِ مقدس پر ہے۔ اور اُس (خُدا) نے تمہیں بھی زندہ کیا جب اپنے قصوروں اور گناہوں کے سبب مردہ تھے (فیسیوں ۲: ۱) جب قصوروں کے سبب مردہ ہی تھے تو ہم کو مسیح کے ساتھ زندہ کیا (فیسیوں ۲: ۶، ۵) اور اُس نے تمہیں بھی جو اپنے قصوروں اور جسم کی نامختونی کے سبب سے مردہ تھے اُس کے ساتھ زندہ کیا (کلیسیوں ۲: ۱۳) پس جب تم مسیح کے ساتھ چلائے گئے (کلیسیوں ۳: ۱ اور رومیوں ۶: ۵) اور وہ کام جو انسان رُوحانی مردگی کی حالت میں کرتا ہے کلامِ انہیں مردہ کام کہتا ہے۔ پس آؤ۔ مسیح کی تعلیم کی ابتدائی باتیں چھوڑ کر کمال کی طرف قدم بڑھائیں۔ اور مردہ کاموں سے توبہ کرنے اور خُدا پر ایمان لانے کی۔۔۔۔۔ وغیرہ (عبرانیوں ۶: ۱) مسیح کا خُون جس نے اپنے آپ کی ازلی رُوح کے وسیلے خُدا کے سامنے بے عیب قربان کر دیا تمہارے دلوں کو مردہ کاموں سے کیوں نہ پاک کرے گا (عبرانیوں ۹: ۱۴)۔

<sup>۳</sup> رُوحانی موت سے مراد رُوح کی فنا یا نیستی نہیں ہے بلکہ خُدا سے جُدا ہونا اور روحانی موت ہے۔

اے ناظرین! ہم نے گناہ کی حقیقت و ماہیت کی تحقیق و تدفین میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا۔ بلکہ نہایت وضاحت سے اُس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی طرح کی نوعیت و ماہیت کی صحیح تشخیص نہ کی جائے اُس کا علاج محال ہوتا ہے۔ مسیحیت کے باہر تمام فلسفوں نے گناہ کی ماہیت کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔ اور اُس کے اسباب و موجبات اور نتائج کا صحیح سراغ لگانے میں قطعی قاصر رہے۔ اسی واسطے اُن کے نجات کے طریقے ادھورے اور نادرست ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے طریقہ نجات اور دیگر تمام مذاہب کے طریق نجات میں بعد المشرقین ہے۔ پس اپنے دل و دماغ کو تعصب سے خالی کر کے مسیحی طریقہ نجات پر جو آئندہ صفحوں میں مدخل طور پر بیان کیا گیا ہے غور فرمائے۔

## نجات

جس طرح گناہ کے وجود کو تمام مذاہب اور تمام فلسفے کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت کے بھی سب بزور قائل ہیں۔ اور سب مانتے ہیں کہ گناہ سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت پر بحال ہونا لازمی ہے۔ جو شخص صدق دلی سے گناہ کے مسئلہ پر جو ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کیا غور و خوض کرے گا وہ اس حقیقت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب کہ واقعی انسان کی ایسی اہتر حالت ہے تو اُس سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت کا واجب تقاضا ہے اور اگر کسی صورت اس ہلاکت آفریں حالت سے آزادی حاصل نہ کی جائے تو ہلاکت لازمی ہے۔ اور گناہ سے آزاد اور اصلی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر تقرب الہی کو حاصل کرنا ہی نجات ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غیر فطری (گناہ آلودہ) حالت سے کس طرح آزادی حاصل کی جائے۔ اور مقاربت الہی و موصلت وجود لا متناہی کے مشکل سوال کا کیا حل ہے؟ دُنیا کے تمام رائج الوقت مذاہب اور فلسفے اس سوال کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ یعنی حصول نجات کے متعلق سب مذاہب کے طریقے باہم متضاد و متباہن ہیں۔ اور اُن میں بعد المشرقین ہے۔ ان کثیر التعداد عقائد کو دیکھ کر متلاشی نجات کے دل میں جو دوسرا سوال قدرتی طور پر اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ سب عقائد صحیح ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟ اگر سب صحیح ہیں تو ایک شخص اُن واحد ہیں ان سب متضاد خیالات و عقائد کا کیسے حامی ہو سکتا ہے؟ دیکھ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی شخص فی نفسہ ان تمام عقائد کو ایک ہی وقت میں درست تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ سراسر محال ہے۔ اور اگر صرف ایک عقیدہ ہی درست ہے تو ہو کو نسا ہے؟ یہ قدرتی سوالات ہیں جو ایک متلاشی حق کے دل کر بے چین کر دیتے ہیں۔ لہذا یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مختصر طور پر یہاں نجات کے متعلق چند مروجہ عقائد کی تحقیق کریں۔ اور سب سے اول دو بدیہی اور مشہور طریقے جو تمام اہل دنیا مشترک طور پر ازالہ گناہ اور حصول نجات کے لئے قدیم سے عمل میں لاتے رہے ہیں پیش کریں گے۔ ایک اُن میں سے اختیاری اور دوسرا جبری طریقہ ہے۔

## اختیاری طریقہ

جب سے دُنیا میں گناہ کا احساس ہوا ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت سے ریفارمر ہر قوم میں پیدا ہوتے آئے جن کا نصب العین یہ رہا کہ اپنی اپنی قوم کو تہدید و تلقین کریں۔ بدی سے روکیں نیکی کی ترغیب دلائیں۔ چوری، حق تلفی، جھوٹ فریب، زنا، خون ریزی، بدخواہی، بداندیشی، بے انصافی اور ظلم و ستم وغیرہ گناہوں کو مٹانے کے لئے مصلحان قوم، ہادیان دین اور مقننانِ زمن نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اپنی جانیں چھڑک دیں۔ ان عیوب و ذلوب کی مدافعت کے لئے کروڑ ہا من کتابیں لکھیں گئیں۔ ہر زمانے میں تقاریر کی گئیں۔ سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ قومی و مذہبی مجالس وجود میں

لائی گئیں۔ ہر مذہب نے امصار و دیار میں مبلغ و مبشر بھیجے۔ مدارس قائم کرے تعلیم کو تمام کافہ انام پر پھیلا دیا گیا۔ تہذیب کو ترقی کی اعلیٰ منازل پر پہنچایا گیا۔ خدا ترس لوگوں نے بدی کے تخم کو مٹانے اور نیکی کے پودے دُنیا میں لگانے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقفِ ایثار کر دیا۔ روزے رکھے گئے۔ نمازیں پڑھی گئیں تہوار منائے گئے متبرک مقامات کی زیارتیں کی گئیں۔ مذہبی رہنماؤں کی سرگرم تقریریں اور دل ہلا دینے والے وعظ و نصیحت ہر زمانے کے لوگوں کے کانوں پر دستک دیتے رہے۔ یہ سب کچھ کس لئے ہوا؟ صرف اس لئے کہ نوع انسان گناہ کی آہنی زنجیروں سے آزاد ہو کر نیکی اور راست بازی کی جستجو کرے اور حقیقی اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن ذرا انصاف سے کہئے کہ ان سرگرم کوششوں، انتھک محنتوں اور جگر کاویوں نے کون سے خوشگوار نتائج اب تک پیدا کئے؟ کیا یہ مخلصانہ وسائل گناہ کے استیصال میں کامیاب ہوئے؟ اور کیا گناہ کے سیاہ داغوں سے دُنیا کا دامن صاف ہو گیا؟ ہرگز نہیں گناہ بیش از پیش موجود ہے بقول مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

## جبری طریقہ

تاریخِ شہادت دیتی ہے کہ دنیا میں راعی و رعیت کا سلسلہ بہت قدیم سے چلا آیا ہے۔ اور بادشاہ کا ہمیشہ یہ کام رہا ہے کہ وہ زورِ بازو سے بدی کو اپنی سلطنت میں سے مٹائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے ماتحت ہر زمانہ میں بادشاہوں نے تعزیری قوانین بنائے۔ پولیس قائم کیں، فوجیں تیار کیں، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنائیں۔ پھانسیاں اور شکنجے تیار کئے۔ جیلیں وجود میں لائے۔ خونیوں اور قاتلوں کو پھانسیاں دیں۔ چوروں اور غداروں سے جیلوں کو بھر دیا۔ ڈاکوؤں کو گولیوں سے اڑا دیا۔ غرضیکہ شجر گناہ کے استیصال اور جرائم کے اسداد کے لئے جبر و تشدد اور رعب و داب کو بجد امکان استعمال کیا گیا۔ مگر چوروں نے قید خانہ سے نکل کر پھر چوری پر کمر باندھی۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ڈاکوؤں کو نہایت عبرتناک۔ طریقوں سے شکنجوں میں کھینچا گیا تو بھی دیکھنے والوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ تمام جرائم و جرائم اسی صورت میں بلکہ اُس سے بھی زیادہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ کیا جبر اور قوتِ بازو سے گناہ مٹ گیا؟ ہرگز نہیں تجربہ شاہد ہے کہ جرائم کے تعزیری و اصلاحی طریق علاج یقیناً ناقص ہیں۔ کیونکہ وہ گناہ کے اصل منبع و مخرج تک نفوذ نہیں کرتے بلکہ اُس کے مظاہر پر مواخذہ کرتے ہیں۔ جس حال کہ انسانی کوشش کے بازو صدیوں آزمائے گئے۔ تو اب آئندہ کیا امید کی جاسکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسانی طاقت گناہ کی طاقت پر ہرگز غالب نہیں آسکتی۔ اس لئے کلام فرماتا ہے۔ ہر چند تو اپنے کو سچی سے دھوئے اور بہت سا صابون استعمال کرے۔ تو بھی خداوند فرماتا ہے۔ تیری شرارت کا داغ میرے حضور عیاں ہے (یرمیاہ ۲: ۲۲؛ ۱۳: ۲۳)

تناخ: ہم ہندوں کے ختم نہ ہونے والے مسئلہ تناخ کے سلسلہ کی تفصیل سے ناظرین کے صبر و سکون کا امتحان لینا نہیں چاہتے۔ اس لئے چند مختصر مگر معقول دلائل سے یہ ثابت کریں گے کہ عقیدہ آواگون (تناخ) کے مطابق گناہ کی طبیعت سے رہائی اور حقیقی نجات کا حصول محال ہے۔ یہ محض ایک ذہنی فلسفہ ہے جو عالم اسباب کی ناہمواری اور غیر یکسانیت کو دیکھ کر گھڑا گیا ہے اور جس پر یقین کرنے سے انسان کی روحانی پریشانی ذہنی اضطراب اور قلبی بے قراری بدستور قائم رہتی ہے۔ اور وہ حقیقی اطمینانِ روحانی اور تسکینِ قلبی سے قطعی محروم رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس وہمی مسئلہ کی غیر معقولیت مبرہن ہوتی ہے۔

۱۔ اگر تمام موجودات کا تجربہ کیا جائے تو دو اجزا حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی رُوح اور مادہ۔ اور حامیا تناخ کا عقیدہ ہے کہ خدا ان دونوں چیزوں کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ وہ دونوں خدا کے ساتھ قدیم ہیں۔ اس صورت میں رُوح و مادہ خدا کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی ہستی کی از خود علت ہو کر خدا کے دائرہ حکومت سے خارج ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ خدا اس دُنیا کا خالق نہیں بلکہ صرف ترتیب دہندہ ہے۔ اور جب خدا ان (رُوح و مادہ) پر حقِ خالقیت

نہیں رکھتا تو اُس کا کیا حق ہے کہ آزاد رُوحوں کے متعلق سزا و جزا کے احکام صادر فرما کر انہیں تناخ کے لاتنا ہی چکر میں تاابد گھماتا رہے؟ اور نہ وہ کسی سے استحقاقِ عبادت رکھتا ہے۔

۲۔ اگر بالفرض مجال یہ مان لیا جائے کہ خُدا کو سزا و جزا دینے کا حق حاصل ہے۔ تو اس صورت میں اندھوں، لنگڑوں، محتاجوں اور اپاہجوں پر رحم کرنا اور اُن سے ہمدردی کرنا خُدا سے مخالفت و بغاوت کرنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ خُدا تو اُن کو اُن کے سابقہ اعمالِ بد کے باعث دُکھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اور اُن کے دُکھوں کو کم کر کے عدلِ الہی کا مخالف ارخُدا کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اس صورت میں رحم، ہمدردی اور محبت کے مواقع ہی نہ رہیں گے۔ اور نیکی کا وجود ہی دُنیا سے نابود ہو جائے گا۔ کیونکہ نیکی کے مفہوم میں جتنی باتیں شامل ہیں اُن کا غالب حصہ مظلوموں لاچاروں اور بے کسوں ہی سے متعلق ہے۔ پس خُدا کے قیدیوں کو آرام دینا اور اُن کی استمداد و معاونت کرنا خُدا کی مخالفت ٹھہریگی اور اعمالِ حسنہ (نیک کرم) جن پر تناخ کی نجات کا مدار ہے ملیا میٹ ہو جائیں گے۔

۳۔ جیو کی طبیعت کو اُس کے متعلقہ جنم کے مطابق بنا دینا کوئی سزا نہیں۔ کیونکہ وہ تو اُس کی طبعی حالت ہوگی، اور یہ ظاہر ہے کہ طبیعت ہر گز سزا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک غریب مزدور کو مجرم ہونے پر یہ سزا دی جائے کہ وہ سڑک پر پتھر کو ٹا کرے تو یہ اُس کے لئے سزا نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ کام وہ پہلے بھی کیا کرتا ہے، یا کسی مجرم کو یہ سزا دی جائے کہ تم رات بھر سویا کرو، یہ بھی طبعی بات ہے اور اس سے سزا کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ایک گورنر کو اُس کے جرم کی پاداش میں سڑک پر پتھر کو ٹٹے پر لگا دیا جائے تو اُس کے لئے یہ ضرور سزا ہوگی۔ کیونکہ اُس کی اپنی شاہانہ طبیعت اور سزا کی نوعیت میں بہت اختلاف ہے۔ اور اس صورت میں اُس کے نفس کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ مگر سزا کو طبیعت بنا دینے سے نہ تو وہ سزا ہی رہے گی اور نہ اُس سے کسی اصلاح کی اُمید ہو سکتی ہے۔ تمام حیوانات اپنی حیوانی حالت میں خوش ہیں۔ اگر کسی کتے یا کسی اور جانور کو قتل کرنا چاہو تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے فوراً بھاگتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس جسم (قید) میں وہ ہے اُس سے آزاد ہونا نہیں چاہتا، بلکہ اسی میں خوش ہے۔ جس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اُس حالت کو قید۔ بندھ یا سزا نہیں سمجھتا، بلکہ طبعی حالت، پس طبیعت سزا نہیں ہو سکتی، اور اس طریقہ سے تہذیبِ النفس اور ارتقاء و حائین و اخلاقی کامکان ہی مجال ہے۔

۴۔ کسی مجرم کو ہتھکڑیاں اور بیٹریاں لگانے اور قید میں بند رکھنے سے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو سزا دینا جس سے اُس کی اصلاح بھی ہوئی ہے۔ اور دوسرے اُس کی آئندہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگا کر اُسے اور جرائم کے ارتکاب سے کچھ عرصہ کے لئے روکنا۔ تاکہ اس کی مجرمانہ عادت جاتی رہے۔ وہ پچھلے جرائم کی سزا بھگتا اور آئندہ جرائم کے ارتکاب کا راستہ اُس پر کچھ عرصہ کے لئے بند کیا جاتا ہے۔ اور وہ قید کی حالت میں واقعی کسی اور جرم کا ارتکاب کرنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ مگر خُدا کے قیدیوں کا حال دیکھئے کہ وہ قید میں رہ کر بھی دوسروں کا نقصان کر سکتے ہیں بلکہ انصافِ خُداوند ہی اور انتظامِ الہی ملاحظہ فرمائیے کہ جرائم کے ارتکاب میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے اُن کی قوت کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شیر گراں قدر شہزور نہ ہو تو اپنی زندگی میں ہزاروں جانوں کو ہلاک نہ کر سکے۔ اگر شیر کی جون فی الحقیقت جیو کے لئے کوئی قید ہوتی تو لازم تھا کہ ایک تو شیر کی قوت بہت کم ہوتی اور دوسرے اُس میں کسی دوسرے کو ہلاک کرنے کی قابلیت نہ ہوتی۔ اس لحاظ سے انسانی عدالت و انتظام کو الہی انتظام میں معدلت پر فضیلت حاصل ہے۔ چونکہ عقیدہ تناخ کی رُو سے خُدا کے انتظام میں نقص ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ خود سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔

۵۔ کسی مصیبت زدہ انسان یا کسی بھی حیوان کو یہ علم نہیں کہ کس خاص گناہ کی پاداش میں وہ اُس خاص جسم (سزایا بندھ) میں مقید ہے۔ اس لئے بلا اظہار جرم کسی کو سزا دینا ایک تو بے انصافی اور ظلم ہے اور دوسرے اس سے مجرم کی اصلاح محال ہے۔ اگر جرم سے آگاہی ہو تو سزا اصلاح کا کام دے سکتی ہے ورنہ نہیں۔

۶۔ عقیدہ تناسخ کے مطابق کل ۸۴ لاکھ جو نیں (اجناس) مسلم ہیں۔ اور انسانی جون اُن میں سے ایک ہے۔ انسانی جون کرم جونی (فعل کی جگہ) ہے۔ اور باقی ۸۳۹۹۹۹۹ جو نیں بھوگ جو نیاں (قیدیں) ہیں۔ جبکہ ۸۴ لاکھ اجناس میں سے ۸۳۹۹۹۹۹ اجناس تو قیدوں میں ہیں اور رصر ایک جنس (انسانی جون) آزاد ہے۔ اور انسانی جون میں بھی بیماریوں، لاپاروں، اندھوں، لنگڑوں اور مفلوسوں و بیکسوں کی تعداد غالب ہے۔ اور وہ بھی خُدا کے قیدی ہیں تو اس صورت میں قیدیوں کی تعداد آزادوں کی تعداد سے لاکھوں گنا زیادہ ہوئی۔ اس کی کوئی بدیہی مثال عالم میں نہیں ہے کہ قیدی آزادوں سے زیادہ ہوں۔ اور وہ بھی کروڑوں بلکہ سیکھوں کی تعداد میں۔ یہ بھی اس عقیدہ کے بطلان کی دلیل ہے۔

۷۔ آواگون کی رُو سے کسی بیخ قوم میں پیدا ہونا بھی سابقہ بُرے اعمال کی سزا ہے۔ تو اس صورت میں ہندوؤں کا شدھی سنگٹھن کا ڈھکوسلہ قائم کر کے اچھوٹ اُدھار کرنا حدل الہی کی مخالفت و بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ خُدا نے اُنہیں سزا دی ہے کہ نیچوں کے گھر پیدا ہوں اور آریہ پرچارک اُنہیں شُدھ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ کیا اندھیر ہے؟ شاہد خُدا کی ناراضگی کو اس امر میں وہ بھی محسوس کرتے ہیں اور اسی لئے اچھوتوں کو چکھے جھانسنے دے کر سطحی طور پر شُدھ کرتے پھرتے ہیں اور دراصل اُن کے ساتھ مرتبط ہونے سے گھبراتے ہیں۔

نُجوفِ طوالت اتنے ہی دلائل پر اکتفا کیا جاتا ہے اور اسی قدر بیان سے ناظرین پر خوب روشن ہو گیا ہو گا کہ عقیدہ تناسخ محض مفروضات و توہماتِ ذہنیہ کا مجموعہ ہے۔ اور حصولِ نجات کے لئے اُس پر اپنے ایمان کی بنیاد رکھنا خُدا کی ہستی سے انکار کرنے کے برابر ہے۔ تناسخ کی نجات مادیات کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور حفاظتِ جسمانیہ و لذائذِ نفسانیہ کو زندگی کی غایت سمجھا گیا ہے اور اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ گناہ آلودہ طبیعت سے حقیقی نیکی کا صدور محال ہے۔ ہم نے اس بحث کے آغاز ہی میں دو طریقے اختیار کیے و جبری گناہ کی مدافعت کے متعلق درج کئے ہیں۔ اور اُن میں دکھایا ہے کہ گناہ کا ازالہ انسانی تدابیر سے محال ہے۔ پس جب گناہ ہی کا ازالہ و اندفاع محال ہے تو نیکی کہاں سے آجائے گی؟ جیسے گناہ آلودہ طبیعت سے گناہ ہی صادر ہوتا ہے ویسے ہی نیک طبیعت سے نیکی کا حصول ضروری ہے۔ اب ہم اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اعمالِ حسنہ بیان میں اس بحث پر مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

## تشریحِ نفس

گناہ کی موجودگی دُنیا میں ہر قسم کے ڈکھ درد، رنج و آلام اور مصائب و عقوبت کا باعث ہے اور تمام لوگ دل سے متمنی ہیں کہ کسی طرح جسمانی آلام سے اُن کا دامن چھوٹ جائے اور حقیقی خوشی اور اطمینان قلبی حاصل ہو جائے۔ یہ واقعی بہت سعیدہ خواہش ہے اور انسان کی ابتدائی پرسکون و اطمینانِ فطرت کا واجبی تقاضا ہے۔ لیکن اُس مسرت مقصودہ کی نوعیت کے اعتبار سے دو قسم کے خیال دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان خیالات کی حمایت میں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو روحانی خوشی اور ابدی مسرت کے جو یاں ہیں۔ اور جسم کو حقیر اور ناچیز سمجھ کر اُسے بے دردانہ طور سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں اور تزکیہ و ریاضتِ جسمانی کو اُس روحانی خوشی کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور وجودِ عنصری کو اُس اعلیٰ روحانی مقصد کے حصول میں سدراہ سمجھ کر اُس سے ایسی دشمنی کرتے ہیں کہ بعض دفعہ تو وہ مجبور ہو کر طائرُ روح کو پرواز کرنے کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔

یہ فطرت کے خلاف جہاد ہے اور خُدا کی ناشکر گزاری۔ خُدا نے جب خود ہی جسم بنایا اور اُس کے قائم رکھنے کے لئے اس کارخانہ فطرت میں ہر طرح کے سامان پیدا کر دئے۔ کھانے کے لئے خوراک پہننے کے لئے پوشاک۔ بیماریوں کے علاج کے لئے ہر نوع کی جڑی بوٹیاں اور ادویہ بنا دیں۔ حکماء و اطباء کو حکمت و ذہانت سے بہرہ ور فرمایا تاکہ وہ انسانی اجسام کو قائم رکھنے کے لئے ان ادویہ کا درست استعمال کر سکیں۔ یہ تمام سامان اس جسد خاکی کی حفاظت کو ضروری سمجھتا ہے اور اُس کی مرضی یہی ہے کہ جسم تادیر قائم رہے۔ اب اگر اس جسم کو ریاضیت کے ذریعہ اذیت دی جائے۔ اس کی پرورش بند کر دی جائے اور فاقہ کشی اختیار کی جائے تو کیا یہ خُدا کی مرضی کی مخالفت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی دوسری بات یہ ہے کہ جسم کو ڈکھ اور ایذا دینے سے گناہ جو آلام و مصائب کا موجب ہے ہرگز مردہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے سانپ کے بل کو مارنے سے سانپ نہیں مر سکتا۔ اور ترکِ دُنیا سے فعلی اور عملی گناہوں کا امکان گومت جاتا ہے تاہم خیالی اور ادائی گناہ سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ جیسے ایک مبروص کو دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھنے پر بھی اُس کا مرض دور نہیں ہوتا۔ ایک سانپ کو دوسرے سانپوں سے جُدا رکھنے سے اُس کا زہر دور نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اگر کسی سانپ کو غیر آباد ویرانے میں چھوڑ آئیں تو اُس کا ڈس لینے کا امکان مٹ جاتا ہے۔ مگر زہر تو دور نہیں ہوتا۔

اسی طرح سے وہ بُری طبیعت اور گناہ کا متوارث اعلان جو نوعِ انسانی کے ہر فرد میں موجود ہے تزکیہ نفس اور ترکِ دُنیا سے دور نہیں ہو سکتا۔ لہذا ان ذرائع سے گناہ کا ازالہ محال اور نجات کا حصول ناممکن ہے۔ اس طریق میں افراط ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو جسمانی اور نفسانی خوشی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹے ہیں۔ اگر کسی طرح نجات کے قائل بھی ہیں تو جنت میں نفسانیت و مادیات کو ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ وہ نفسِ امارہ کے یہاں تک غلام ہو چکے ہیں کہ روحانی خوشیوں کو بھی نفسانیت پر ہی قیاس کرتے ہیں۔ اور اس زندگی کے بعد کسی اعلیٰ روحانی زندگی اور اعلیٰ اور غیر فانی روحانی خوشی کے قائل نہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ کھائیں پیئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائیں گے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۳۲) انجیلِ جلیل اُن ک حق میں فرماتی ہے۔ اُن کا انجام ہلاکت ہے۔ اُن کا خُدا پیٹ ہے۔ وہ اپنی شرم کی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ اور دُنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں (فلپیوں ۳: ۱۹) اور وہ حق سے محروم ہیں اور دینداری کو نفع ہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں (۱۔ تیمتھتیس ۶: ۵) ایسے لوگ اس دنیا کی عیش و عشرت اور چند روہ آرام و خوشی کو مکتی اور نجات سمجھ بیٹھے ہیں تناخ کے حامی بھی اسی دُنیا کے آرام و راحت اور مدارج و معارج کو حقیقی خوشی سمجھ کر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر پر ماتمانیائے کاری ہے تو اُس نے بعض کو غریب اور بچ کو امیر کیوں پیدا کیا اور خوش حالی و تنگدستی کو انسان کے گذشتہ جنم کے بھلے یا بُرے اعمال کا نتیجہ مانتے ہیں۔ حالانکہ اس دُنیا کی جسمانی و نفسانی خوشی و راحت کسی صورت نجات کی خوشی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس دُنیا کا ڈکھ درد خُدا کی عدالت کے باعث ہے۔ یہ چیزیں اگر دُنیا کو ملتی ہیں تو محض جسم کو کسی عرصہ تک قائم رکھنے کے لئے۔ نیک اعمال جو خاص روح سے متعلق ہیں وہ دُنیا کی نجات اور دُنیا کی خوشی کا موجب ہو سکتے ہیں نہ کہ نفسانی و جسمانی خوشی کا۔ اگر یہ تمام فوائد و منافع کرموں ہی کا پھل ہیں تو ایسے لاکھوں آدمی موجود ہیں جو دہریہ والدین کے بیٹے اور دہریہ دادا کے پوتے ہیں۔ لیکن باوجود دہریہ ہونے کے دُنوی جاہ و ثروت اور آرام و آسائش و رشتگان کے حصہ میں آتے ہیں۔ یہ سراسر دھوکا ہے۔ انجیل اس خیال کی بزور مخالف ہے۔ اُوپر کے خیال میں افراط ہے اور اس خیال کی بزور مخالف ہے۔ اُوپر کے خیال میں افراط ہے۔ اور اس خیال میں تفریط ہے۔ فریق اول جسم کو ناچیز و حقیر سمجھ کر اُس کا مٹانا چاہتا ہے تاکہ روحانی اطمینان کو حاصل کرے۔ اور فریق ثانی جسم کی بُری خواہشات کا غلام ہے۔ اور رحو اور دُنیا کی خوشی کی طرف سے قطعی لاپرواہ ہے۔ ان دونوں خیالوں میں افراط و تفریط ہے جو کہ معیوب ہے۔ انجیل ان دونوں خیالات کے بین بین چلتی ہے۔ وہ ریاضت جسمانی کے خلاف فرماتی ہے۔ ان باتوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی عبادت اور خاکساری اور جسمانی

ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صورت تو ہے۔ مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا (کلیسوس ۲: ۲۳) دینداری کے لئے ریاضت کر۔ کیونکہ جسمانی ریاضت کا فائدہ کم ہے۔ لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے۔

اس لئے کہ اب کی اور آئندہ کی زندگی کا بھی وعدہ اسی کے لئے ہے (۱۔ تمتمتھیس ۴: ۷-۸) اور موخر خیال کے متعلق انجیل یہ فرماتی ہے۔ کیونکہ زہم دُنیا میں کچھ لائے اور نہ کچھ اُس میں سے لے جاسکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے پینے کو ہے تو اسی برقعاعت کریں۔ لیکن جو دولت مند ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی آزمائش اور پھندے اور بہت سی بہبود اور نقصان پہنچانے والی خواہشوں میں پھنستے ہیں۔

جو آدمیوں کو تباہی اور ہلاکت کے دریا میں غرق کر دیتی ہیں۔ (۱۔ تمتمتھیس ۶: ۷-۹) زبور ۴۹: ۱۶-۱۷ اور اعظ ۵: ۱۵-۱۶ (صفنیاہ ۱: ۱۸) تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اُس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی (متی ۶: ۲۳) پس امور معاشرت کوئی نیکی نہیں ہیں اور نہ اکو تباہ دینا ہی نیکی ہے۔ کیونکہ کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائے گا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں (۱۔ کرنتھیوں ۸: ۸) پس نجات نہ تو ترک دُنیا اور تزکیہ نفس پر منحصر ہے اور نہ ہی دُنیا میں اُلجھے رہنے پر خُدا نے نہ تو دُنیا تیا گنے کے لئے بنائی ہے اور نہ اس لئے کہ انسان زخارف دُنیا کا غلام ہو جائے اور غاقت کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لے۔ ان انسانی بنا دلوں اور واہی خیالات کو نجات سے کوئی سروکار نہیں اور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نجات کے متعلق جو طریقے اب تک ہم نے پیش کئے وہ سب لوگوں کی اپنی گھڑت ہیں۔ اسی واسطے لوگوں نے مرض گناہ سے رہائی نہیں پائی اور اُن کا قلبی اضطراب اور روحانی بے چینی دور نہیں ہوئی۔

## اعمالِ حسنہ

واضح ہو کہ نیک اعمال انسان کے لئے ضروری ہیں۔ خُدا اُس سے ان کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔ تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں (متی ۵: ۱۶) کیونکہ ہم اُس کی کارگیری ہیں۔ اور مسیح یسوع میں اُن نیک اعمال کے واسطے مخلوق ہوئے جن کو خُدا نے پہلے سے ہمارے کرنے کے لئے تیار کیا تھا (افیسوس ۲: ۱۰) اور شرع الہی کے مطابق چلنے ہی کا دوسرا نام اعمالِ حسنہ ہے۔ کتب مقدسہ کیا ہیں؟ شرع الہی! شرع الہی کیا ہے؟ خُدا کے احکام و فرامین اور ادم و نواہی کا مجموعہ! یہ شرع الہی کیا ہے؟ خُدا کے احکام و فرامین اور ادم و نواہی کا مجموعہ! یہ شرع الہی کس کے لئے ہے؟ انسان کے لئے! کیا انسان اس پر پورا عمل کرتا یا کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اس جگہ دیا جائے گا۔ اگر اعمالِ حسنہ و حصولِ نجات کی شرط قرار دیا جائے تو اس صورت میں انسان سے شریعت کی کامل فرماں برداری مطلوب ہے۔ ایسی کامل اور بے نقص نیکی جس میں گناہ کا قطعی امکان نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا کرنے پر قادر ہو تو اُس کو توبہ و استغفار کی ذرا بھی حاجت نہیں وہ بلا روک ٹوک سیدھا جنت میں جاسکتا ہے۔ اور ایسے کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ تندرستوں کو حکیم درکار نہیں۔ اور وہ خُدا کی بخشش کا بھی محتاج نہیں۔ بلکہ نجات کو اُس نے اپنی ذاتی قوت سے خود کما کر اپنا حق بنا لیا ہے۔ جس سے کوئی اُسے محروم نہیں رکھ سکتا۔ کام کرنے والے کی مزدوری بخشش نہیں بلکہ حق سمجھی جاتی ہے (رومیوں ۴: ۴) اس سے ایک بات یہ حاصل ہوتی ہے کہ خُدا کی بخشش کوئی شے نہیں اور نہ انسان اُس کی رحمانیت کی ضرورت رکھتا ہے کیونکہ جب نجات اعمال سے کمائی جاسکتی ہے تو خُدا کے رحم و فضل سے فائدہ اٹھانے کی احتیاج ہی نہیں رہتی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کی واقعی ایسی مبارک حالت ہے کہ وہ جزی و کلی طور پر من و عن شریعت پر عمل کر سکتا ہے؟ مشاہدہ اور تجربہ نوعی کی بنا پر کوئی اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کے قابل نہیں ہے۔ مسئلہ گناہ کے بیان میں ہم نے بدیہی دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ کوئی فرد بشر گناہ کی قید سے آزاد نہیں ہے۔ مرض گناہ ہمہ گیر

ہے اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ انسان اپنی تجاویز و عوامل کے ذریعے اُس کی قیود سے ہرگز آزاد نہیں ہو سکتا۔ جیسے جسمانی صحت جسم کی اصل حالت ہے نہ کہ بیماری اور بیماری کی مدافعت کی تدابیر سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مریض کو اصل حالت پر لایا جائے۔ اسی طرح روح کی اصل پاکیزگی اور گناہ ایک غیر فطری شے اور رُوحوانی مرض ہے۔ اس سے رہائی پانا بھی ضروری ہو راصلی فطرت کا داعی تقاضا ہے۔ اور گناہ کی طبیعت سے آزادی اور نیک و پاک طبیعت کا حصول ہی نجات ہے۔ مسیحیت کے علاوہ قریب قریب تمام مذاہب و فلسفے اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن انجیلی فلسفہ نجات اُن کے بالکل برعکس ہے۔

۱۔ غیر مذاہب کا عقیدہ ہے کہ نیک اعمال کرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ مسیحی مذاہب کا عقیدہ ہے کہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔

نجات کے معنی ہی گناہ کی قیود سے آزاد ہونا ہے۔ اس لئے جب تک گناہ کی طبیعت سے کامل رہائی نہ ہے نیک اعمال کرنا محال ٹھہرے گا۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب حضرت ابوالبشر سے باوجود ایک ہی گناہ سرزد ہونے کے یہ نہ ہو سکا کہ حقیقی نیکی (اعمالِ حسنہ) کر کے دوبارہ جنت العدن (خُدا کی قُربت) کو حاصل کر لیتا تو اب مدتوں تک طبائعِ انسانی کے ساتھ عناصرِ گناہ کے باہم تاثر و تاثیر اور انجذاب و تجذیب کرتے رہنے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ انسان ضعیف البیان اور پتلہ سہو و نسیان حقیقی نیکی کر سکے۔ جب چند اوز کے بخار کے بعد مریض دو من بوجھ اٹھانے کی استعداد نہیں رکھتا۔ تو بھلا برسوں مرضِ موذی کے تھیڑے کھانے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ وہ دو من بوجھ اٹھاسکے۔ جب مصدر اور مخرج (طبعِ انسانی) ہی ناپاک ہے تو اُس سے نیکی و پاکی کا صدور چہ معنی وارد؟ کیا کھاری چشمے سے آبِ شریں برآمد ہو سکتا ہے؟ (یعقوب ۳: ۱۲) گناہ آلود طبیعت سے بے نقص نیکی کا صدور ایسا ہی محال ہے جیسے جو ب اور د سمبر کے مہینوں کو ملا کر ایک معتدل موسم پیدا کرنا محال ہے۔ پس اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دینا باطل ٹھہرا۔ اور خُدا کی یہ آواز ہے کہ شریعت کے اعمال سے کوئی بشر استنبا نہ ٹھہرے گا۔ (گلتیوں ۲: ۱۶) اور گناہ سے نجات حاصل کئے بغیر شریعت پر عمل کرنا ہی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شریعت تو رُوحوانی ہے مگر میں جسمانی اور گناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوں (رومیوں ۷: ۱۴) اور اگر فرامینِ الہی پر عمل کرن کے لئے کمر ہمت کس بھی لیتا ہے اور چند نیک کام کر کے اپنے دل میں خوش ہوتا ہے۔ تو آوازِ الہی یہ کہہ کر اُس کی کمر ہمت کو توڑ دیتی ہے۔ کہ ابھی ایک بات کی تجھ میں کمی ہے (مرقس ۱۰: ۲۱) کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستنبا انسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطانہ کرے (واعظ ۷: ۲۰)۔

خُداے قدوس و برحق جو نیکی و پاکیزگی کا سرچشمہ ہے ہم سے ایسی بے نقص لے داغ اور کامل نیکی طلب کرتا ہے جس میں ایک بات کی بھی کمی نہ وہ۔ اور اس قسم کی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی و نیکی کا نمونہ خُداوند مسیح کی بیدارِ رفتار و گفتار اور بے عیب زندگی میں ملتا ہے۔ ایسی نیکی بلاشبہ نجات کا استحقاق دلا سکتی ہے۔ مگر کون ایسی نیکی کا سرمایہ دار ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ مانا کہ بعض خُدا پرست اور پرہیزگار لوگ عملی و فعلی گناہوں سے کسی حد تک بچے رہ سکتے ہیں۔ لیکن ارادی اور خیالی گناہوں سے کسی کو تنزہ تام حاصل نہیں ہے۔ چوری، خون، ریزی، حق تلفی، بد گوئی، اور بددیانتی وغیرہ بد افعال تو گناہ کا عملی ظہور ہیں۔ گناہ انسان کی طبیعت کو عارض ہے۔ اگر یہ افعال ظہور میں نہ بھی آئیں تو بھی انسان کی طبیعت ک سفلیت و کراہیت کا انکار محال ہے۔ گناہ کا منبع انسان کے اعماقِ قلب میں ہے۔ اور خُدا باطن کی صفائی چاہتا ہے نہ کہ ظاہر کی۔ دیکھ تو باطن کی سچائی پسند کرتا ہے (زبور ۵۱: ۶) اس لئے خُدا ہماری باطنی ناپاکی۔ بداندیشی اور بدخیالی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ جب تک انسان اور خُدا میں طبعی مطابقت و موافقت نہ ہو جائے انسان خُدا کو پسند نہیں آسکتا۔ انسان کا ارادہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو۔ پھر کبھی اُس سے طبعی ناپاکی کا ازالہ محال ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا

ہوں (رومیوں: ۷: ۱۸ - ۱۹) یہ ہے انسان کی باطنی مکروہ حالت کی اقرب الی الفطرت تصویر۔ اکثر لوگ اوامر پر عمل کرتے اور نواہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ دشمنوں سے محبت کرو۔ یہ امر ہے لوگ اپنے بدخواہوں سے ظاہری محبت کا اظہار کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ پھر خدا کہتا ہے کہ نیکی کر کے جتاؤ۔ یہ نہیں ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ بعض اوامر کی تعمیل کرتے اور نواہی کو تال دیتے۔ اور بعض نواہی کو مان لیتے اور اوامر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور کلام کا فرمان ہے کہ جو کوئی بھلائی کرنی جانتا ہے اور نہیں کرتا اُس کے لئے یہ گناہ ہے (یعقوب ۴: ۱۷) ایسی جامع اور مائل نیکی انسان سے ہر گز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس نے ساری شریعت پر عمل کیا اور ایک ہی بات میں خطا کی وہ ساری باتوں میں قصور وار ٹھہرا۔ اس لئے کہ جس نے یہ کہہ کر زنا نہ کر۔ اسی نے یہ بھی کہا کہ خون نہ کر۔ پس اگر تو نے زنا تو نہ کیا مگر خون کیا تو بھی تو شریعت کا عدول کرنے والا ٹھہرا (یعقوب ۲: ۱۰ - ۱۱) یہ درست ہے کہ نیک عمل کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ نجات نیک اعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ اعمالِ حسنہ کو حصولِ نجات کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں ان کے متعلق انجیل مقدس کا یہ فرمان ہے کہ جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لغت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں۔ وہ لعنتی ہے (گلیتوں ۳: ۱۷) شریعت سے گنہگار کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی مددگار نہیں بلکہ مجرم ٹھہرانے والی ہے۔ ایک خونین جب خون کر چکا تو تعزیرات ہند سے اُس کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ وہ اُسے مجرم ٹھہرا کر موت کا فتوے اُس پر لگاتی ہے۔ کیونکہ شریعت تو غضب پیدا کرت ہے اور جہاں شریعت نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں (رومیوں ۴: ۱۵) شریعت شاقول ہے۔ جس طرح شاقول دیوار کا ٹیڑھا پن دکھا سکتا ہے اور اُس کو سیدھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شریعت انسان کی کج روی کو ظاہر کر سکتی ہے اور اُس کی درستی و اصلاح ہر گز نہیں کر سکتی۔ شریعت آئینہ ہے جس طرح آئینہ چہرے کے بدنماداغ دکھا دیتا ہے پر ان داغوں کو دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شریعت کے وسیلے لوگناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے (رومیوں ۳: ۲۰؛ یعقوب ۱: ۲۳ - ۲۴) شریعت ترازو ہے۔ ترازو کسی وزن کی کمی بیشی کو ظاہر کر دیتا ہے لیکن خود اُسے پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہی شریعت کا فرمان گنہگار انسان کے ک حق میں یہ ہے کہ نو ترازو میں تو لا گیا اور کم نکلا (دانی ایل ۵: ۲۷) شریعت چراغ ہے۔ کیونکہ فرمانِ چراغ ہے اور تعلیم نور۔ (امثال ۶: ۲۳؛ زبور ۱۱۹: ۱۰۵) اگر چراغ کورات کے وقت کسی گندے اور غلیظ مکان میں لایا جائے تو وہ اُس کی گندگی اور غلاظت وغیرہ کو ظاہر کر دیتا ہے اُسے دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شریعت چراغ کی مانند انسان کی باطنی گناہ آلودہ مکروہ حالت سے اُسے آزاد نہیں کر سکتی۔ جس طرح تھرمامیٹر صرف یہ دکھا دیتا ہے کہ بخار کتنے درجہ کا ہے اور بخار کتنے درجہ کا ہے اور بخار کو دور نہیں کرتا۔ اسی طرح شریعت انسان پر یہ روشن کر دیتی ہے کہ وہ گناہ کا مریض ہے، لیکن مرض گناہ سے آزاد نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ گنہگار کو گناہ کا قائل کر کے اور نجات (گناہ سے رہائی) کی ضرورت محسوس کروا کے کسی طیب روحانی کا متلاشی بنا دیتی ہے اور شریعت کے بغیر گناہ مردہ ہے (رومیوں ۵: ۱۳) چنانچہ شریعت اگر دُنیا جو مجرم نہیں ٹھہراتی تو اور کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ حماقت نہیں کہ جس شرع (قوانین الہی) کا عدول کیا اسی کا پھر سہار ڈھونڈا جائے؟ جب ایک شخص نے چوری کر لی تو تعزیرات کی عدولی۔ اب اگر وہ تعزیرات کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر خوشی کے نعرے لگاتا پھرے تو کون ہے جو اُس کو سٹری اور دیوانہ سمجھے گا؟ جس کتاب پر وہ فخر کرتا ہے وہی اُس کو مجرم ٹھہرا کر تین سال کی سزا دلواتی ہے۔ پس کوئی دھوکے میں نہ رہے۔ کتب مقدسہ یا شریعت کسی کی حمایت و رعایت نہ کرے گی اور وہ کمزور ہونے کے باعث گنہگار کی مدد کرنے میں قاصر ہے۔ اس لئے کہ جو کام شریعت جسم کے سبب کمزور ہو کر نہ کر سکی وہ خدا نے کیا (رومیوں ۸: ۳) کیونکہ اگر کوئی ایسی شریعت دی جاتی جو زندگی بخش سکتی تو البتہ راست بازی شریعت کے سبب سے ہوتی۔ مگر کتاب مقدس نے سب کو گناہ کا ماتحت کر دیا۔ (گلیتوں ۳: ۲۱ - ۲۲) پس شریعت

زندگی نہیں بخش سکتی بلکہ سب کو ایک ساتھ مجرم ٹھہرا کر غضبِ الہی کا ماتحت کرتی ہے اور کہتی ہے۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہیں (رومیوں ۳: ۲۳)۔

اب شاہد کوئی کہے کہ پھر تو شریعت بہت بری چیز ہے جو انسان کے ساتھ ایسا شدید ظالمانہ برتاؤ کرتی ہے۔ اور سب کو غضبِ الہی کے ماتحت کر کے سزاوار دوزخ بناتی ہے۔ جنابِ من! شریعت ہر گز بُری نہیں بلکہ شریعت کو عدول کرنے والے بُرے ہیں۔ جس طرح تعزیرات ہند بُری چیز نہیں بلکہ چور، زانی، ذہبی، باغی، خونی اور ظالم بُرے ہیں۔ آئینہ بُرا نہیں زنگی کی شکل بُری ہے۔ بخار کے بریض کی طبیعت بگڑ جانے کے باعث اُس کو پانی اور کھانا کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ پر دراصل پانی پانی اور کھانے میں کوئی نقص نہیں ہوتا بلکہ مریض کی اپنی طبیعت میں فساد کے باعث وہ کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر مریضانِ گناہ کو شریعتِ الہی خلافِ طبع اور بُری معلوم ہو تو کیا تعجب ہے۔ یہ اُن کی اپنی روحانی فطرت کے فساد کا نتیجہ ہے۔ شریعت گنہگار کے لئے اس لئے فائدہ مند نہیں کہ وہ اُس کی اپنی حالت اور طبیعت کے مخالف ہے، مثلاً سورج اچھی چیز ہے پر لو کو اُس سے کچھ فائدہ نہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی چیز ہے مگر اندھے کو اُس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ موسیقی ایک رُپور اور جان نواز شے ہے مگر بہرہ اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ شریعت اچھی ہے۔ بشرطیکہ کوئی اُسے شریعت کے طور پر کام میں لائے۔ یعنی یہ سمجھ کر کہ شریعت راست بازوں کے لئے مقرر نہیں ہوئی۔ بلکہ بے شرع اور سرکش لوگوں اور بے دینوں اور گناہوں اور ناپاکوں اور زندوں اور ماں باپ کے قاتلوں اور خونیوں اور حرام کاروں اور لونڈے بازو اور بردہ فروشوں اور جھوٹوں اور جھوٹی قسم کھانے والوں اور انکے سوا صحیح تعلیم کے اور برخلاف کام کرنے والوں کے واسطے ہے۔ (۱)۔

تمتھیں: ۱: ۸-۱۰) پس شریعت تو گناہ کی کراہیت کو انسان پر روشن کرتی ہے اور گناہ کو مٹا نہیں سکتی۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ رومیوں: ۷: ۷-۲۵) تک ضرور غور سے مطالعہ کریں۔ شریعتِ خدا کی طبیعت اور مرضی کا آئینہ ہے۔ اور اُس کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ تجاوز بھی سزا لازمی ٹھہرتا ہے۔ جس نے شریعت کے تمام احکام کا عدول کیا وہ خدا کا مخالف ٹھہرا اور جس نے صرف ایک حکم سے تجاوز کیا وہ بھی مخالفِ خدا ٹھہرا۔ پس آئے ناظرین اعمالِ حسنہ سے نجات کی اُمید رکھنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔

اہلِ سلام کا خیال ہے کہ نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو (سورۃ ہود آیت ۱۱۵) چونکہ یہ مضمون ہمارے اس مجتہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اس جگہ اس خیال کو بھی پرکھیں۔ اور دیکھیں کہ نیکیوں کو بدیوں کا مبادلہ ٹھہرانا نیکیوں کے ذریعے بدیوں کو مٹانا کہاں تک ممکن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیکی کرنا نہ انسان کا فرض ہے۔ مگر یہ خیال خلافِ عقل ہے کہ نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں۔ کوئلہ جہاں تک انسان نیکی کرتا ہے وہ اپنا واجبی فرض ادا کرتا ہے نہ کہ کچھ زائد الفرض، نیکی کرنا تو انسان کا فرض عین ہے۔ نہ کہ خدا پر احسان، اگر تو صادق ہے تو اُس کو کیا دے دیتا ہے۔ یا اُسے تیرے ہاتھ سے کیا مل جاتا ہے؟ (ایوب ۳۵: ۷) خداوند مسیح نے فرمایا۔ تم بھی جب اُن سب باتوں کی جن کا تمہیں حکم ہوا تعمیل کر چکو۔ تو کہو کہ ہم نکلے نوکر ہیں۔ جو ہم پر کرنا فرض تھا وہی کیا ہے (لوقا ۱۰: ۱۰) گناہ اپنی جگہ رہ کر انسان کو مجرم ٹھہراتا ہے اور نیکی اپنی واجبی جگہ پر رہ کر محض ادائیگی فرض ہے۔

نہ کہ زائد الفرض کام فرض کرو کہ ایک شخص ایک وقت دیا ننداری سے دس روپے کماتا ہے۔ اور دوسرے وقت بدیانتی سے دس روپے چُر لیتا ہے تو عدالت اُس کو اس خیال سے رہانہ کرے گی کہ اُس نے چوری سے پہلے دس روپے محنت کر کے کمائے تھے۔ یا اسی مثال کو الٹ کر لو کہ پہلے وہ دس روپے چُرے اور اُس کے بعد ہی محنت سے دس روپے کمالے۔ تو اُس کا موخر فعل مقدم فعل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اُس کی نیک کمائی سے حاکم پر کچھ احسان نہیں ہوا۔ بلکہ اُس کا ذاتی فائدہ ہوا۔ لیکن اُس کی چوری اُس کی سزا کا موجب ٹھہری۔ دونوں قسم کے نیک و بد (افعال ایک دوسرے کا بدل نہیں

ہو سکتے۔ بلکہ اپنی اپنی جگہ پر رہ کر یا تو مجرم ٹھہراتے ہیں اور یا بے قصور تعزیرات ہند پر عمل کرنا ہندو پاکستانی فرض ہے نہ کہ زائد الفرض کام عامل تعزیرات کا سرکار انعام نہیں دیتی لیکن قانون شکن کو ضرور سزا دیتی ہے۔ اگر یہ درست مان لیا جائے کہ نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں تو وہ چور راست باز سمجھا جانا چاہئے جو چوری کر کے اسی مال مسروقہ میں سے کچھ حصہ غرباء کو خیرات کر دیتا۔ یا مسجد و مندر کی تعمیر پر لگاتا ہے۔ ایک کسبی اگر اپنی ناپاک آمدنی میں سے ایک خاص رقم کسی مسجد کی مرمت پر خرچ کرتی یا محتاجوں کو کھانا کھلا دیتی ہے تو کیا اُس کی ایسی خیرات اُس کی حرام کاری کے گناہ کو دور کر سکتی ہے؟ اور کیا خدا اُس کی پینید اور نفرتی حالت کے باوجود صرف ایسی گناہ آلودہ نیکی کے عوض میں اُسے جنت میں داخل کر لے گا؟ اگر نیکیاں یہی ہیں تو کسی کو دوزخ کے خیال سے حواس بانختہ نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس صورت میں یقیناً حصولِ نجات کے کام سے آسان تر کام دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آئے ناظرین! اگر آپ ایسے بے بنیاد خیالات کے حامی ہیں تو یقیناً آپ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ نجات کے صراطِ المستقیم کو چھوڑ کر ایک ہلاکت خیز راستہ پر گامزن ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنے کے لائق بات ہے کہ نجات سے صرف بہشت کی خوشیاں ہی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ نجات کے معنی ہیں ناپاک طبیعت سے رہائی اور پاک طبیعت کا حصول۔ بہشت کی روحانی و غیر فانی خوشیاں تو نجات کے ساتھ مشروط ہیں۔ یعنی بہشت (قربتِ الہی) میں داخل ہونے سے پیشتر پاک طبیعت (نجات) کو حاصل کر لینا ضروری ہے تاکہ انسان اور خدا کی طبائع میں مطابقت قائم ہو جائے۔ ہمارے اس دعوے کے کہ نجات اعمالِ حسنہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ معنی ہوئے کہ نیک اعمال کرنے سے پاک طبیعت (نجات) حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر پاک طبیعت حاصل ہو جائے تو نیک اعمال خود بخود لازمی نتیجہ کے اُس سے صادر ہوں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھیے کہ صرف گناہ کے نتائج (سزائے دوزخ) سے بچنا ہی نجات نہیں۔ بلکہ خود گناہ کے قبضہ سے ناپاک طبیعت سے آزاد ہونا نجات ہے۔ اب شاید کوئی یہ کہے کہ نجات تو اعمالِ حسنہ کے ساتھ مشروط ہے۔ اور اگر کچھ بدیاں بھی ہوتی رہیں تو خدا رحیم و آمرزگار ہے وہ اُن کو بخندے گا۔ اور نیکیوں کو نجات کے حساب میں محسوب کر لے گا۔ تو واضح ہو کہ کوئی فخرِ اعمال کے ساتھ خدا کے رحم و بخشش کا امیدوار ہو تو وہ رحم کا حقدار نہیں۔ رحم کا حقدار وہ ہو سکتا ہے جو واقعی قابلِ رحم ہو۔ اور جو اپنی لاچارگی و بے کسی کا اظہار خدا کے سامنے یوں کر کے کہ آئے خداوند کریم۔ تو جو رحم و فضل کا سرچشمہ ہے مجھے اپنے فضل ہی سے نجات دے۔ کیونکہ میرے اپنے اعمال اس قابل نہیں کہ میں اُن کے ذریعے نجات کا حقدار ہو سکوں۔ اگر نجات کو نیک اعمال کے ساتھ مشروط ٹھہرایا جائے تو اس کا محال ہونا ہم اچھی طرح ثابت کر چکے اور اگر فضل سے مانو تو اعمالِ حسنہ کو شرطِ نجات ٹھہرانا محال ہو گا کیونکہ اگر فضل سے برگزیدہ ہیں تو اعمال سے نہیں۔ ورنہ فضلِ فضل نہ رہا (رومیوں ۱۱: ۶) اگر کوئی اس تمام بیان سے یہ نتیجہ نکالے کہ ہم نے اعمالِ حسنہ کو برقرار دے کر اُن سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی ہے۔ تو وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ اور اُس نے ہمارے منشاء کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ واضح ہو کہ نیک اعمال کرنا ہر انسان کا فرضِ عین ہے۔ حق انسانیت ہے اور اگر کوئی نیکی سے نفرت کرے تو وہ ضرور گناہ کو پیار کرتا ہے اور ایسا شخص خدا کا مخالف ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ نجات اعمالِ حسنہ کا پھل نہیں ہے۔ بلکہ اعمالِ حسنہ نجات کا پھل ہیں۔ اس لئے جب تک نجات (گناہ سے رہائی) حاصل نہ ہو حقیقی نیکی انسان سے نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ آلودہ طبیعت سے رہائی (نجات) حاصل کرنا انسانی کوشش سے محال ہے۔ اعمالِ حسنہ سے نجات کے امکان کا سامعہ فریبِ جملہ ہماری تسلی نہیں کروا سکتا۔ اس لئے اس غلط خیال کو پہلی فرصت میں اپنے ذہن و دل سے خارج کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

## توبہ محض

مذہبیات میں توبہ کا درجہ تمام باتوں سے افضل ہے اور طالبِ نجات کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے خُدا کی طرف مائل ہو۔ جب گنہگار انسان شریعت کی روشنی میں اپنی باطنی مکروہ حالت کو دیکھتا ہے تو اُس کو اپنی اُس حالت سے نفرت ہو جاتی اور وہ اپنے گناہوں سے دل شکستہ ہو کر پچھتا تا اور آئندہ اُس حالت میں رہنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اُس سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔

ایوب نبی فرمایا ہے اس لئے مجھے آپ سے نفرت ہے۔ اور میں خاک اور راکھ میں توبہ کرتا ہوں (ایوب ۴۲: ۶) اور خُدا توبہ سے بہت خوش ہوتا اور تائبِ دلوں کو پسند کرتا ہے ملاحظہ ہو (یسعیاہ ۵۵: ۷ حزقی ایل ۱۸: ۲۱-۲۳ یوایل ۲: ۱۲-۱۳ املاکی ۳: ۷ لو قافا ۱۵: ۷ اعمال ۳: ۱۹-۲۰) کرنھیوں ۷: ۱۰-۲۰ پطرس ۳: ۹) توبہ ایک ایسی چیز ہے جو خُدا کے رحم و فضل کو جوش میں لاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گناہ پر اس لئے کمر بستہ ہو جائے کہ وہ دم نزع توبہ کر کے نجات کا حقدار ہو جائے گا تو جان لیجئے کہ وہ ایک سنگین غلطی میں مبتلا ہے۔ توبہ کے معنی میں سابقہ بد کرداریوں پر پچھتا تا اور آئندہ اُن سے باز رہنے کا تہیہ کرنا۔ توبہ محض حصولِ نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ قوانینِ طبعیہ کا مقنن خُدا تعالیٰ ہے۔ اس لئے وہ خُدا کی ذاتی طبیعت کے مخالف نہیں بلکہ مطابق ہیں۔ اور اُن سے خُدا کی صفتِ عدل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر قوانینِ طبعیہ کو خُدا کی طبیعت کے نقیض مانا جائے تو خُدا اُن کا مقنن ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قانون کشش زمین سے اس صورت میں تجاوز کرے کہ کسی بلندی سے اپنے آپ کو گرا دے تو اُس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اب اگر وہ اپنے اس فعل ناکردنی پر متائف ہو کر پچھتائے اور آئندہ ایسے فعل سے باز رہنے کا تہیہ کرے اور احتیاط کو کام میں لائے تو اُس کی اس توبہ اور پچھتاوے سے اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ توجال نہ ہو جائے گی بلکہ تادم مرگ وہ لنگڑا ہے گا۔ ہاں اگر آئندہ محتاط رہے تو مزید نقصان سے بچا رہے گا۔ اسی طرح توبہ محض سے گذشتہ گناہوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ہزار روپے کا قرضدار ہے اور بیاعت نداداری ادا کرنے کے ناقابل ہے۔ اب وہ پچھتا تا ہے کہ کیوں قرض لیا۔ لیکن اس پچھتاوے سے اتنا تو ہو سکتا ہے کہ وہ آئندہ کو قرض سے احراز کرے۔ تاہم توبہ سے ہزار روپیہ کو قرض دور نہیں ہو سکتا۔ وہ ادا کرے اور آئندہ قرض سے پرہیز کرے۔ پس انسان کے توبہ سے پہلے کے گناہوں کو خُدا عدل میں لائے گا۔ کیونکہ خُداوند قہر کرنے میں دھیم اور قدرت میں بڑھ کر ہے۔ اور مجرم کو ہرگز بری نہ کرے گا۔ (ناحوم ۱: ۳۳ خروج ۳۴: ۷) اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی تائب کی بعد کی زندگی ایسی بے نقص بے داغ اور کامل ہو کہ جس میں خطا کا مطلق امکان نہ رہے۔ سابقہ قرض انسان ادا نہیں کر سکتا اور توبہ کے بعد کامل نیکی اُس سے صادر نہیں ہو سکتی تو کس صورت خُدا کے قدوس و تبارک و تعالیٰ سے ملاپ ممکن ہے؟ لہذا توبہ محض سے جُدائی کی وہ سنگین دیوار جو گناہ کے باعث انسان اور خُدا کے درمیان حائل ہے ٹوٹ نہیں سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ توبہ کرنا بُرا کام ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ نجات کو مشروط بالتوبہ محض ماننا غلطی ہے۔ ہم آغاز ہی میں عرض کر چکے کہ مذہب میں توبہ سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جس طرح نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے اسی طرح توبہ کرنا بھی ہر گنہگار۔۔۔ کے لئے ضروری ہے۔ توبہ کے ذریعے ہم نجات کو اپنا حق نہیں بنا سکتے بلکہ خُدا اپنے رحم و فضل سے ہمیں اُس کے حقدار بنا سکتا ہے۔ اور تائب انسان خُدا کی بخشش کا اُمیدوار تو ہو سکتا ہے مگر حقدار نہیں ہو سکتا۔ پس توبہ کرو اور رجوع لاؤ۔ تاکہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں اور اس طرح خُداوند کے حضور سے تازگی کے دن آئیں (اعمال ۳: ۱۹) توبہ نجات کی تمہید ہے۔ توبہ ابتدا اور نجات اُس کی انتہا ہے بشرطیکہ توبہ حقیقی ہو۔

## عدل ورحیم

خُدا عادل ہے رحیم و مہربان بھی اُس کی جتنی بھی صفات ہیں وہ سب ذاتی اور قدیم ہیں اکتسابی اور حادث نہیں۔ وہ کبھی اپنی ایک صفت کو چھوڑ کر دوسری صفت کا اظہار نہیں کرتا۔ جب وہ کسی پر رحم فرماتا ہے تو عدل کو چھوڑ کر رحم نہیں فرماتا۔ بلکہ اُس کا رحم و عدل دوش بدوش چلتے ہیں۔ لیکن جو فخر کرتا ہے اُس پر فخر کرے کہ وہ سمجھتا اور مجھے جانتا ہے۔ کہ میں ہی خُداوند ہوں جو دُنیا میں شفقت و عدل اور راست بازی کو عمل میں لاتا ہوں۔ کیونکہ میری خوشنودی اپنی ہی باتوں میں ہے۔ خُداوند فرماتا ہے (یرمیاہ ۹: ۲۴) آپ اپنی تمام فصاحت و بلاغت کو تمام فلسفہ و منطق کو صرف کر دینے کے باوجود بھی خُدا کی صفات کو ہرگز تبدیل نہیں کر سکتے۔ خُدا عادل ہے اور اُس کی صفت عدل ہرگز رحم میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ خُدا رحیم ہے اور اُس کی صفت رحمانیت ہرگز عدل میں تبدیل نہیں کی جاسکتی۔ جس طرح خُدا کا سمیع و بصیر ہونا واحد مفہوم نہیں رکھا اسی طرح عدل و رحم کا مفہوم واحد نہیں اور اسی طرح خُدا کا عادل ہونا اور بات ہے رحیم ہونا اور بات اور دونوں صفات کا تقاضا پورا ہونا ضروری ہے۔ خُدا کی یہ دونوں صفات اپنا اپنا عمل بر محل دکھاتی ہیں۔ اگر گناہ و سزا لازم و ملزوم ہیں تو کوئی شخص بھی سزائے دوزخ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر لازم ملزوم نہیں تو سزا اور عدالت الہی کا انکار لازم آئے گا۔ اور گناہ کوئی مکروہ اور قابلِ نفرت شے نہ رہیگا اس صورت میں ایک تو عدل الہی پر دھبہ پڑتا ہے اور دوسرے راستبازوں و خُدا ترسوں کو رُخِ خُدا میں ریاضت کرنا اور دُکھ اٹھانا فضول اور لاحاصل ٹھہرتا ہے۔ اور کوئی گنہگار گناہ سے ہرگز نفرت نہیں کر سکتا۔ پس گناہ و سزا ضرور لازم و ملزوم ہیں۔ اسی واسطے سب دُنیا عدل الہی کے ماتحت سزائے دوزخ کی مستحق ہے۔ اگر خُدا عادل گنہگار کو بلا معاوضہ مُعاف کرے تو وہ عادل نہ بلکہ راحم محض۔ اگر عدل کرے تو تمام دُنیا سزائے دوزخ کی مستحق ہے۔ ایک بھی بچ نہیں سکتا۔ اور خُدا عادل محض ٹھہرے بے شک رحم کا درجہ عدل سے افضل ہے (یعقوب ۲: ۱۳) تاہم حقیقی راحم کے لئے عادل ہونا شرط ہے۔ یعنی رحم بلا عدل نہ صرف راستی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ مثلاً زید نے تلوار سے بکر کا بازو کاٹ دیا اور بکر نے عدالت میں زید پر نالہ کر دی۔ اب اگر حاکم از روئے رحم زید کو بلا مبادلہ رہا کر دے تو بکر پر ظلم ہوگا۔ یعنی زید پر رحم بلا مبادلہ کرنا بکر پر ظلم کرنا ٹھہرے گا۔ اور اگر زید کو سزائے تو یہ محض عدل ہوگا۔ کیونکہ مجرم کو سزا دینا کوئی رحم نہیں۔ عدل کے معنی ہیں طرفین کے حالات کو اعتدال پر لانا۔ یعنی ظالم و مظلوم کی حیثیات کو مساوی (معتدل) رکھنا اسی طرح انصاف (مادہ نصف) کے معنی ہیں نصفاً نصفی کر دینا۔ تاکہ ظالم و مظلوم کی حیثیات مساوی رہیں۔ پس اگر خُدا انسان کے کل گناہ کا بدلہ لے تو یہ عدل ہی ہوگا۔ اور اگر بلا مبادلہ سب کو بری کر دے تو یہ رحم بلا عدل ہوگا۔ اگر کچھ گناہوں کا بدلہ لے اور کچھ مُعاف کر دے تو یہ عدل نہ ہوگا نہ رحم۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ تقاضائے عدل بھی پورا ہو اور گنہگار پر رحم بھی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذاتِ راحم اپنی طرف سے کچھ ایثار کرے۔ کیونکہ رحیم ہونے کے لئے ایثار شرط ہے۔ یعنی اگر حاکم مجرم پر رحم کرنا چاہئے تو ضرور ہے کہ اُس کا فدیہ (معاوضہ) اپنی طرف سے دے اور یہی اُس کا ایثار ہوگا۔ خُدا عادل و رحیم کے اس ایثار کا پورا ایمان آگے چل کر نجات بالکفارہ کے زیر عنوان کیا جائے گا۔ جس سے خُدا کی عدالت و رحمانیت کا بھید ناظرین پر کھل جائے گا۔ اصل مقصد کو سمجھنے کے لئے خیالات کے سلسلے و ترتیب کو یاد رکھیے۔

## قسری ملاپ

اب شاہد کوئی یہ سوچے کہ کیوں نہ خُدا نے پاک جبری وہ قسری طور پر اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کو پاک بنالے اور اپنی قربت سے اُسے قسری طور پر بہرہ اندوز فرمائے۔ واضح ہو کہ اس خیال میں یہ بھی بھاری نقص ہے کہ انسان کی فعل مختاری قائم نہیں رہتی۔ خُدا نے اُسے فاعل مختار بنایا۔ نیکی

و بدی کی تمیز بخشی تاکہ اپنی آزاد مرضی سے دونوں میں سے جس کو چاہے پسند کرے۔ اور اوامر و نواہی بخش دئے۔ جن کے عدول کی سزا اور تعزیر کی جزا ٹھہرائی۔ اگر انسان کی فعل مختاری اور آزادی میں نچل دیا جائے تو نیکی نیکی نہ رہے گی اور نہ بدی بدی۔ اور جب نیکی بدی نہ رہی تو عدالت نہ رہی۔ جب عدالت نہ رہی تو سزا و جزا نہ رہی اور دوزخ و بہشت دو ایسے مفہوم ہوں گے جن کا کوئی مصداق نہ ہو۔ اور خدا کے احکام دربارہ ترک گناہ اور اختیار نیکی باطل ٹھہریں گے۔ اور نجات بے معنی لفظ ہوگا۔ حتیٰ کہ خدا کی خدائی سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے اور پھر اگر خدا نے انسان کو بالجبر ہی پاک و راست بنا نا ہوتا آدم و حوا کو اوائل ہی میں بنالیتا۔ اور اس موجودہ دل لگی کی بہ نسبت یہ بہتر ہوتا کہ تمام دنیا میں یہ مرض نہ پھیلتا۔ فعل مختاری ہی تو ہے جو انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف ٹھہراتی ہے۔ ورنہ حیوان و انسان میں کی مابہ الامتیاز ہوتا اور اس قسم کے انسان کو خدا کی قربت سے کیا فائدہ ہوتا۔ اگر خوشی ہوتی تو جس قدر ایک نبیل کو شاہی مخلوق میں رہنے سے ہو سکتی ہے۔ لہذا یہ خیال سراسر غیر معقول ثابت ہوتا ہے اور اس سے کنارہ کرنا لازمی ہے۔

## طبعی ملاپ

بالفرض محال اگر ہم یہ مان لیں کہ خدائے قدوس انسان خامی و عاصی کو اُس کی گناہ آلودہ طبیعت کے ساتھ ہی اپنی قربت و رفاقت میں قبول فرمائے گا تو بھی یہ عقدہ حل نہ ہوگا۔ کیونکہ متضاد طبائع (پاک و ناپاک) کے ملاپ کا انجام خوشی کی بجائے نفرت ہوگا۔ جس طرح اُلو کی طبیعت کی آفتاب کی تجلی کے ساتھ موافقت و مناسبت نہ ہونے کے باعث اُلو کو سورج کی قربت سے خوشی کی بجائے ڈکھ اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کو ناپاک طبیعت کو خدائے قدوس کے تقریب سے بجائے مسرت و شادمانی کے انتہائی ڈکھ محسوس ہوگا۔ اور ایسے ملاپ کی بہ نسبت زخارفِ دنیا اور جیفہ جہان ہی اطمینان بخش اور مسرت افروز معلوم ہوں گے۔ اور خدا کی قربت ایک اطمینان سوز اور دلاؤز حالت جس میں وہ ایک لمحہ بھر رہنے کی برداشت نہ کر سکے گا۔ جب تک خدا اور انسان کی طبائع میں باہد گر موافقت و مطابقت تام نہ ہو جائے ملاپ قطعی ناممکن ہے۔ جب تک مغنی اور ساز کی آواز میں ہم آہنگی نہ ہو مغنی کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ ایک ڈاکو حاکم کے سایہ سے بھاگتا ہے کیونکہ ڈاکو کی طبیعت اور حاکم کی طبیعت میں اختلاف ہے۔ محبوب اپنے محب اور عاشق اپنے معشوق میں ہمیشہ وہی طبیعت اور خصلت دیکھنا چاہتا ہے جو وہ اپنی ذات میں خود رکھتا ہے۔ رحمدل سنگدل و ظالم سے نفرت کرتا ہے۔ خلیق بد خلق کو پسند نہیں کرتا۔ مُنصف مزاج لئے انصاف سے راضی نہیں ہوتا۔ پرہیزگار عیاش کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ اسی طرح انسان اور خدا کی طبعی ناموافقت کو بے سیاحہ نبی یوں بیان کرتا ہے۔ "تمہاری بد کرداری نے تمہارے اور تمہارے خدا کے درمیان جدائی کر دی ہے۔ اور تمہارے گناہوں نے اُسے تم سے رُوپوش کیا (بے سیاحہ ۵۹ : ۱۲) اب طبعی ملاپ کی دو صورتوں میں سے ایک صورت ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

۱۔ خدا کی طبیعت گناہ آلودہ ہو جائے تاکہ انسان کی طبیعت کے ساتھ اُس کی موافقت ہو سکے۔

۲۔ یا انسان کی طبیعت خدا کی سی پاک ہو جائے تاکہ اُس کی طبیعت کے ساتھ مطابقت ہو سکے۔

توبہ توبہ! خدائے قدوس و برتر تو کبھی ناپاک نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس کی صفت قدوسیت اور الوہیت کے سراسر منافی ہے۔ یہ ہرگز ہو نہیں سکتا کہ خدا کی شرارت کا کام کرے۔ اور قادرِ مطلق بدی کرے (ایوب ۳۴ : ۱۰) اور انسان ضعیف البنیان جو گناہ کو کیڑا ہے اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد سے پاک ہو نہیں سکتا۔ انسان ہے کہ کہ وہ پاک ہو؟ اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے کہ صادق ٹھہرے؟ (ایوب ۱۵ : ۱۴) غرضیکہ جیسے خدا کا ناپاک ہونا ممنوع ہے ویسے ہی انسان کا پاک ہونا محال ہے۔ اگر ملاپ ممکن ہے تو صرف طبعی ملاپ۔ آئے ناظرین! آپ نے خراب جان لیا کہ اگر خدا اپنی جگہ رہ کر انسان کی نجات کا کوئی انتظام نہ کرے تو انسان میں یہ صلاحیت مفقود ہے کہ اُس پاکیزگی کو حاصل کر جس کے بغیر کوئی خدا کو نہ دیکھے گا۔ ہر شخص اپنے

باطن میں اپنی ایسی بے بسی اور لاچارگی کا وجدانی احساس ضرور رکھتا ہے۔ یہ انسان کی واقعی ناگفتہ بہ حالت کی اقرب الی الفطرت تصویر ہے۔ اس لئے طفل تسلیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اپنی عیب دار اور گناہ آلودہ زندگی پر رحم کھانا چھوڑ دیجئے۔ اپنے آپ کو برابر ملامت کریں۔ اپنے آپ پر رحم کھانے اور اپنی بُری حالت کو رعایت کرنے سے زیادہ رُوح کی ہلاکت کا اور کوئی موجب نہیں۔ شریعتِ الہی انسان کی اسی مکروہ حالت کو اُس پر روشن کرتی ہے۔ تاکہ اُس کا گناہ ہونا ظاہر ہو۔ اور حکم کے ذریعے سے گناہ حد سے زیادہ مکروہ معلوم ہو (رومیوں ۷: ۱۳) تاکہ وہ ایک طیب رُوحانی کی ضرورت کا قائل ہو کر اُس کا متلاشی بن جائے۔

## نجات باکفارہ

ہم نے دلائل و بُرائین سے یقینی اور قطعی طور سے اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچایا دیا کہ انسان اپنی ذاتی جدوجہد سے وہ پاکیزگی اور تزیہ و تبریہ عن الخطا حاصل نہیں کر سکتا جو اُسے ابدی زندگی غیر فانی خوشی اور خُدا کی مواصلت و مقاربت کا استحقاق دلا سکے (امثال ۲۰: ۹) اور منقولی شہادت سے بھی اس دعویٰ کی صداقت و حقیقت کو خوب ثابت کر دیا۔ ایک دفعہ جب خُداوند مسیح نے انسانی جدوجہد کو حصولِ نجات کے متعلق ناکافی و محال ثابت کیا تو لوگ حیران ہو کر کہنے لگے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خُدا سے ہو سکتا ہے کیونکہ خُدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ (لوقا ۱۸: ۲۷) چنانچہ خُدا نے رجم و العادل نے انسانِ خاٹی و عاصی اور فاسد الخیال کی ذاتی لاچارگی و بے بسی کی حالت پر رحم فرمایا۔ اور اُس کے گناہوں کا مبادلہ اپنی طرف سے پیش کیا۔ کیونکہ وہ کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ سب کی توبہ تک نوبت پہنچے (۲۔ پطرس ۳: ۹) اور یہی ایک آخری اور معقول طریقہ ہے جس سے خُدا عادل بھی اور رجم بھی ثابت ہو۔ اور انسانِ خاص و عاصی کو نجات بھی دے۔ اُسے (مسیح کو) خُدا نے اُس کے خُون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا کہ جو گناہ پیشتر (مسیح سے پہلے) ہو چکے تھے۔ اور جن سے خُدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وہ اپنی راست بازی ظاہر کرے۔ بلکہ اسی وقت اُس کی راستبازی ظاہر ہو۔ تاکہ وہ خود بھی عادل رہے۔ اور جو یسوع پر ایمان لائے اُس کو بھی راست بازی ٹھہرانے والا ہو (رومیوں ۳: ۲۵ - ۳۱) انسان ذنی اُلمت اور فاسد الطبع کی ناداری استعداد در بارہ حصولِ نجات نے خُدا کی محبت کو مجبور کر دیا کہ وہ خود اُس کا فدیہ دے۔ اور اُس کو تمام آلودگیوں سے پاک کرے اپنی قربت میں قبول فرمائے اور ابدی عذاب و ہلاکت سے بچائے۔ چنانچہ خُدا نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا۔ تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے (یوحنا ۱۶: ۱۶) کسی راست بازی کی خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی جان دگے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی کے لی کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جرات کرے۔ لیکن خُدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موات (رومیوں ۵: ۷ - ۸) ایک بچہ جب گندگی سے اپنے لباس اور تن کو آلودہ کو لیتا ہے تو ماں اُس کی اس گندگی سے نفرت کرتی ہے۔ اور اگر بچہ آغوشِ مادر میں جانے کے لئے ہاتھ پستار اور روتا ہے۔ تاہم ماں اُس کی غلاظت کو دھوئے بغیر اُسے گود میں نہیں لیتی۔ لیکن ماں کو بچہ کی ذات سے نفرت نہیں ہوتی پر اُس کی غلاظت سے۔ اور بچے میں خود کو صاف کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ماں خود اُسے دھو کر اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح خُدا انسان کی گناہ آلودہ و مکروہ حالت سے نفرت دگھن کرتا ہے۔ کیونکہ وہ پاک و قدوس ہے۔ اور اُس کی محبت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ انسان ایسی مکروہ حالت میں مبتلا رہ کر ابد تک اُس سے جُدا رہے۔ اور انسان میں خود کو پاک بنا لینے کی قابلیت و صلاحیت مفقود ہے۔ اس لئے خُدا نے رجم اور سرچشمہ الطاف و اکرام نے خود اُس کی ناپاکی کو مسیح کے پاک ترین لہو سے دھویا۔ اور وہ وعدہ جو اُس نے بنی نوع انسان کے ساتھ مسیح کے ظہور سے صدیوں پیشتر کیا تھا مسیح کی قربانی میں پورا کیا۔ وہ وعدہ یہ تھا میں نے تیری خطاوں

کو گھٹا کی مانند اور تیرے گناہوں کو بادل کی مانند مٹا ڈالا میرے پاس واپس آجا۔ کیونکہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے (یسعیاہ ۲۲: ۲۲، ۲۳: ۲۵) خُداوند مسیح نے خُدا کے عدل کو اس صورت میں پورا کیا۔ کہ جو موت گناہ کے باعث انسان نے کمائی تھی وہ اپنے جسم پر لے لی۔ اور یوں اُس کا کامل فدیہ دے کر تقاضا نے عدل الہی کو پورا کیا۔ اور رحم و محبت الہی کو اس صورت میں پورا کیا کہ گنہگار جو ابدی ہلاکت کے حقدار تھے ہمیشہ کی زندگی کے وارث ٹھہرے۔ کہاں ابدی عذاب اور کہاں ابدی زندگی و خوشی۔ مگر اُس ک فضل کے سبب اُس مخلصی کے وسیلے سے جو اُس یسوع میں ہے مفت راستہ باز ٹھہرائے جاتے ہیں (رومیوں ۳: ۲۴) کفارہ کے معنی میں ڈھانپ دینا۔ خُداوند مسیح نے اپنے پاک کفارہ کے ذریعے انسانِ خاکی و عاصی کے گناہوں پر پردہ ڈالا۔ اور اُنہیں خُدا کی نظر سے چھپا دیا۔ کفارہ کی تعریف داود نبی یوں کرتا ہے مبارک ہے وہ جس کی خطا بخش گئی۔ اور جس کا گناہ ڈھانپا گیا (زبور ۳۲: ۱، ۸۵: ۲) آفرینش عالم کے اوائل ہی میں جب آدم اور حوا گناہ میں گرنے کے باعث ننگے پائے گئے کفارہ کی ایک علامت ملتی ہے۔ وہ مجازی کفارہ تھا اور مسیح کے اس حقیقی اور عالمگیر کفارہ کی گویا تمثیل لکھا ہے۔ اور خُداوند خُدا نے آدم اور اُس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر اُنہیں پہنائے (پیدائش ۳: ۲۱) وہ چمڑا کسی جانور کو مار کر لیا گیا تھا۔ اور اُس سے اُن کی عریانی کو جو گناہ کے باعث محسوس ہوئی تھی ڈھانپا گیا۔ اس سے ایک طرف تو اُنہیں دکھایا گیا کہ وہ موت جو تم نے گناہ کر کے کمائی ہے کیا چیز ہے۔ کیونکہ اب تک اُنہیں موت کی کیفیت کا علم نہ تھا اور وہ عبرت ناک کیفیت حیوان کی موت سے اُن پر روشن کی گئی کہ تمہاری موت اس طرح ہوگی۔ اور دوسری طرف چمڑے سے خود اُن کا ننگ ڈھانپ کر یہ ظاہر کیا کہ باوجود تمہاری اپنی خطا اور شقاوتِ قلبی کے میں خُدا (خُدا) تمہاری عریانی کو ڈھانپوں گا۔ مگر دوسرے کی موت کے وسیلے جو تمہارے گناہ کا شریک نہ تھے۔ تمہاری خلاصی فانی چیزوں یعنی سونے چاندی کے ذریعے سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک بے عیب اور بے داغ برے بھی مسیح کے پیش قیمت خون سے (۱۔ پطرس ۱: ۱۸-۱۹) مسیح پر درمیانی ہونے کی حیثیت سے جو سزاوار رہی وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ گویا گنہگاروں نے خود وہ سزا اٹھایا جیسے دو امراض میں میریض دونوں کے درمیان آکر فنا ہو جاتی اور اپنی ہستی کھودیتی ہے اور مرض کو مریض سے جُدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مریضان گناہ اور مرض گناہ کے درمیان میں آکر مسیح نے اپنی ہستی کھودی۔ اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے یکسر جدا کر دیا۔ اگر مسیح ہر دو کے درمیان میں آکر دو کی طرح اپنی ہستی نہ مٹا دیتا تو گناہ گنہگار کے مابین جدائی کا ہونا ناممکن و محال تھا۔ اور جیسے مریض کسی طور پر عرصہ کی شدید مرض سے شفا پالینے کے بعد بہت عرصہ تک کمزور و نحیف رہتا ہے اور اُس کو مقوی و لحم پر و اغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح خُداوند مسیح نے اپنی قربانی کے ذریعے مریضان گناہ کو شفا ملی تو بخش دی۔ اب بعض بعض میں صرف کمزوری باقی رہتی ہے۔ وہ کمزوری (روحانی کمزوری) رفتہ رفتہ روح القدس کے طفیل جو طاقت روحانی کا سرچشمہ ہے دور ہو جائے گی۔ جب روح القدس نازل ہو گا تو تم قوت پاؤ گے۔ (اعمال ۱: ۸) روح بھی ہماری کمزوری میں مدد کرتا ہے (رومیوں ۸: ۲۶) اُس کا پاک کفارہ گنہگاروں کے گناہوں کو ڈھانپ لیتا اور چھپا دیتا ہے۔ اُس کا پاک خون توبہ سے پہلے اور بعد کے تمام گناہوں کو دھو تا ہے۔ اور اُس کے بیٹے یسوع کا خون ہمیں تمام گناہ سے پاک کرتا ہے (۱۔ یوحنا ۱: ۷) اور اُس کی قیمتی و لائٹانی قربانی گنہگاروں کو پاک و صاف کر کے خُدا کے قدوس کی قربت میں لے جاتی ہے۔ مگر تم جو پہلے دور تھے اب مسیح یسوع میں مسیح کے خون کے سبب سے نزدیک ہو گئے ہو۔ کیونکہ وہی ہماری صلح ہے جس نے دونوں کو ایک کر لیا۔ اور جُدائی کی دیوار کو جو بیچ میں تھی ڈھادیا (افسیوں ۲: ۱۳-۱۴) ہم نے مسئلہ گناہ کے آخر میں گناہ کے تین نتائج بیان کئے ہیں۔ یعنی اول، طبعی بگاڑ، دوم، خُدا سے جُدائی۔ اور سوم سزائے عدالت پس خُداوند مسیح کا کفارہ گنہگار کو ان ہر سہ نتائج سے بلکی آزاد کرتا ہے اور بُری خواہش جو گناہ کی علت ہے اُس پر اثر انداز ہو کر اُس کو نیکی و پاکیزگی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاکہ علت کی تبدیلی سے معلول (صدور گناہ) میں تبدیلی ہو جائے۔ اور جب تک انسان کی طبعی خرابی کو معدوم کو کر کے اُس میں حصول کمال کی استعداد پیدا نہ کی جائے وہ حقیقی اور بے نقص نیکی کرنے کے قطعی ناقابل ہے۔ عمل سے پہلے قوتِ عمل کی

ضرورت ہے اور جب طبیعت پاک ہوگئی تو خدا سے خود بخود میل ہو گیا۔ اور جب میل ہو گیا تو جدائی نہ رہی اور نہ سزائے عدالت۔ جیسے ایک جنگلی انگور کے ساتھ ایک اصلی اور شیریں انگور کی شاخ کا پیوند لگانے سے اُس کی ترش خاصیت رفتہ رفتہ شریر ہو جاتی ہے۔ اور انگور کی پُرانی فطرت مٹ کر ایک نئی فطرت اُس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خداوند مسیح کے ساتھ جو خدا انسان کا درمیانی اور پاک ہے ایمانی رنگ میں پیون ہو جانے سے ایماندار لوگ درجہ بدرجہ خدا کی صورت پر بدلتے جاتے ہیں۔ اور اُن کی پُرانی انسانیت (گناہ آلودہ طبیعت) مسیح کی قدرت و قدوسیت کی تاثیر سے زائل ہو کر نئی انسانیت (پاکیزہ طبیعت) پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے ہماری پست حالی کے بدن کی شکل بدل کر اپنے جلال لے بدن کی ضرورت پر بنائے گا (فلیپیوں ۳: ۲۱؛ عبرانیوں ۱۲: ۲)

آپ نے فرمایا "میں انگور کا حقیقی درخت ہوں تم دلیاں ہو۔ جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور میں اُس میں وہی بہت پھل لاتا ہے۔ کیونکہ مجھ سے جدا ہو کر تم کچھ نہیں کر سکتے (یوحنا ۱۵: ۵) اس لی کہ جب تو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کیا اصل جنگلی ہے اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا۔ اور جب جڑ پاک ہے تو ڈالیاں بھی ایسی ہی ہیں (رومیوں ۱۱: ۱۶؛ ۲۴) مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے مراد ہے دُعائیں لگے رہنا۔ کلام کی تلاوت کرتے رہنا اور مراقبہ ہونے سے مراد میں بیٹھ کر ہر روز مسیح کی حضوری کو محسوس کرنا اور اُس کی قربانی اور انتہا محبت کا تصور کرتے رہنا۔ شبانہ روز مسیح کے ساتھ ایسا زندہ ایمانی تعلق رکھنا روحانی اصطلاح میں اُس کے ساتھ پیوند ہونا کہلاتا ہے۔ اور ایماندار کی روحانی تبدیلی کا راز اسی تعلق میں پوشیدہ ہے۔ رُوح القدس ایماندار کے اندر رہ کر اُس کو درجہ بدرجہ خدا کی صورت پر بناتی ہے۔ اور وہ الوہیت نما انسانیت جو انسان نے گناہ کی تاریکی میں کھودی تھی دوبارہ انسان کے اندر پیدا کرتی ہے اس کے بگڑے ہوئے خط و خال۔ بگڑی ہوئی طبیعت اور بگڑی ہوئی صورت کو نئے سرے سے خدا کی صورت پر بناتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان کے اندر گناہ مردہ ہوتا جاتا ہے اور رُوح جو گناہ کے بے باعث مردہ تھی زندہ ہوتی جاتی ہے۔ اگر مسیح تم میں ہے تو بدن تو گناہ کے سبب سے مردہ مگر رُوح راست بازی کے سبب سے زندہ ہے (رومیوں ۸: ۱۰) اور رُوح القدس ایک خارجی موثر ہے اور مسیح کا قائم مقام۔ مسیح نے گنہگاروں کا مبادلہ و معاوضہ عدل الہی کو دے دیا۔ اور وہ پچھلے قرضہ سے تو آزاد ہو گئے۔ لیکن اگر اُن میں آئندہ کے لئے حصول کمال کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو ضرور وہ پُرانی کمزوری کے زیر اثر پھر گناہ کریں گے۔ اس لئے اُن کی طبعی خرابی کو مٹانے اور ایک نئی پاکیزہ طبیعت اُن کے اندر پیدا کرنے کے لئے ضرور ایک زبردست خارجی فاعل درکار ہے۔ اور وہ رُوح القدس ہے۔ چنانچہ رُوح القدس یہ کام کرتی ہے اور ایماندار کے باطن میں درجہ بدرجہ ایک نئی انسانیت کی تعمیر کرتی ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی تمام زندگی ایک ہی دن میں بسر نہیں کر سکتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ عمر کے ابتدائی و وسطی اور انتہائی مدارج کو طے کرنا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کی رُوحانی زندگی بھی بتدریج تمام عمر ترقی کرتی آخری کار رُوحانی کمالیت کو حاصل کرتی ہے۔ اُس خداوند کے وسیلے سے جو رُوح ہے ہم اُسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں (۲۔ کرنتھیوں ۳: ۱۸؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۴۹)۔

اس چمنستانِ فطرت میں پیدائش دو طرح کی ہے۔ ایک بیج کی اور دوسری پیوند کی۔ ہر شے بیج سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جس جنس کا بیج بویا جائے تو اُس کے پودے میں انگور نہیں الگ سکتے بلکہ گسیوں۔ کیا انجیر کے درخت میں زیتون اور انگور میں انجیر پیدا ہو سکتے ہیں؟ (یعقوب ۳: ۱۲) اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ بیج کی خاصیت بھی ہتمام و کمال پھل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک ترش خاصیت کا بیج بویا جائے و اُس کے پودے میں ضرور ترش پھل ہی لگیں گے۔ یہ تو ہے بیج کی پیدائش اب دوسری پیوند کی پیدائش ہے۔ یہ امر زیادہ تشریح کا محتاج نہیں کہ پیوند لگانے سے کسی بھی پھل کی خاصیت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ وہ درخت جو ترش خاصیت کے بیج کی پیدائش ہے اور جس میں ہمیشہ ترش پھل کا لگنا ضروری ہے شیریں خاصیت کی شاخ سے پیوند لگانے سے یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور آئندہ اُس میں کبھی کھٹے پھل نہیں لگتے۔ اس مثال سے ہمیں انسان کی نئی پیدائش کا ثبوتی تصور حاصل ہوتا ہے

- انسان کی پیدائش بھی دو طرح پر ہے۔ جسمانی یا تنخی پیدائش۔ اور روحانی پیدائش (نئی پیدائش) حضرت ابوالبشر (آدم) جنس انسانی کا گویا بیج تھا جس سے تمام نوع انسانی کی پیدائش ہوئی۔ وہ خاکی تھا اور اُس کی طبیعت گناہ آلودہ ہو گئی۔ اس لئے اُس کی ناپاک طبیعت کا اثر اُس کی تمام نسل میں پشت در پشت متواتر طور پر چلا آیا۔ جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا۔ اور گناہ کے سبب موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا (رومیوں ۵: ۱۲) پہلا آدمی زمین سے یعنی خاکی تھا۔۔۔ اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۴۷)؛ (۴۹) یہ ہے انسان کی جسمانی (تنخی) پیدائش کا حال جس میں گناہ کا متواتر میلان اور نوع انسان کے فرد اول کی طبعی ناپاکی کا اثر بدیہی طور پر ظاہر ہے۔ اس لئے کلام الہی کا یہ فرمان حقیقت پر مبنی ہے کہ "سب نے گناہ کیا اور خُدا کے جلال سے محروم ہیں۔ (رومیوں ۳: ۲۳؛ واعظ ۷: ۲۰) اسی واسطے انسان میں حقیقی نیکی کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اب رہی رُوحانی پیدائش وہ گویا پیوند کی پیدائش ہے جس طرح تُرش پھل کو بدلنے کے لئے ایک شیریں شاخ کا پیوند لازمی ہے۔ کیونکہ تُرش کے ساتھ تُرش ہی پیوند لگانا تحصیل حاصل ہے۔ اس سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ اسی طرح انسان کی موروثی گناہ آلودہ طبیعت کو تبدیل کرنے کے لئے ایک بے گناہ اور پاکیزہ شخصیت کی ضرورت ہے جس کے ساتھ رُوحانی طور پر پیوند ہو جانے سے انسان کی پُرانی مائل یہ بدی طبیعت ایک نیک و پاک طبیعت میں تبدیل ہو جائے۔ اس کے متعلق کلام کا فرمان ملاحظہ ہو۔ کیونکہ جس طرح ایک ہی شخص (آدم) کی کافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اسی طرح ایک کی فرماں برداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے (رومیوں ۵: ۱۹) پس لامحالہ وہ نئی پیدائش ہمیں خُداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس نے فرمایا، میں اُس میں وہی بہت پھل لاتا ہے کیونکہ مجھ سے جُدا کر تُم کچھ نہیں کر سکتے۔ (یوحنا ۱۵: ۵) اس لئے کہ جب تو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کی اصل جنگلی ہے اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا تو وہ جو اصل ڈالیاں ہیں اپنے زیتون میں ضرور ہی پیوند ہو جائیں گی۔ (رومیوں ۱۱: ۲۴)

بیج والی پیدائش ہمیشہ نیچے سے ہوتی ہے اور پیوند والی اُوپر سے خُداوند مسیح نے فرمایا۔ تُم نیچے کے ہو میں اُوپر کا ہوں۔ تُم دُنیا کے ہو میں دُنیا کا نہیں ہوں (یوحنا ۸: ۲۳) جس طرح ہم اُس خاکی کی صوت پر ہوئے اسی طرح اُس آسمانی کی صورت پر بھی ہوں گے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۴۹) اور جو لوگ اپنے گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ کر کے خُداوند مسیح پر ایمان لا کر اُس کے ساتھ روحانی رنگ میں پیوند ہو جاتے اور نئی پیدائش حاصل کرتے ہیں اُن کے متعلق کلام فرماتا ہے۔ تُم فانی تھم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے خُدا کے کلام (مسیح) کے وسیلے جو زندہ اور قائم ہے۔ نئے سرے سے پیدا ہوئے ہو (۱۔ پطرس ۱: ۲۳) جو کوئی خُدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا تھم اُس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خُدا سے پیدا ہوا ہے (۱۔ یوحنا ۳: ۹؛ کلیسیوں ۳: ۹-۱۰؛ فلپیوں ۳: ۲۱؛ ۲۔ کرنتھیوں ۴: ۱۶) جو جسم سے پیدا ہوا ہے جسم ہے۔ اور جو روح سے پیدا ہوا ہے رُوح ہے (یوحنا ۳: ۶) جس بیج (آدم) سے نسل انسانی کی پیدائش ہوئی وہ ناپاک تھا۔ اس لئے تمام نسل کا ناپاک ہونا عقلی و نقلی ہر دو طریق سے ثابت ہے۔ اس لئے خُدا کا فرمان انسان کے لئے ہے۔ میں جانتا تھا کہ تُو بالکل بے وفا ہے اور رُحم ہی سے خطا کار کہلاتا ہے (یسعیاہ ۴۸: ۸) زبور ۵۱: ۵۸؛ ۵۸: ۳؛ پیدائش ۸: ۲۱) اور بغیر نئی پیدائش حاصل کئے انسان کا خُدا سے ملاپ ممنوع ہے کیونکہ اجتماع ضدین بحال ہے۔ اس لئے خُداوند مسیح نے نیکدیمس سے کہا۔ میں تجھ سے بیج بیج کہتا ہوں کہ جب تک کوئی نئے سے سے پیدا نہ ہو وہ خُدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا (یوحنا ۳: ۳)۔

اور جس طرح وضاحت مافوق سے ظاہر ہے نئی پیدائش خُداوند مسیح کے ساتھ ایمانی و رُوحانی رنگ میں پیوند ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ایزد تعالیٰ کا مقرر کردہ واحد ذریعہ ہے جس سے نوع انسان کو مرض گناہ سے نجات اور خُدا کی مقاربت مونسلت حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے مسئلہ گناہ کے بیان میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ چونکہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ لہذا گناہ نے انسان کی رُوحانی زندگی پر اثر انداز ہو کر رُوح کو

مردہ کر دیا۔ جس سے جسم بھی بطور لازمی نتیجہ کے قبضہ موت میں آگیا۔ اگر گناہ زندہ رہے تو روح مردہ رہے گی اور جب روح مردہ ہوگی تو جسم بھی موت کے قبضہ میں رہے گا۔ (رومیوں ۷: ۹) خُداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے گناہ مردہ ہو جاتا اور روح زندہ ہو جاتی ہے۔ اور روح کے طور پر زندہ ہونے سے جسم بھی قبضہ موت سے چھوٹ کر بقا کو حاصل کرتا ہے۔ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں (لوق ۲۰: ۳۶) اس لئے اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ دُنیا مخلوق ہے۔ پرانی چیزیں جاتی رہیں۔ دیکھو وہ نئی ہو گئیں (۲۔ کرنتھیوں ۵: ۱۷)۔

## خُلاصہ مطلب

- ۱- اختیار طریقہ سے گناہ کا ازالہ اور نجات محال ہے۔
- ۲- جبری طریقہ سے گناہ کا ازالہ اور نجات محال ہے۔
- ۳- بذریعہ تناقضاتی نجات اس لئے محال ہے کہ اس کا تمام تر دار و مدار کرموں (اعمال) پر ہے۔ لیکن عمل سے پہلے قوتِ عمل درکار ہے۔
- ۴- تزکیہ نفس و ریاضتِ جسمانی سے نجات محال ہے۔
- ۵- اعمالِ حسنہ سے نجات ملتی ہے۔ اس عقیدہ کے حامی اعمالِ حسنہ کو شرطِ نجات کو مشروط ٹھہراتے ہیں۔ لیکن دراصل نجات شرط اور اعمالِ حسنہ مشروط ہیں۔ یعنی نیک اعمال سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔
- ۶- توبہ محض سے نجات محال ہے۔ اگرچہ حصولِ نجات کے لئے توبہ ضروری ہے۔
- ۷- خُدا کی صفاتِ عدل و رحم کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان خود اپنی نجات کا انتظام نہیں کر سکتا۔
- ۸- قسری ملاپ سے انسان کی فعلِ مختاری قائم نہیں رہتی۔ لہذا حصولِ نجات کا یہ طریقہ معقول ہے۔
- ۹- طبعی موافقت نجات کے لئے ضروری ہے لیکن پاک طبیعت کو حاصل کو لینا انسان کی دسترس سے باہر ہے۔
- ۱۰- نجات بالکفارہ حصولِ نجات کے لئے آخری صحیح اور معقول طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔

## ایک اعتراض کا جواب

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے معتقدات سے عدم واقفیت کے باعث یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ جب خُداوند مسیح نے خطا کاروں کے عوض میں اپنی جان بطور مبادلہ کے دے دی تو اب وہ آزاد ہیں کہ کفارہ مسیح کی آڑ میں رُوسیاہی کے کام کیا کریں۔ کیونکہ کفارہ ہو چکا اور یہ سوال ہمیشہ مقلدانِ مسیح پر ہی کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ مقدس پولوس رسول خود ہی اس سوال کو پیدا کر کے اُس کا معقول جواب دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو (رومیوں ۶: ۱-۴) ۱۵: ۱۸) ہم ایسے معترضوں سے مودبانہ طور سے پوچھتے ہیں کہ ایک مریض جو مرض سے تندرست کیا گیا کیا وہ اس لئے بار بار بیمار ہونے کی کوشش کرے کہ ادویہ اور حکیم اُس کے علاج کے لئے موجود ہیں؟ ہر گز نہیں۔ کوئی صحت یافتہ آدمی کبھی دوبارہ بیمار ہونے کی خواہش نہیں کرتا اگرچہ اُس کی شفاء کے سامان بکثرت موجود ہوں۔ اور اگر کوئی اسی غلط فہمی کے زیر اثر مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی دیدہ و دانستہ گناہ پر دلیر ہو جائے تو مسیح کا کفارہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ سزائے عدالت سے ہر گز بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ جن لوگوں کے دل ایک بار روشن ہو گئے اور وہ آسمانی بخشش کا مزہ چکھے اور روح القدس میں شریک ہو گئے اور خُدا کے عمدہ کلام اور آئندہ جہان کی قوتوں کا ذائقہ لے چکے۔ اگر وہ برگشتہ ہو جائیں تو انہیں توبہ کے لئے پھر نیا بنانا ناممکن

ہے۔ (عبرانیوں ۱: ۴-۸) کیونکہ حق کی پہچان حاصل کرنے کے بعد اگر ہم جان بوجھ کر گناہ کریں تو گناہ ہوں کی کوئی اور ترقی بانی باقی نہیں رہی (عبرانیوں ۱۰ : ۲۶) اُن پر یہ سچی مثل صادق آتی ہے کہ کتابی ترقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہلائی ہوئی سورنی دلدل میں لوٹنے کی طرف (۲- پطرس ۲: ۲۲)۔

جب ایک مُفلِس و نادر کا ایک ہزار روپے کا قرضہ کسی رحمدل صاحبِ حیثیت نے ایک دفعہ بھر دیا اور اُس سے تاکید اکہہ دیا کہ جا پھر قرض نہ لینا ورنہ میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ تو باوجود اس احسان اور تاکید کے اگر وہ دیدہ و دانستہ پھر مقروض ہو جائے تو اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ بقول ہر روز عدہ نیست کہ حلوہ خور دکسے۔ خُداوند مسیح اپنی زمینی زندگی میں جب کبھی کسی کے گناہ معاف کرتے تھے تو فرماتے تھے۔ جا پھر گناہ نہ کرنا (یوحنا ۸: ۱۱) پھر گناہ نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ تجھ پر اس سے بھی زیادہ آفت آئے (یوحنا ۵: ۱۴)۔

ایک اور اعتراض کی امکانی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شاہد کوئی موجودہ مسیحیوں کی کوتاہیوں اور خامیوں کو دیکھ کر یہ کہے کہ جب کہ مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے انسان نیا مخلوق ہو جاتا ہے اور پرانی ناپاک طبیعت سے اُس کو بکلی نجات حاصل ہو جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسیحیوں کی عملی زندگیوں سے اس دعویٰ کا عملی ثبوت نہیں ملتا؟ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تبدیلی پورے طور پر پیوند ہوئے بغیر نہیں ہوا کرتی۔ اگر پیوند میں کوئی نقص رہ جائے تو تبدیلی محال ہے۔ بے شمار ایسے مسیحی بھی موجود ہیں جو صرف نام کے مسیحی ہیں اور اُن کا چلن وہی ہے جو مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں مسیح کے ساتھ پیوند نہیں ہوئے۔ ایک تڑش انگور کا پودا شیریں انگور کے نزدیک لگا دیا جاتا ہے۔ اور اُس میں مطلق تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور دوسرے تڑش پودے کو شیریں انگور کے ساتھ پیوند کر دیا جاتا ہے۔ اُس میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہونی شروع ہو جاتی ہے یہی فرق نقلی اور اصلی مسیحی کا ہے۔ پس بعض نام نہاد نقلی مسیحیوں کی بُری سیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لاکھوں دیندار مسیحیوں کو بھی ویسے ہی گندم نما جو فروش سمجھنا جائز نہیں۔ ایک ضعیف البصر کی قدرت بصارت کے لحاظ سے اصحابِ بصارت قویہ کے مریات سے انکار سے ایک صاحبِ سماعت صحیحہ کی قوتِ سماعت کا انکار لازم نہیں آتا۔ کھوٹے اور کھرے روپے میں بناوٹ و وزن، مقدار اور چہرہ شاہی کے لحاظ سے مطلق فرق نہیں ہوتا۔ لیکن اُن کی آوازوں سے اُن کا کھوٹا یا کھرہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح نقلی اور مسیحی میں وجہ امتیاز اُن کی بد سیرتی اور خوش سیرتی ہے۔ اچھا درخت پھل لاتا ہے۔ اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے (متی ۷: ۱۷)۔

علاوہ ازیں ایسے مسیحی بھی ہیں جو مسیح کے ساتھ اچھی طرح پیوند ہو چکے۔ اور اُس کی پیوند کی تاثیر واقعی اُن کی عملی زندگیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ تبدیل شدہ ہیں لیکن بعض وقفہ پرانی طبیعت کا خفیف سا اثر اُن میں باقی رہ جاتا ہے۔ اور اُسی اثر کے ماتحت و شاز و نادر ناکردنی افعال کے مرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔ مسیح کے ساتھ پیوند ہو جانے کے بعد بھی اکثر اُن میں پرانی طبیعت کی کوئی جڑ پھوٹ نکلتی ہے۔ جیسا پولوس رسول فرماتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی کڑوی جڑ پھوٹ کر تمہیں دکھ دے اور اُس کے سبب سے اکثر لوگ ناپاک ہو جائیں (عبرانیوں ۱۲: ۱۵؛ ۱۳: ۱۵؛ ۱۴: ۱۸) اگرچہ چراغِ جہاد یا جائے تاہم اُس کی کالک کا نشان چراندان پر رہ جاتا ہے۔ لیکن جب مکان کی سفیدی کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ کالک بھی مٹ جاتی ہے۔ اگرچہ ایک قلعہ توڑ دیا جائے تاہم اُس کے کھنڈرات کچھ دیر تک پڑے رہتے ہیں۔ لیکن کھنڈرات میں قلعہ کی شان موجود نہیں ہوتی۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ کھنڈرات بھی اٹھادے جاتے ہیں۔ اگرچہ مکان میں تیرے نکل جاتا ہے پر کچھ دیر تک سابقہ وقت کے اثر سے پھر بھی چلا متحرک رہتا ہے۔ وقت پا کر خود ہی ساکن ہو جاتا ہے۔ پیوند لگانے کے بعد اُسی روز درخت تبدیل ہو کر اچھے پھل دینے نہیں لگ جاتا بلکہ اُس کی تبدیلی بتدریج ہوتے ہوئے ایک خاص اور مقررہ وقت میں انجام کو پہنچتی ہے۔ اس حال انسانی طبیعت کی تبدیلی کا ہے۔ نجات ایک مسلسل تدریجی حالت حام ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی تمام عمر ایک ہی دن

میں بسر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح روحانی کمالیت کامل پاکیزگی اور الوہیت نما انسانیت بات یافتہ لوگوں کے اندر فوراً پیدا نہیں ہو جاتی۔ نجات کے بھی مدارج ہیں۔ مگر جب ہم سب کے بے نقاب چہروں سے خداوند کا جلال اس طرح منعکس ہوتا ہے جس طرح آئینے میں تو اُس خداوند کے ویلے ل سے جو روح ہے ہم اسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں (۲۔ کرنتھیوں ۳: ۱۸)۔

## نجات کے مدارج

انسان کے اندر چار قوتیں مسلم ہیں۔ یعنی قوتِ شہوانی۔ قوتِ بھی قوتِ ملکی مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر اُس کی قوتِ ملکی ہر سہ قوتوں سے یہاں تک دبی ہوئی ہوتی ہے کہ اصلی نیکی و پاکیزگی کی صورت اُس سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اور وہ بت پرستی گور پرستی، عناصر پرستی اور فطرت پرستی کا والاو شید اور خالص توحید پرستی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ اور ایسی باطل پرستی اور ہر قسم کا گناہ اُس کا مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسی مکروہ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو پاک سمجھا کرتا ہے۔ لیکن مسیح پر ایمان لاتے ہی اُس کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو جاتا ہے اور اُس کی زندگی بتدریج مندرجہ ذیل چار مدارج کو طے کرتی ہے۔

### درجہ اول۔

اس پہلے درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی ایک حصہ اور گناہ تین حصہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ میں بڑا گنہگار ہوں۔ یہاں تک کہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا۔ مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا ہوں (رومیوں ۷: ۱۹) وہ اپنی گناہ آلود مکروہ زندگی سے نفرت کرتا اور اپنے آپ کو سب سے بڑا گنہگار سمجھتا ہے (۱۔ تمثیلیں ۱: ۱۵) اور مسیح کی نزدیکی میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

### درجہ دوم۔

اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی دو حصہ اور گناہ بھی دو حصہ ہوتا ہے۔ یعنی نیکی اور گناہ کا میزان مساوی ہوتا ہے۔ اور ایماندار مسیح کے ساتھ بیوند ہو کر اپنے اندر پہلے کی بہ نسبت زیادہ قوت محسوس کرتا ہے۔ اور گناہ پر غالب آنے کے لئے رُوح القدس کی امداد حاصل کرتا ہے (رومیوں ۸: ۲۶) اور کمزوری میں زور آور ہوتا جاتا اور گناہ کی کراہیت کو بزور محسوس کرتا ہے۔ اس درجہ میں رُوح کے اندر سفلی و علوی عناصر میں جنگ ہوتی ہے۔ اور وہ گاہے گناہ پر غالب اور گاہے اُس سے مغلوب ہوتا رہتا ہے۔

### درجہ سوم۔

اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی تین حصہ اور گناہ صرف ایک حصہ رہ جاتا ہے۔ یعنی مسیح کی قوت کی تاثیر سے وہ روحانی طور پر کافی قوی ہو جاتا اور بہت شاز و نادر ہی گناہ سے مغلوب ہوتا ہے۔ اور جب کبھی کسی خفیف سے خفیف گناہ کا ارتکاب بھی اُس سے ہو جاتا ہے تو اُس کے دل میں اس قدر اضطراب و پشیمانی اور پچھتاوا پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر کبھی اُس گناہ کے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ اور رُوح القدس ضمیر کو گناہ کے زنگ سے صاف کر کے اس قدر ذکی الحس بنا دیتا ہے کہ وہ معمولی کوتاہیوں پر بھی اپنے فرائض کو نہایت سختی سے انجام دینے لگتا ہے۔ اس درجہ میں پہنچ کر ایماندار کو خیالی گناہوں سے بھی جنگ کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی نفسانی خواہش قریب قریب مردہ ہو جاتی ہے۔ اُس کا میلان طبع گناہ کی طرف سے ہٹ کر نیکی کی طرف لگ جاتا ہے۔ پھر اُس س عملی گناہ تو شاز و نادر ہی سزد ہوتا ہے۔ صرف خیالی گناہ کبھی کبھی اُس کی ضمیر کو ٹھوکر لگاتا ہے۔ اور ضمیر بدی کے خیال ہی چونک اٹھتا ہے۔ اور اس قدر قوی اور سرلیج الحس ہو جاتا ہے کہ انسان کو کبھی دائرہ جائز سے نکل کر دائرہ ناجائز و ناجواب میں جانے نہیں دیتا۔ اور انسان کی ہر سہ

سفلی قوی قوتِ ملکی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی کو ایک غالب زندگی سمجھتا ہے۔ تو بھی پُرانی انسانیت کا خفیف سا اثر اُس کے اندر باقی رہ جاتا اور اکثر اوقات اُس کی رُوح پر خلش لگتا ہے۔ لیکن ایماندار اب گناہ کا غلام نہیں بلکہ راست بازی کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور دیگر گناہ زدہ رُوحوں کو بچانے کی تڑپ اُس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے۔

## درجہ چہارم۔ اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی چار حصہ اور گناہ صفر ہوتا ہے۔ یعنی وہ سراسر پاک و راست بن کر خُدا کی طبیعت پر

مطبوع ہو جاتا اور گناہ و نفسانیت کی غلامی سے کلی طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ اب خیالی گناہ کا بھی امکان مٹ جاتا ہے۔ بداندیشی اور بدخیالی کے لئے اُس کے دل میں مطلق گنجائش ہی نہیں رہتی اور وہ کامل انسان اور خُدا کے بیٹے کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ تمام سنی طاقتیں اُس کی قوتِ ملکی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اور خیالی یا عملی گناہ کا پھر کوئی امکان نہیں رہتا۔ اور اس چوتھے درجہ کے کامل ایماندار کے متعلق کلام یہ فرماتا ہے جو کوئی خُدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا تخم اُس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خُدا سے پیدا ہوا ہے (۱۔ یوحنا ۳: ۹) وہ الوہیت نما انسانیت یا خُدا کی صورت جو گناہ کے باعث مٹ چکی تھی۔ ایسے ایمانداروں کو پوری کمالیت کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھر خُدا کی مانند اور خُدا کی صورت پر بن کر اُس کے فرزند کہلاتے اور وصالِ الہی وہ مقاربتِ وجود لافتناہی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ نجات کا کمال ہے۔

## کفارہ مسیح کی وسعت بلحاظ تاثیر

خُداوند مسیح نے تمام جہان کے گناہوں کی معافی کی خاطر کفارہ دیا۔ یہ نہیں کہ اُس کی قربانی کے وقت سے لے کر قیامت کے زمانے تک کے درمیانی عرصہ کی دُنیا کے لئے بلکہ آدم سے لے کر یومِ الحشر تک کی تمام دُنیا کے لئے اُس نے اپنی قیمتی قربانی دی۔ کوئی ایسا زمانہ نہیں جس کے گناہوں پر اُس کی قربانی اثر انداز نہ ہو سکے۔ یعنی اُس کا کفارہ آفرینشِ عالم سے لے کر روزِ عدالت تک کے گناہوں کو ڈھانپ دینے اور دھو دینے کے لئے خُدا کے حکیم و قدیر کے ازلی ارادہ میں موجود تھا۔ لیکن اُس کا ظہور ایک خاص زمانہ میں ہوا۔ چونکہ تقدیم و تاخر زمانی خُدا کے لئے بے حقیقت ہیں۔ یہ تین زمانے تو محدودات و محدثات ہی سے متعلق ہیں۔ خُدا کے لئے ہمیشہ حال ہی حال ہے۔ اس لئے اُس کی وسیعِ علمی کے مطابق مسیح کا کفارہ ازل سے ہو چکا تھا۔ اور زمین کے وہ سب رہنے والے جن کے نام اُس برے (مسیح کی کتابِ حیات میں لکھے نہیں گئے جو بنائے عالم کے وقت سے ذبح ہوا ہے۔ اُس حیوان (ابلیس) کی پرستش کریں گے۔ (مکاشفہ ۱۳: ۸) جس نے ہمیں نجات دی اور پاک بلاوے سے بلایا۔ ہمارے کاموں کے موافق نہیں بلکہ اپنے خاص ارادے اور اُس فضل کے موافق جو مسیح یسوع میں ہم پر ازل سے ہوا۔ مگر اب ہمارے منجی مسیح یسوع کے ظہور سے ظاہر ہوا جس نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو اُس خوش خبری (انجیل) کے وسیلے سے روشن کر دیا (۲۔ کرنتھیوں ۹: ۹ - ۱۰: ۱ - پطرس ۱: ۲۰؛ کلیموں ۱: ۲۶؛ ۲۔ تیموتھیوں ۱: ۱۶ - ۲۵ - ۲۶؛ افسیوں ۳: ۹؛ بطس ۱: ۲؛ افسیوں ۱: ۹ - ۱۰؛ ۲۔ تیموتھیوں ۱: ۲۶؛ ۲۔ تیموتھیوں ۱: ۲۵)۔

کفارہ مسیح کے تحقق خارجی سے پیشتر خارجی سے پیشتر کی دُنیا اُس الہی انتظام پر جو اُن کی مغفرت و نجات کے لئے خُدا کی رحمانیت عامہ اور فیضانِ تامہ سے ظہور پذیر ہوا ایمان لا کر اپنے گناہوں کی بخشش اور تقربِ الہی کو حاصل کر سکتی ہے۔ اُسے خُدا نے اُس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا کہ جو گناہ پیشتر (قبل از کفارہ مسیح) ہو چکے تھے۔ اور جن سے خُدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وہ اپنی راستبازی ظاہر کرے۔ بلکہ اسی وقت اُس کی راستبازی ظاہر ہو۔ تاکہ وہ خود بھی عادل رہے۔ اور یسوع پر ایمان لائے اُس کو بھی راستباز ٹھہرانے والا ہو

(رومیوں ۳: ۲۵ - ۲۶) اب کوئی سوال کرے گا کہ مسیح کے ظہور سے پہلے کی دنیا اُس کے کفارہ پر کیسے ایمان لاسکتی ہے جس حال کہ وہ اُن کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ واضح ہو کہ ہم مسیحی یہ مانتے ہیں اور کلام بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ خُداوند مسیح نے مردوں میں سے زندہ ہو کر اور عالم ارواح میں پہنچ کر اپنے ظہور سے پہلے کی تمام دنیا کو بشارت دی۔ اسی میں اُس نے جا کر اُن قیدی رُوحوں میں مُنادی کی جو اُس اگلے زمانہ میں نافرمان تھیں۔ جب خُدا نُوح کے وقت میں قتل کر کے ٹھہرا ہوا تھا (۱۔ پطرس ۳: ۱۹ - ۲۰: ۶) چنانچہ اُن رُوحوں میں سے جو خُداوند مسیح کے پاک کفارہ پر ایمان لائی ہوں گی وہ بچ جائیں گی اور نجات پائیں گی۔ اور جو ایمان نہ لائیں وہ سزائے عدالت کی مستوجب ٹھہریں گی۔ عدالت کا ایک خاص دن ہے اُس میں تمام باغی اور نافرمان رُوحیں سزا پائیں گی۔ یہ نہ سمجھ جائے کہ ازمنہ سالفہ کیا رُوح نیست ہو چکیں ہر گز نہیں۔ بلکہ خُدا نے ہر زمانے کی ارواح کو عدالت کے دن کے لئے قائم رکھا ہے۔ مگر اس وقت کے آسمان اور زمین اُسی کلام (کلمتہ اللہ) کے ذریعے سے اس لئے رکھے ہیں کہ جلائے جائیں۔ اور وہ بے دین آدمیوں کی عدالت اور ہلاکت کے دن تک محفوظ رہیں گے (۲۔ پطرس ۳: ۷) وہ بدکاروں کو عدالت کے دن تک سزا میں رکھنا جانتا ہے (۲۔ پطرس ۲: ۹؛ ۳: ۲؛ ۴: ۱۷)۔

پس خُداوند مسیح کی قربانی تمام زمانوں کے گنہگاروں کے واسطے دی گئی اور جیسے ایک قیمتی لعل اکیلا ہی لاکھوں روپے کے قرض سے سبکدوش کر دیتا ہے اُسی طرح اُس واحد پاکیزہ اور بیش بہا الٰہی شخصیت کا فدیہ تمام زمانوں اور جہانوں کے قرضوں اور گناہوں کے لئے کافی ٹھہرا۔ جس طرح ایک ہی شخص کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اُسی طرح ایک کی فرماں برداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے (رومیوں ۵: ۱۹)۔

خُداوند مسیح کی قربانی میں دنیا کی وہ سب قربانیاں جو کسی نیک اور راست اصول کی وفاداری اور حمایت میں دی گئیں ایسے چھپ جاتی ہیں جیسے آفتاب کے لائٹ ہائوز میں ستاروں کی ننھی ضیا پاشی چھپ جاتی ہے۔ مسیح کی موت میں ابدی اور غیر فانی زندگی کا از سر بتہ تھا جو اُس کے زندہ ہونے پر بے نقاب ہو گیا۔ جو موت نالائق حرکات اور ناراست افعال کے ارتکاب کا نتیجہ ہو وہ واقعی قابلِ نفرت اور لعنتی موت ہو سکتی ہے لیکن وہ موت جو ناراستوں اور گنہگاروں کو بچانے کے لئے ایک راست باز پر آتی ہے وہ بذاتہ لعنتی موت نہیں جو زبردیہ کسی قیدی کی آزادی کی خاطر دیا جاتا ہے۔ وہ روپیہ لعنتی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی لعنت کو دھو دینے اور مٹا دینے والا۔ لعنت بلحاظ جرم کے ہوتی ہے نہ کہ فدیہ کے لحاظ سے۔ مسیح کی موت کو لعنتی حالت کی نسبت سے کہا گیا ہے۔ لعنت کے اصل مفہوم کا اُس کی ذات پاک پر اطلاق مطابقتی اور واقعی نہیں ہے۔ اُس راست باز نے ناراستوں کی خاطر کھا اٹھایا (۱۔ پطرس ۳: ۱۸) نہ کہ اپنی کسی ناراستی کے باعث۔ اسی واسطے موت کا دکھ سہنے کے سبب جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا ہے (عبرانیوں ۲: ۹؛ فلپیوں ۲: ۹ - ۱۱) پس آے مریضان گناہ! اور عاصیان بے پناہ! آج ہی بنیہ غفلت کانوں سے نکالئے۔ اور ذرا ہوش سنبھالئے۔ دیکھو اب قبولیت کا وقت ہے دیکھو یہ نجات کا دن ہے (۲۔ کرنتھیوں ۶: ۲)۔

## ابدی زندگی اور ابدی سزا

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے متعقدات و مسلمات سے عدم واقفیت کے باعث ابدی زندگی اور ابدی سزا (بہشت و دوزخ) کے مسئلہ کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ ہم نہایت اختصار سے اس مسئلہ لاجواب اور طریق صواب پر روشنی ڈالیں گے۔ جس سے شکوک و شبہات کی تاریکی دور ہو کر مطلع صاف ہو جائے گا۔ بشرطیکہ معرضین و مشککین تعصب و ہٹ دھرمی کی سیاہ عینکوں کو چشم بصیرت سے اتار کر امورِ غیبیہ اور حقائقِ حقیقیہ کی جستجو صدق دلی سے کریں۔

واضح ہو کر جو لوگ اس لائق ٹھہریں گے کہ اُس جہان کو حاصل کریں اور مردوں میں سے جی اُنھیں اُن میں بیاہ شادی نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں۔ اس لئے کہ فرشتوں کے برابر ہوں گے اور قیامت کے فرزندہ ہو کر خدا کے بھی فرزند ہوں گے (لوقا ۲۰ : ۳۵-۳۶) اور اُن کی سکونت کے لئے نیا آسمان اور نئی زمین ہوگی جن میں راستبازی بستی رہے گی۔ (۲- پطرس ۳ : ۱۳) اُن کو بھوک اور پیاس نہ لگے گی۔ نہ دھوپ اور گرمی ستائے گی (مکاشفہ ۷ : ۶) پھر وہاں موت نہ ماتم نہ درد نہ آہ نہ رہے گا۔ پُرانی چیزیں جاتی رہیں گی اور کچھ نیا ہی ہوگا (مکاشفہ ۲۱ : ۳-۴) وہاں اس مادی دُنیا کے لذائذ و حظاء خواہشات و عادات گناہ و ظلمت مصائب و شدائد اور رنج و آلام وغیر اکی لازوال ابدی اور غیر فانی رُوحانی خوشیوں میں رخنہ انداز ہی نہ کر سکیں گے۔ بلکہ الٰہی تمام کدوراتِ سفلیہ۔ اعثیہ جسمانیہ اور اہویہ نفسانیہ کا وہاں قطعی امکان و گنجائش نہ ہوگی۔ اور راستباز جنتی لوگ خدا کی عین ذات نہ ہوں گے بلکہ غیر ذات اور طبائعِ قدسیہ و صفاتِ ملکوتیہ کے باعث خدائے قدوس سے مشابہت و مماثلت قریبی رکھیں گے۔ اُس وقت راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں آفتاب کی مانند چمکیں گے (متی ۱۳ : ۴۳) اور دو تابد خدا کی مقاربت و مجالست میں رہیں گے اور اُس کی عبادت کریں گے (مکاشفہ ۲۲ : ۳-۵) جب راستباز اس فانی زندگی کو چھوڑ کر ابدیت کی پُر سرولانہتا عملداری میں داخل ہو کر اس جسمانی زمانہ کی طرف دیکھیں گے تو وہ ایسا ہی مختصر نظر آئے گا جیسا وہ داڑھائی گھنٹہ کا عرصہ سنیں میں فلم کے ادکار ایک طولِ طویل زندگی کے واقعات دکھا کر ڈراپ سین کر دیتے ہیں۔ اور تماشاغیاں غیر فانی ہو کر خداوند مسیح میں اُن کا مجموعہ ہو جائے گا (افسیوں ۱ : ۱۰) لیکن خبیث الطنت و شریر النفس لوگ اسفل السافلین میں گر آئے جائیں گے۔ اور راستبازوں سے بالکل الگ رہ کر ابدی عذاب میں دانت پیسیں گے اور روئیں گے۔ اور کلامِ مقدس میں جو دوزخ کی ہولناک تصویر آگ گندھگ اور دیگر ضرور رساں اشیاء کے پیرائے پیش کی گئی ہے۔ وہ محض تشبیہی بیانات ہیں۔ دراصل منکرانِ خدا کی طبائع کدوراتِ سفلیہ اور خواہشات ذمیمہ و قبیحہ کے باعث خدا کی پاکیزہ طبیعت کے مخالف و متضاد ہوں گی۔ اُن کا دکھ و عذاب ہوگا کہ جس طرح تو اور چرگا ڈر بیا عث تخایف طبائع آفتاب کے طلوعِ خوش نہیں ہوتے بلکہ بہت دکھ محسوس کرتے اور اندھیرے میں چھپتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سیاہ کار لوگ اپنی چُغند طینتی و خفاش فطرتی کے باعث خدا کے جلال کی تجلی کی برداشت نہ کر سکیں گے۔ جیسے جب موسیٰ کا چہرہ خدا کی حضوری میں رہنے کے باعث نہایت نورانی ہو گیا تھا تو لوگ اُس سے دہشت کھاتے تھے۔ یہاں تک موسیٰ کو اپنے چہرے پر نقاب ڈالنا پڑا۔ (خروج ۳۴ : ۲۹-۳۰؛ ۳۵ : ۲-۳) اور خداوند مسیح کی شبیہ مبارک جب کوہِ جرمون پر نورانی ہو گئی تو شاگرد بہت ڈر گئے تھے۔ (متی ۱۷ : ۶؛ مرقس ۹ : ۶) اسی طرح راست بازوں کے نورانی چہرے بھی ہلاکت کے فرزندوں کے خرمنِ امن و طمانیت پر بجلیاں گرائیں گے۔ خدا کی زندگی سے خارج ہونا ہی اُن کی ہلاکت ہے۔ اور خدا کی طبیعت کے اُن کی طبائع کا مخالف ہونا ہی اُن کا انتہائی دکھ ہے۔ اسی وجہ سے خدا کی تشبیہ جسم کرنے والی آگ کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوا استثنا ۴ : ۲۴؛ ۹ : ۳؛ ۳ : ۲۴ : ۱۷؛ یسعیاہ ۳۳ : - ۱۴؛ عبرانیوں ۱۲ : ۲۹) وہی آگ تھی جو جھاڑی میں لگی ہوئی موسیٰ کو نظر آئی۔ وہی آگ کا ستون بدلی میں ہو کر رات کو بنی اسرائیل کی رہبری کرتا تھا وہی آگ تھی جس کے متعلق مسیح نے فرمایا کہ میں دُنیا میں آگ لگانے آیا ہوں۔ وہی آگ عیدِ پینتکوست کے دن شاگردوں پر ظاہر ہوئی۔ اُسی نور نے دمشق کی راہ پر ظاہر ہو کر پولوس رسول کی ہدایت فرمائی تھی۔ وہی آگ تھی جر جزیرہ پیتس میں یوحنا پر ظاہر ہوئی۔ اور اُسی آگ (خدا کی تجلی) کا بیان منکرانِ خدا کے خلاف یوں ہے۔ ہاں عدالت کا ایک ہولناک انتظام اور غضب ناک آتش باقی ہے جو مخالفوں کو کھائے گی (عبرانیوں ۱۰ : ۲۷) صرف تضادِ طبائع کی بات ہے ورنہ درزِ کسی آگ کی بھتی کا نام نہیں ہے۔ بندہ ان خیالات کا خود ذمہ داری ہے اور اس تعلیم کی جواز یا عدم جواز کی ذمہ داری میرے سوا اور کسی پر عائد نہیں ہوتی۔

## آخری التماس

پیارے ناظرین! آپ نے اس کتاب نے اس کتاب کے مطالعہ سے انجیل کے اسرارِ سر بستہ اور رموزِ دقیقہ کو کافی طور پر سمجھ لیا۔ اب نہایت غور طلب امر یہ ہے کہ جس قدر رُوح جسم سے اعلیٰ ہے اسی قدر رُوحانی بھی جسمانی غلامی سے بڑی ہے۔ جسمانی امراض تو جسم کے فنا ہونے پر مٹ جاتے ہیں۔ لیکن رُوح غیر فانی ہے۔ اس لئے رُوحانی مرض (گناہِ رُوح کے ساتھ تابدرہ کر اُس کو خدائے قدوس سے ہمیشہ کے لئے جُدا رکھے گا۔ اور ابدی سزا کا مستوجب ٹھہرایگا۔ تمام مذاہب کی غرض مشترک نجات ہے۔ اور سب نجات پکارتے بھی ہیں۔ لیکن حقیقی نجات دلانے کی صلاحیت سے بے نصیب ہیں۔ جس طرح ہماری مادی و جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے خدائے قدیر و حکیم نے کارخانہ فطرت میں ایک ہی سے سامان پیدا کر دئے ہیں۔ اور وہ ہماری جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس قدر ممتحنی ہیں کہ سے بہتر کی حاجت نہیں۔ اسی طرح ہماری رُوحانی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی ایک ہی ایسا کافی ودانی اور کامل انتظام ہونا چاہئے کہ جس سے بہتر کو امکان نہ ہو۔ اور وہ مسیحیت اور اُس کا ہیرو خداوند مسیح ہے۔ واضح ہو کہ گھڑی اپنے بگڑے ہوئے پُر زوں کو خود ہی درست نہیں کر سکتی بلکہ گھڑی ساز جس کے ہاتھوں نے اُس کو بنایا۔ اسی طرح جس قدرت نے اس انسانی مشینری کو بنایا وہی قدرت اُس کے بگڑے ہوئے پُر زوں کو درست کر سکتی ہے۔ پس کلمۃ اللہ (مسیح) تمام کائنات کا آفرینندہ ہے (یوحنا: ۱-۳؛ کلیسوں: ۱۵-۱۷) اور وہی انسانی مشینری کے زنگ خوردہ (گناہِ آلودہ) پُر زوں کو درست کر کے دوبارہ اُس کو شبیہ اللہ پر بحال اور خُدا کی طبیعت پر مطبوع کرنے والا ہے (فلیسوں: ۳؛ ۲۱؛ ۱-۱۵؛ ۲۹) مردہ نیبوں اور پیغمبروں اور اتاروں سے اپنی نجات و شفاعت کی اُمید رکھنا ایسا ہی عبث ہے جیسے کوئی مجرم مردہ وکیل کی قبر پر جا کر اُس سے اپنے مقدمے کی پیروی کی التجائیں کیا کرے۔ مردہ زندہ کی وکالت نہیں کر سکتا۔ خُداوند مسیح ابد تک گنہگاروں کی شفاعت و دستگیری کے لئے زندہ ہے۔ اسی لئے جو اُس کے وسیلے سے خُدا کے پاس آتے ہیں۔ وہ انہیں پوری پوری نجات دے سکتا ہے کیونکہ وہ اُن کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے (عبرانیوں: ۷: ۲۵)

پس آئے مثلاً شیانِ جاہِ حق اور طالبانِ راہِ نجات صحرائے ضلالت کی بادیہ بیہائی سے باز آئیے۔ تعصب، بٹ دھرمی اور فضول کی نکتہ چینیوں کی گرد و غبار کو اپنے دامن دل سے جھاڑیے۔ اور مسیحیت کی مخالفت ہمیشہ اندھے ہو کر نہ کیجئے۔ کب تک آپ سچائی کی تحقیر کر رہے رہیں گے اور ملک کی یہ ذلیل و پست ذہنیت کب تک فضائے امن کو مگدربنائے رکھے گی۔ یاد رکھو مسیحیت کی مخالفت کرنا خُدا کی ہستی سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔ آئیے اور اپنے گناہوں سے توبہ کیجئے۔ خُداوند مسیح پر جو خُدا کے رحم و فضل کا ظہور ہے صدق دل سے ایمان لا کر پستہ پایئے۔ تو آپ نجات پائیں گے اور کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ اس آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا۔ جس کے وسیلے سے ہم نجات پاسکیں (اعمال: ۴: ۱۲) خُدا آپ کی ہدایت و رہنمائی فرمائے۔

آمین!